آیت اللہ جوادی آملی

حماسہ و عرفان

تحریکِ کربلا کے حوالے سے ایک نیا اسلوب بیان
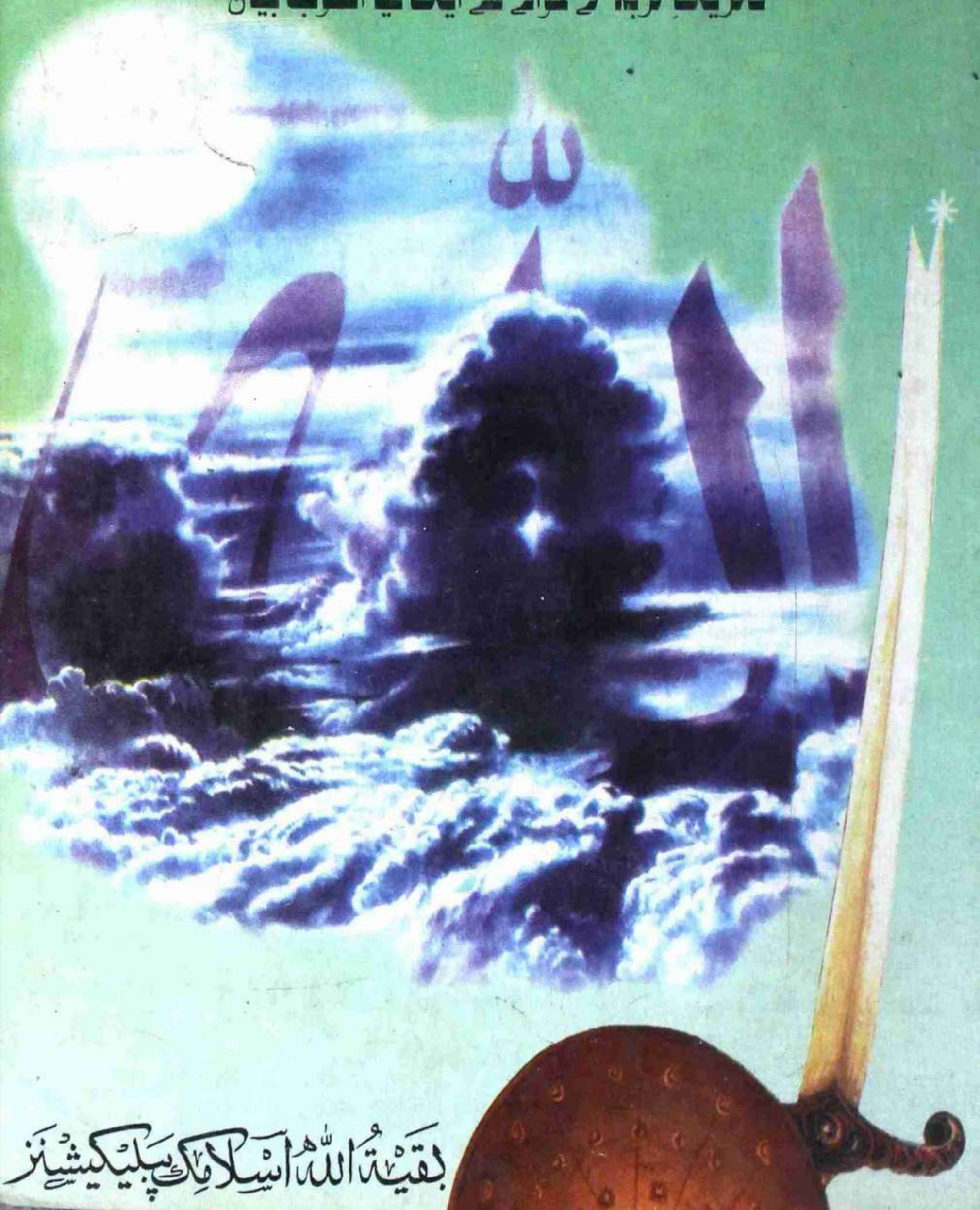
بقیۃ اللہ اسلامک پبلیکیشنز
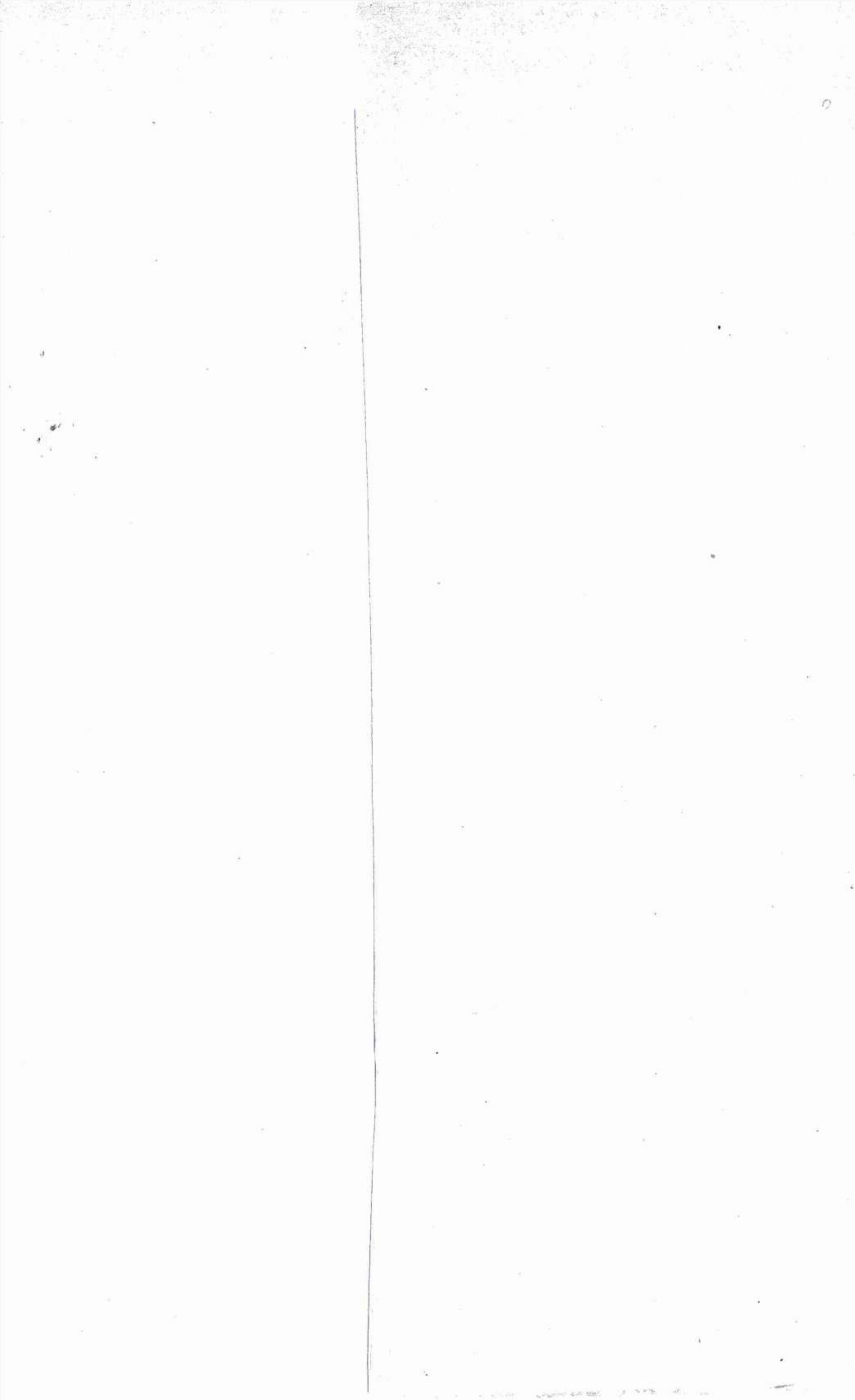
حماسہ و عرفان

تحریکِ کربلا کے حوالے سے ایک نیا اسلوب بیان

آیت اللہ جوادی آملی

بقیۃ اللہ اسلامک پبلیکیشنز

کتاب ـــــــــــــ حماسہ و عرفان

مصنف ـــــــــــــ آیت اللہ جوادی آملی

ترجمہ ـــــــــــــ حجۃ الاسلام سید جواد نقوی

طبع اوّل ـــــــــــــ دسمبر ۱۹۹۹ء

تعداد ـــــــــــــ ۱۰۰۰

مطبع ـــــــــــــ ایس ایم پرنٹرز، کراچی۔

نوٹ: محترم قارئین سے گزارش ہے کہ اس کتاب میں جہاں کہیں حوالہ کیلئے (ـ) کا نشان آیا ہے۔ اس کیلئے فارسی کتاب "حماسہ و عرفان" کی طرف رجوع فرمائیں۔ ناشر

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمه

جنگ و صلح کا تعلق عالم مادہ (World of matter) کے حوادث سے ہے ورنہ عالم ماورائے مادہ میں صلح مطلق کے علاوہ کچھ بھی قابل تصور نہیں ہے' البتہ عالم مادہ کے قلمرو میں بھی جنگ ایک نسبی (Related) چیز ہے نہ کہ مطلق' (Absolut) یعنی قلمرو طبعیت (Nature) کے موجودات میں سے ایک موجود بھی ایسا نہیں ہے جو تمام دیگر موجودات کے ساتھ ہمیشہ اور ہر حالت میں مشغول جنگ و نبرد ہو' چونکہ نظام علیت و معلولیت' (Cause and effect system) جو عالم مادہ کو بھی شامل ہے' ہر موجود شے کے لئے اس کی پیدائش اور نشو ونما کے علل واسباب کے ساتھ صلح و آشتی کی علامت اور ہر موجود کے لئے اپنے آثار و معالیل کے ساتھ انس کی دلیل بھی ہے۔

لہذا جس عالم میں ایک طرف سے جنگ و یورش اور دوسری جانب سے دفاع و گریز پایا جائے وہ فقط عالم حرکت و تغیر ہے' (World of Movement and (Trans-formation) چنانچہ پیدائش شر اور ضرر و نقصان کے ظہور کا دائرہ بھی اسی عالم مادہ اور جہان طبیعت (World of matter) میں منحصر ہے' ورنہ عالم ثبات و تجرد (ماوراء الطبیعۃ)(Non matterial world) میں کسی قسم کی مزاحمت و کشمکش وقوع پذیر نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ملائکہ کی قلمرو حیات ہر قسم کی ناگواریوں اور ناگوار سوانح کی گزند سے محفوظ ہے۔

جبکہ انسان اپنے مادی پہلو اور دائرہ حرکت و تغیر کے اندر زندگی گزارنے کی بناء پر جنگ و ستیز کے آشوب سے ہرگز محفوظ نہیں ہے' خواہ یہ نبرد' یورش و حملہ کی شکل میں ہو یا دفاع کے عنوان سے۔ اصل جنگ کے اعتبار سے معلمین بشریت یعنی انبیاء علیہم السلام اور سرکش حکمرانوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسا کہ سعی و کوشش' آسائش و آرام وغیرہ جیسے

دیگر طبعی اور مادی امور کے لحاظ سے پرہیزگار و متقی اور فاسق و فاجر افراد میں کوئی فرق نہیں ہے، چونکہ دونوں ظاہر عمل میں شریک ہیں، دونوں طبقوں کے درمیان فرق فقط ہر کام میں کار فرما مقصد اور اس محرک و سبب کی بناء پر ہے جو انہیں عمل پر اکساتا ہے اور عمل کی روح شمار ہوتا ہے۔

چونکہ انبیاء جیسے کامل انسانوں کے تمام اعمال فرد و معاشرہ کی تکمیل و تکامل کے لئے انجام پاتے ہیں، جبکہ ستم کار اور جابر حکمرانوں کے تمام اعمال فرد و معاشرہ کے فساد فصلوں کی تباہی، نسلوں کی ہلاکت اور شہروں اور آبادیوں کی ویرانی کی خاطر ہوتے ہیں۔

وَاِذَا تَوَلّٰی سَعٰی فِی الْأَرضِ لِیُفْسِدَ فِیهَا وَیُهلِكَ اَلحَرْثَ وَالنّسلَ(1)

جب یہ لوگ برسر اقتدار آجائیں تو زمین میں فساد پھیلانے کی کوشش کریں گے فصلیں تباہ اور نسل انسانی کو ہلاک کر دیں گے۔

اِنّ المُلُوكَ اِذَا دَخَلُوا قَریةً اَفسَدوهَا وَجَعَلُوا اَعِزّةَ اَهلِهَا اَذِلّةً (2)

بادشاہ اور ملوک جب کسی آبادی میں داخل ہوتے ہیں تو اسے تباہ و برباد کر دیتے ہیں اور اس آبادی میں بسنے والے باعزت لوگوں کو ذلیل و خوار بنا دیتے ہیں۔ حالانکہ تمام انبیاءؑ کا موقف یہ ہے کہ:

اِنّ صَلاَتِی وَنُسُکی وَمَحیَایَ وَمَمَاتِی لِلّٰه رَبّ العَالَمِینَ (3)

میری نماز اور میرے مناسک و اعمال میری زندگی اور میری موت سب اللہ کے لئے ہیں جو عالمین کا پروردگار ہے۔

یہ منطق بعض خاص انبیاء کے ساتھ مختص نہیں ہے چونکہ ہر نبی نے اپنے سے پہلے آنے والے نبی کی سنت و سیرت کی تصدیق کی ہے بلکہ تمام انبیاء عقائد، اخلاقیات، حقوق

اور فقہ جیسے دین کے بنیادی اصولوں میں ایک دوسرے کے موافق تھے' فقط بعض جزئی امور میں ہر ایک کا ایک خاص راستہ اور خاص شریعت تھی البتہ تکامل کی خاطر قیام واقدام کرنا اور فرد و معاشرہ کی تکمیل کے لئے جہاد و کوشش کرنا تمام انبیاءؑ کی مشترکہ سنت رہی ہے۔

سورہ حدید جو نبوت عامہ کا مکمل منشور بیان کرتی ہے تمام انبیاءؑ کے لئے آسمانی کتاب کے ذریعے اصلاح اور زمینی لوہے سے تیار شدہ اسلحہ کو ایک ساتھ بیان کرتی ہے تاکہ وحی کے نور اور آسمانی کتاب کی رہنمائی سے انسانی فطرتوں کو پروان چڑھائیں اور زمینی تلوار کی چمک سے سرکشوں کو سرکوب' حدود وحی کی حمایت اور بے سہارا انسانوں کا دفاع کرسکیں۔

لَقَد اَرسلنَا رُسلنَا بِالبیّنات وَاَنزلنا معهُمُ الکِتابَ وَالمیزاَنَ لیَقُومَ النّاسُ بِالقِسطِ وَاَنزلنَا الحَدِیدَ فِیه بَاسُ شَدِید' وَمَنَافِعُ لِلنَاسِ (4)

''ہم نے اپنے رسولوں کو واضح اور روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ہمراہ کتاب اور میزان کو بھی اتارا تاکہ لوگ عدل وانصاف قائم کرسکیں اور ہم نے لوہا بھی اتارا ہے جس میں شدید حرج ہے اور لوگوں کے لئے بہت سے فوائد بھی ہیں۔''

پس تمام انسان اس مادی زندگی میں جنگ و صلح کی حالت میں ہیں خواہ رہبر ہوں یا پیروکار چاہے حق پر ہوں یا باطل پر۔ اصلی فرق ان کے پیچھے کارفرما عوامل اور جنگ و صلح کے اہداف و مقاصد میں ہے۔ متقی اور پرہیزگار انسان عالم خلقت میں کارفرما ان تعمیری اصولوں کی حدود میں رہ کر حرکت کرتے ہیں جس کے معمار نے رحمت و لطف کی اساس پر اس کی اصلی بنیاد اور اس کی دیواروں کو استوار کیا ہے' جبکہ باغی اور سرکش افراد اس عمارت کی تباہی اور ویرانی کی کوشش میں مشغول رہتے ہیں۔ چنانچہ اس کی وضاحت بعد میں کی جائے گی۔

خداوند تبارک و تعالیٰ کی رحمت میں دو خصوصیات ہیں۔ ایک یہ کہ جامع اور ہمہ گیر ہے اور کسی چیز کو بھی شامل ہونے سے قاصر نہیں ہے دوسری یہ کہ خداوند تعالیٰ نے نہ صرف

اس وسیع رحمت سے خود کو متصف کیا ہے اور اپنے آپ کو اس رحمت کے واجد کے طور ر متعارف کروایا ہے بلکہ اپنے اوپر اس رحمت کو لازم قرار دیا ہے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق عمل کرنے کا پابند قرار دیا ہے، پہلی خصوصیت پر یہ آیات کریمہ روشنی ڈال رہی ہیں۔

وَرَحمتَیِ وَسِعت کُل شَئی(5)

اور میری رحمت ہر شے کو شامل ہے۔

رَبّنَا وَسِعَت کُلّ شَئی رَحمَۃً و علماً(6)

ہمارے پروردگار کی رحمت اور علم ہر شے پر محیط ہے۔

دوسری خصوصیت ان آیات کریمہ میں بیان ہوئی ہے۔

کَتَب علَی نفسِہ الرّحمَتہَ (7)

خدا نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دیا۔

کَتَب رَبّکُم عَلیٰ نَفسِہِ الرّحمَۃَ(8)

تمہارے پروردگار نے اپنے اوپر رحمت کو لازم قرار دیا ہے۔

پس عالم (World of Existence) ہستی کی عمارت رحمت کی اساس پر استوار ہے اور رحمت خداوند تعالیٰ کے اوصاف میں سے ہے جس کے بالمقابل کوئی متضاد صفت نہیں ہے ہو بہو وحدت مطلقہ اور ہدایت مطلقہ وغیرہ کی طرح جو خداوند تعالیٰ کے مطلق اور تکوینی اسماء حسنٰی ہیں اور ہر گز غضب، کثرت اور اضلال وغیرہ جیسے امور ان اوصاف (Absolute Attributes) مطلقہ کے مقابل بطور ضد قابل تصور نہیں ہیں لہذا وہ رحمت جس کے بالمقابل ایک مخصوص صفت بنام غضب واقع ہے وہ رحمت خاصہ ہے نہ کہ رحمت مطلقہ و بے انتہاء۔

لہذا غضب مخصوص اور رحمت خاصہ ہر دو رحمت مطلقہ کے تحت درج ہیں البتہ ہر ایک کا اپنا ایک خاص مقام ہے۔ لہذا غضب مخصوص کو رحمت خاصہ کے مقابلے میں اگر لحاظ کیا جائے تو اسے غضب کا نام دے سکتے ہیں لیکن اگر غضب کو تنہا اور بجائے خود ملحوظ رکھا جائے

یا اس وسیع و عریض اور منظم و ہم آہنگ جہان کے ایک گوشے میں لحاظ کیا جائے یقیناً عنوان رحمت ہی اس پر منطبق ہو گا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر قہر خداوند تعالیٰ کسی جگہ جنگ کی صورت میں سر کش طاغیوں کے خلاف ظہور کرے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ایک طبقہ یا گروہ رحمت کی عظیم و رفیع عمارت کو ویران کرنے پر تل بیٹھا ہے اور رحمت کی پر صلابت اور مستحکم بنیاد نے اپنا دفاع کیا ہے اور ستم کاروں کے حملے کو روکا ہے۔

اسی بناء پر خداوند تعالیٰ نے مجاہدین کے دفاع کرنے کو (ستم کاروں کے اوپر) عذاب الٰہی کے نزول کا عنوان دیا ہے اور اُسے اپنی ذات کی طرف منسوب کیا ہے۔

قَاتِلُوْ هُم يُعذّبهُم الله بأَيدِيكُم وَ يخزهِم وَينصُركُم عَليَهم(9)

تم ان کفار کے خلاف جنگ کرو تا کہ خدا تمہارے ہاتھوں سے انہیں عذاب چکھائے اور رسوا کرے اور تمہیں ان پر نصرت و غلبہ عطا کرے۔

اسلام میں جنگ کا تصور

صرف اسلام ہی دین الٰہی ہے اور تمام انبیاء یہی دین لے کر آئے ہیں۔ چنانچہ کسی انسان سے بھی اس کے علاوہ کوئی اور دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسلام میں جنگ کو اگرچہ دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جہاد ابتدائی اور جہاد دفاعی لیکن یہ تقسیم ابتدائی طور پر دکھائی دیتی ہے ورنہ دوسری نگاہ سے جہاد ابتدائی کی بر گشت جہاد دفاعی کی طرف ہوتی ہے اور ایک تیسری نگاہ سے دفاع کے معنی بھی راستے کے کانٹوں کو ہٹانا اور صراط مستقیم پر حائل رکاوٹوں کو اٹھانا ہے جو نہ خود سیدھے راستے پر چلتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو چلنے دیتے ہیں اور چونکہ راستے کے کانٹے چننا اور کانٹوں کو ہٹانا حکمت و رحمت کے مساوی ہے لہذا خداوند تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کیا ہے' اپنے آپ کو اس رحمت کا پابند قرار دیا ہے اور اپنے

بندوں کو رحمت عطا کرنے کا وعدہ دیا ہے۔

البتہ جہاد کو ابتدائی اور دفاعی میں تقسیم کرنا اور اس کی تشریح کرنا علم فقہ کے ذمہ ہے۔ علمِ فقہ نے بھی ظہور امام معصومؑ اور زمانہ غیبت کے لئے ہر ایک کا مخصوص حکم بیان کر دیا ہے، لیکن یہ تقسیم دشمنوں کے حملے کی صورت میں کی گئی ہے، چنانچہ اگر کوئی دشمن اسلامی سرحدوں پر حملہ آور ہو تو اس کے لئے دفاع کا حکم تدوین کیا گیا ہے لہذا انفرادی حقوق سے دفاع کرنا کسی بھی فرد یا گروہ کے حملے کی صورت میں جائز اور نافذ ہے۔

ایسے ہی اگر معنوی اور نظریاتی حملوں یا غلط اور منفی تبلیغات کے نتیجہ میں بت پرستی اور شرک کو رائج کیا جائے اور انسانی فطرت کا مسلم حق یعنی خالص توحید کو نقصان پہنچایا جائے ''تو اس حق سے دفاع کرنا بھی جائز ہے'' چونکہ توحید، فرد اور معاشرہ دونوں کے لئے مایہ حیات ہے، جیسا کہ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ:

اَلتوحِید حَیَاۃ النّفسِ(10)

توحید روح کی حیات ہے۔

البتہ اس مطلب کی اساس قرآن مجید ہے جس میں کافر کو مردہ قرار دے کر اسے زندہ کے مقابلے میں ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

لِینُذرِ مَن کَانَ حَیّاً ویَحِقَ القَول علیَ الکَافرِین(11)

تا کہ یہ (قرآن) زندہ کو ڈرائے اور کفار پر وعدہ حق الٰہی ثابت ہو جائے۔

پس ضروری ہے کہ انسان کے فطری حقوق کا دفاع بھی کیا جائے اور کفر و شرک کے خلاف جہاد بھی کیا جائے، یعنی جس طرح سے کوئی شخص یا گروہ کسی بھی فرد یا معاشرے کی ظاہری زندگی کو نقصان پہنچائے اور اسے ختم کرنا چاہے تو اسکا دفاع کرنا واجب ہے اسی طرح اگر کوئی شخص یا گروہ کسی فرد اور سماج کی روحانی حیات اور معنوی زندگی کو نقصان پہنچائے اور انہیں کافر بنائے یا ان کے اسلام قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنے تو اس صورت میں بھی دفاع ضروری ہو جائے گا چنانچہ اگر کوئی شخص خودکشی کے ارادے سے

اپنے آپ کو ختم کرنا چاہے تو اس کی زندگی کو محفوظ رکھنے کی خاطر اس کی خودکشی کا مقابلہ کرنا واجب ہے' البتہ خودکشی کے ساتھ مقابلے کا مصداق الگ ہے جبکہ ثقافتی حملات' گمراہ کرنے کی ناپاک نیتوں اور کفر و شرک کے ساتھ مقابلہ کرنے کا مصداق اور عملی طریقہ جدا ہے گزشتہ بیان کی روشنی میں ثابت ہو گیا ہے کہ دفاع کے معنی دفع کرنے کے ہیں یعنی آب حیات کی نہر کے آگے حائل ہر چیز کو اٹھا پھینکنا جو نہ تو خود اس آب حیات سے سیراب ہوتی ہے اور نہ ہی دوسروں کو اس سے استفادہ کا موقع دیتی ہے ایسی رکاوٹ اور مانع کو دفع کرنا عقل و شرع دونوں کی رو سے ضروری ہے۔

قرآن کریم نے ان آسمانی آیات کے ضمن میں موجود تین حصوں میں تین قسم کے سبق آموز اور حیات بخش مطالب بیان فرمائے ہیں۔

اول: ان مفسدین اور شر پسند افراد کا تعارف کروایا ہے جو نہ خود نور الٰہی سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو اس نور سے منور ہونے کا موقع دیتے ہیں' بلکہ ہمیشہ اس دینی نور کو بجھانے کی کوشش میں مشغول رہتے ہیں اور ہمیشہ سعی کرتے ہیں کہ کوئی دوسرا بھی اس سے استفادہ نہ کر سکے۔

يُرِيدُوْنَ اَن يطفئوا نُورَاللهِ بَافواهِهِمِ وَيَابَى اللهُ اِلاّ اَن يتِمّ نُورَه وَلَوكَرِهَ الكَافِرُونَ(12)

یہ لوگ نور خدا کو اپنی پھونکوں کے ذریعے بجھانا چاہتے ہیں اور خدا انہیں ہر گز یہ کام کرنے نہیں دیتا البتہ خدا اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا اگرچہ کافروں پر یہ امر گران گزرے۔ ایک دوسری آیت کریمہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَهُم ينهونَ عَنْه وَ ينئونَ عَنه وَاِن يُهلكونَ اِلاّ اَنفُسهم وَمَا يشعُرونَ(13)

وہ اس (قرآن) سے خود بھی دور ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے منع کرتے ہیں اس عمل سے وہ فقط اپنے آپ کو ہی ہلاک کر رہے ہیں لیکن اس بات کا وہ شعور نہیں رکھتے۔

ان دونوں آیتوں سے دو نکتے واضح طور پر استفادہ ہوتے ہیں ایک یہ کہ کفار نور خدا کو بجھانے کے درپے ہیں اگرچہ اس میں یقیناً وہ ناکام رہیں گے' دوم یہ کہ کفار لوگوں کو بھی دین خدا سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور ہیں پس جو خود بھی رکا ہوا ہے اور دوسروں کو بھی روکے ہوئے ہیں وہ چشمے کے دہانے پر پڑے ہوئے اس پتھر کی مانند ہے جو نہ دوسرے تشنہ لبوں تک اس آب حیات کو پہنچنے دیتا ہے اور نہ ہی خود اس سے فیض اٹھاتا ہے' دوسروں کو بھی محروم رکھتا ہے اور خود بھی محروم رہتا ہے۔

دوم: دوسرا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم اس قسم کے خار راہ کے اٹھا پھینکنے کو رحمت قرار دیتا ہے اور اسے عالم خلقت کے اصلی ضابطوں کے ساتھ ہم آہنگ جانتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

لَو لاَ دَفعُ اللهِ النّاس بَعَضهُم ببعضٍ لَهدمّت صَوامِعِ وَبیعِ وَصَلَواَت وَ مَسَاجِدُ یَذکرُ فیهَا اسُم اللهِ کثیراً(14)

اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے کچھ اور کو دفع نہ کرے تو کلیسہ' کنیسہ اور نمازیں و مساجد وغیرہ جیسی عبادت گاہیں جن میں کثرت سے اللہ کا ذکر ہوتا ہے۔ منہدم کر دی جائیں گی۔

دوسری آیت میں ارشاد ہے:

لَولاَ دفعُ اللهِ النَاسَ بَعَضهُم بِبَض لَفَسَدَتِ الأَرضُ(15)

اگر خدا بعض لوگوں کو دوسرے بعض کے ذریعے دفع نہ کرے تو زمین تباہ ہو جائے گی۔

یہ دونوں آیتیں اسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں۔ چونکہ زمین کو تباہی سے محفوظ رکھنا اور عبادت گاہوں اور دینی مراکز کو ویرانی سے بچانا رحمت ہے اور اس کا حصول چونکہ حملہ آوروں کو دفع کرنے اور مزاحمت کرنے اور رکاوٹ بننے والوں کے اٹھا پھینکنے سے ہی ممکن

ہے لہذا ایسے موانع کو بر طرف کرنا یقیناً امور خیر میں سے ہے اور اس امر کا شمار رحمت الہیہ کے روشن مصادیق میں سے ہوگا۔

سوم: تیسرا مطلب یہ ہے کہ جو چیز بھی اس جہان کے نظام احسن کے مطابق رحمت کے زمرے میں شمار ہوتی ہو خداوند تعالیٰ یقیناً اسے انجام دیتا ہے اور اس کے انجام دینے کو لازمی بھی سمجھتا ہے چونکہ مذکورہ آیات میں جہاں خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر خدا صالح انسانوں کے ذریعے سرکشوں کو دفع نہ کرے تو زمین پر فساد پھیل جائے گا تو آیت دوم کے ذیل میں یوں فرمایا ہے:

وَلکِنَّ اللّٰہَ ذُوفَضْلٍ عَلَی الْعَالَمِیْنَ ــ البقرہ 251

لیکن خدا عالمین کے اوپر فضل کرنے والا ہے۔

اسی طرح پہلی آیت میں یہ فرمانے کے بعد کہ اگر 'خدا ستم کاروں کو افراد صالح کے ہاتھوں سرکوب نہ کرے تو دینی مراکز ویران ہو جائیں گے'' یوں فرمایا ہے:

وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (16)

اور خدا یقیناً اس کی مدد کرتا ہے جو خدا کی نصرت کرے ''چونکہ'' خدا بہت ہی قوت و عزت والا ہے۔

یعنی تفضّل الہٰی اور قدرت و عزت خداوندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سرکشوں کو سرکوب اور راہ تکامل میں حائل رکاوٹوں کو دور کر کے اپنی رحمت کا اظہار فرمائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ کی ۲۰۳ سے لے کر ۲۰۷ تک کی آیات کریمہ سے استفادہ ہوتا ہے کہ ایک طبقہ معاشرے کو فساد کی طرف دھکیل رہا ہوتا ہے اور ان کے مقابلے میں ایک طبقہ جان نثاری اور ایثار میں مشغول ہوتا ہے۔ لیکن ایثار کرنے والے گروہ کا اقدام بندوں پر خداوند تعالیٰ کی رحمت و رافت کے سائے میں انجام پاتا ہے یعنی ذات خداوند تعالیٰ کا عمل چونکہ رحمت کی اساس پر ہوتا ہے لہذا خداوند ایک ایسے گروہ کو خلق فرماتا اور انکی تربیت کرتا ہے جو اپنی جان نثار کر کے ہر قسم کے موانع کو بر طرف کر دے۔ چنانچہ فرمایا:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالْعِبَادِ(17)

بعض لوگ رضائے خدا کی خاطر اپنے نفس بیچ دیتے ہیں اور اللہ کی رضا و خوشنودیوں کو خرید لیتے ہیں۔

اور خدا اپنے بندوں پر بہت ہی مہربان ہے۔

چونکہ تمام امور کی بنیاد رحمت خداوند کی اساس پر استوار ہے لہذا تمام نتائج بھی خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب ہیں چنانچہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَهَزَمُوْهُمْ بِإِذْنِ اللّٰهِ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ(18)

پس انہوں نے اللہ کے فرمان سے (کفار) کو شکست دی اور داوٗد نے جالوت کو قتل کر دیا چنانچہ خدا نے "داوٗد" کو ملک و حکومت عطا فرمائی۔

یعنی راہ حق میں جہاد کرنے والوں نے دستور الٰہی سے دشمنوں کو شکست دی' چنانچہ حملہ آور دشمنوں کا قتل بھی خداوند تعالیٰ کی طرف منسوب ہے جو رحمت الٰہی کا نمایاں مصداق ہے۔

فَلَمْ تَقْتُلُوهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ(19)

"تم نے انہیں قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے انہیں قتل کیا ہے۔"

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود قتل کوئی ذاتی حکم نہیں رکھتا اور قتل ظلم کی مانند بھی نہیں ہے کہ جس کے لئے قبیح ہونا ایک ذاتی حکم اور صفت ہے' بلکہ قتل کبھی ظلم کا مصداق ہوتا ہے اور اس صورت میں ناروا ہوتا ہے اور کبھی قسط و عدل کا مصداق ہوتا ہے اور روا ہوتا ہے۔ لہذا جن مواقع پر قتل کو گناہ کے عنوان سے یاد کیا گیا ہے ان میں قصاص' دفاع جہاد اور حملہ ور دشمن کے مقابلہ وغیرہ جیسے بجا قتل کو مستثنیٰ کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ اسراء کی آیت ۳۳ میں ہے:

وَلاَ تَقتُلُوا النَّفسَ الّتِی حَرّمَ اللّٰہُ اَلاّ بِالحَقّ(20)

ہر گز کسی ایسے نفس کو قتل نہ کرو جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے مگر حق کے ساتھ۔

لیکن اگر کسی کو ناحق قتل کر دیا جائے تو اس کے اولیاء دم اور ورثاء کے لئے حق قصاص مقرر کیا گیا ہے لیکن وہ بھی قصاص سے آگے تجاوز کرنے کا حق نہیں رکھتے چنانچہ مذکورہ آیت کے ذیل میں فرمایا ہے:

وَ مَن قُتِلَ مَظلُوماً فَقَد جَعَلنَا لِوَلِیّہِ سُلطَاناً(20)

جو بھی مظلومانہ طور پر قتل کر دیا جائے تو ہم نے اس کے ولی کے لئے حق "قصاص" مقرر کیا ہے۔

لیکن اس ولی دم کو قصاص سے تجاوز کا حق نہیں پہنچتا چنانچہ اسی آیت میں ارشاد ہے:

فَلاَیُسرِف فِی القَتلِ اِنّہُ کَانَ مَنصُوراً(20)

پس مقتول کے ولی کو قتل (قصاص) میں تجاوز نہیں کرنا چاہئے کہ وہ ہماری طرف سے نصرت پائے گا۔

مذکورہ تمام امور جو رحمت مطلقہ الہیہ کے تحت انجام پاتے ہیں ان میں معیار عدالت و انصاف ہے گزشتہ بیان کی روشنی میں یہ مطلب ثابت ہو جاتا ہے کہ جہاد کا اصلی سبب موانع بر طرف کرنا ہے جس کی بازگشت دفع خطر کی جانب ہوتی ہے اور اگر اسے دفاع کا نام دیا گیا ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ حقیقت میں یہ دفع کرنے کی طرف پلٹتا ہے۔

اور جو مطلب سورہ نساء میں آیت ۷۵ کے اندر بیان ہوا ہے اگرچہ اس کا ظاہر یہ ہے کہ راہِ خدا اور محرومین و بے کسوں کی نجات کے لئے دفاع واجب ہے لیکن حقیقت میں یہ کام بھی خار راہ اور مانع کو دفع کرنا ہی ہے چنانچہ ارشاد قرآن ہے:

وَمَالَکُم لاَتُقَاتِلُونَ فِی سَبِیلِ اللّٰہِ وَالمُستَضعَفِینَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنّسَاءِ وَالوِلدَانَ الّذِینَ یَقُولُونَ
رَبّنَا اَخرِجنَا مِن ھٰذِہِ القَریَۃِ الظّالِمِ اَھلُھَا

وَاجْعَلْ لَنَامِنْ لَدُنْكَ وَلِيّاً وَاجْعَلْ لَنَامِنْ لَدُنْكَ نَصِيْراً

تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ نہیں کرتے حالانکہ بے بس اور ستم رسیدہ مرد، عورتیں اور بچے سب پکار پکار کر فریاد کر رہے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے نکال لے جس کے رہنے والے ظالم اور ستم کار ہیں اور ہمارے لئے اپنی جانب سے کوئی ولی و سرپرست اور ناصر و مددگار بھیج دے۔

چونکہ اسلام میں جنگ قہر خدا کا مظہر ہے اور غضب الٰہی بھی رحمت الٰہی کے مطابق انجام پاتا ہے لہذا اسلامی جہاد کبھی بھی انسان کی تشفی خاطر یا غریزہ غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لئے نہیں ہو سکتا نتیجتاً جہاد اسلامی ہرگز قہر محض نہیں ہوگا بلکہ تمام میادین جنگ میں رحمت و رافت اسلامی متجلی ہوگی اور آخر تک رحمت اپنا یہ خاص جلوہ محفوظ رکھے گی یعنی اسلحہ اٹھانے سے قبل اصلاح کی کوشش کی جائے اور برہان وجدال احسن اور موعظہ حسنہ کے ذریعے حق کی جانب دعوت دی جائے۔

چنانچہ پیامبر اسلامؐ اور ائمہ طاہرین جنگوں کے دوران نہ فقط صف آرائی سے پہلے اتمام حجت کرتے تھے بلکہ میدان جنگ میں صف آرائی کرنے کے بعد بھی نیزے و شمشیر کی زبان سے قبل تبلیغ و تعلیم کی لسان سے استفادہ کرتے تھے نیز جنگی منصوبہ بندی سے پہلے زبان قلم سے کام لیتے اور خطوط ارسال کر کے دشمن کے لئے دین کو دلائل کے ساتھ پیش کرتے۔ سود مند نصائح پیش کرتے اور جدال احسن کے ذریعے رقیب کو خداوند تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے۔

چنانچہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں اور بنو امیہ کے درمیان نبرد سے متعلق جو کچھ منقول ہے وہ معصومین علیھم السلام کی اس سنت کے اوپر ایک سند ہے کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے حق کی جانب دعوت دینا، مدمقابل کے اوپر اتمام حجت کرنا اور حقیقی اسلام کی تعلیمات کو انکے لئے کھول کر بیان کرنا ضروری تھا اور ہمیشہ کے لئے ضروری ہے امام

حسین علیہ السلام کے اصحاب نے بھی جہاد سے قبل تعلیم و تبلیغ کے لئے سعی بلیغ کی ہے چنانچہ انہوں نے مدمقابل دشمنوں کو کبھی نثر کے ذریعے اور کبھی نظم کے پیرائے میں بعض اوقات حماسہ اور رزم کے طور پر اور کبھی موعظہ و نصیحت کے عنوان سے حضرت سیدالشہداء علیہ السلام کی رہبری اور امامت کو قبول کرنے کی دعوت دی یا کم از کم غیر جانبدار رہنے اور بنوامیہ کی ظالم حکومت کی حمایت ترک کردینے کی ضرورت پر زور دیا۔

جیسا کہ گزشتہ مطالب کے ضمن میں بیان ہوا ہے کہ جس طرح پیامبر اکرمؐ کی نبوت تمام جہانوں کے لئے رحمت ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلاّ رَحْمَةً لِلْعَالَمِينَ (21)

''ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لئے محض رحمت بنا کر بھیجا''

اسی طرح آنحضرتؐ کی رسالت کے تمام پہلو بھی خداوند تعالیٰ کی رحمت کا مظہر ہیں چونکہ اسلام کے اندر جہاد کا شمار اہم ترین دینی مسائل میں سے ہوتا ہے لہذا اس کا اصلی امتیاز بھی یقیناً رحمت ہی کو ہونا چاہئے۔ اسی وجہ سے قرآن کریم نے جہاد کے بنیادی اصولوں کو واضح کیا اور پھر ان سب کو رحمت' مغفرت اور حسنہ بنا کر پیش کیا مثال کے طور پر بعض اوقات مجاہدین کو اپنی تقدیر کا اجمالی علم (Non Detailed knowledge) ہوتا ہے اور تفصیلاً اس سے آگاہی (Detailded Knowledge)) نہیں ہوتی تو ان کی تقدیر کے متعلق فرمایا:

قُلْ لَنْ يُصِيبَنَا اِلاّ مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا هُوَ مَوْلٰينَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلْ الْمُؤْمِنُونَ(22)

کہہ دو کہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ پیش آیا وہی ہے جو اللہ نے ہمارے لئے مقرر کیا ہے وہی ہمارا مولیٰ ہے اور مومنین کو ہمیشہ خدا پر توکل کرنا چاہئے (یعنی ہم بھی مومن ہیں پس ہمیں بھی خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا اِلاّ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ(22)

کہہ دو کیا تم ہمارے بارے میں دو حسنات (فتح یا شہادت) میں سے کسی ایک حسنہ (فتح یا شہادت) کے علاوہ کسی چیز کی توقع رکھتے ہو۔ ان دو آیات میں فراوان اہم نکات ہیں جن میں سے بعض کی طرف اشارہ کیئے دیتے ہیں۔

پہلی آیت کریمہ میں دو مدعا اور ایک دلیل ہے البتہ مسئلہ مذکورہ کی دلیل کو درمیان میں ذکر کیا ہے جبکہ مجاہد مومنین کے مدعا کو دلیل سے پہلے اور بعد میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ خداوند تعالیٰ کی ولایت اگرچہ تمام موجودات کے لئے ہے اور خداوند تعالیٰ پورے نظام ہستی (world of Existence) کا مولیٰ ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی ولایت خاصہ فقط اس کے صالح و نیک بندوں کے ساتھ مخصوص ہے اور جنہوں نے اپنے لئے سوائے تباہی کے کچھ بھی سامان نہیں کیا وہ آگ کی ولایت میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

مَاوٰیکُمُ النَّارُ هِیَ مَولٰیکُمْ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ (23)

تمہارا ٹھکانہ جہنم کی آگ ہے وہی تمہارے لئے مولیٰ ہے اور وہ بدترین انجام ہے۔

بنابریں چونکہ آیت کریمہ کے وسط میں ولایت خداوند تعالیٰ کا ذکر ہے جو عالم و قادر ہے اور ہر عالم و آگاہ و قادر، عادل اور خیر خواہ ولی و سرپرست اپنے تحت سرپرستی اور زیر ولایت افراد کی مصلحت کا خیال رکھتا ہے، لہذا اس کے ذریعہ دلیل سے پہلے کا مدعا بھی ثابت ہو جاتا ہے اور بعد کا بھی۔ پہلا مدعا یہ ہے کہ جو کچھ بھی ہمارے ساتھ پیش آتا ہے اگرچہ وہ ایک مصیبت ہی کیوں نہ ہو، ہوتا وہی ہے جو ہمارے مولیٰ کی جانب سے ہمارے نفع اور ہمارے حق میں مقرر کیا گیا ہے اور ہرگز ہمارے ضرر و نقصان میں نہیں ہوتا۔

لہذا قرآن کریم نے فرمایا ہے:

کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا

ہمارے نفع میں اللہ نے لکھا ہے اور یوں نہیں فرمایا:

کَتَبَ اللّٰهُ عَلَینَا

کہ خدا نے ہمارے خلاف اور ہمارے نقصان میں لکھا ہے (چونکہ عربی زبان میں لام

نفع اور علی ضرر اور نقصان کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرا مدعی یہ ہے کہ مومنین کو خداوند تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیئے چونکہ آگاہ ودانا مہربان عادل اور، قادر، مولیٰ توکل کرنے والوں کے لئے بہت ہی اچھا وکیل ثابت ہوگا۔ دوسری آیت کریمہ میں بھی دو مدعی بیان ہوئے ہیں کہ جن کی دلیل آیت اول اور آیت دوم کے ضمن میں ذکر ہوئی ہے اور بعض دیگر شواہد سے بھی پیش کی جاسکتی ہے۔

پہلا مدعا یہ ہے کہ میدان نبرد میں مجاہدین کے لئے دوراہوں میں سے ایک ہی راستہ ہوسکتا ہے اور کوئی تیسرا راستہ ممکن نہیں ہے وہ دوراستے ایک تو دشمن پر فتح پانا اور اسے قتل کرنا اور دوسرا جام شہادت پینا اور اس عالم سے منزہ ہونے کی صورت میں ہے اور ہرگز سازش، گٹھ جوڑ سر، تسلیم خم کرنے اور دشمن کے ہاتھوں قیدی واسیر بننے جیسا کوئی تیسرا احتمال موجود نہیں ہے اور اگر کبھی کوئی مجاہد دشمن کے ہاتھوں قیدی بنالیا جائے تو اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس نے اسارت کو انتخاب کیا ہے بلکہ اضطراری حالت پیش آنے، جنگی اور دفاعی سازوسامان ختم ہوجانے اور تنہارہ جانے کی وجہ سے دشمن نے اسے اسیر بنالیا ہے نہ یہ کہ اس نے قیدی بننے کو ایک تیسرے راستے کے طور پر انتخاب کیا ہے۔

جہاد میں فقط دو ہی راہ موجود ہیں اس پر دلیل سورۂ توبہ کی ایک سو گیارہویں آیت کریمہ ہے جس کے مطابق خداوند تعالیٰ نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مردوں کے جان و مال کو خرید لیا ہے۔

اِنّ اللّٰهَ اشْتَرىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اَنْفُسَهُمْ بِاَنّ لَهُمُ الْجَنّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُونَ وَ يُقْتَلُونَ(24)

خداوند نے راہ خدا میں جنگ و قتال کرنے والے مومنین سے ان کی جانیں اور ان کے اموال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں لہذا وہ یا قتل کر کے فتح پاتے ہیں یا خود راہ خدا میں قتل ہو کر شہید ہو جاتے ہیں۔

پس راہ خدا میں جہاد کرنے کے دوران مارنے یا مرنے کے علاوہ صلح واسارت وغیرہ جیسا کوئی تیسرا راستہ (Third option) موجود نہیں ہے۔

دوسرا مدعی یہ ہے کہ مذکورہ دونوں خصلتیں اور دونوں راستے حسنہ اور خیر ہیں یعنی شہادت بھی حسنہ اور خیر ہے اور فتح و ظفر بھی چونکہ یہ دونوں انجام انسان کے لئے اس کے مہربان مولیٰ کی قہر آمیز رحمت کے سائے میں مقرر ہوئے ہیں البتہ فتح و ظفر' دین کے ظہور' پرچم توحید کے لہرانے اور کفر والحاد کے پرچم کی سرنگونی کا حسنہ ہونا بہت ہی روشن اور عیاں ہے جیسا کہ بعض آیات قرآنی میں اس کا ذکر آیا ہے لہذا اس کی تشریح و تفسیر کی ضرورت نہیں ہے' البتہ راہ خدا میں قتل ہونے یا کسی اور صورت میں مرنے کے حسنہ ہونے کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے اس مطلب پر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۵۷ واضح دلیل ہے:-

وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَوْ مُتّم لَمَغْفِرَۃٌ مِنَ اللّٰہِ وَرَحْمَۃٌ خَیْرٌ مِمّا یَجْمَعُوْنَ

اگر تم راہ خدا میں مارے جاؤ یا تمہیں موت آجائے (تو یہ خدا کی مغفرت ور حمت ہے) تو مغفرت الٰہی اور رحمت خدا ان چیزوں سے بہتر ہے جو دوسرے جمع کرتے ہیں۔

پس جہاد اسلامی کی قلمرو میں جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے وہ رحمت الٰہی کی اساس پر استوار ہے خواہ وہ وقوعہ دشمنان دین کا قتل کرنا ہو جو راہ حق کے سالکین کی راہ سے کانٹے اور موانع ہٹانے کے مترادف ہے یا اس مقصد کو زندہ کرنے کی خاطر راہ خدا میں جان دینے کی شکل میں ہو۔

جس طرح سے روح بدن کے لئے مایہ حیات اور تمام اعضاء و جوارح کی حیات وزندگی کا سبب ہے' اسی طرح دین بھی انسانی زندگی کے بدن میں روح کی طرح ہے اور زندگی انسان میں حیات معنوی کا سبب ہے دین کی وجہ سے زندگی کے تمام شعبوں اور پہلوؤں میں حیات معنوی پیدا ہو جاتی ہے زندگی کے ہر شعبے پر دینی رنگ آجاتا ہے اور ہر پہلو پر حکم الٰہی لاگو

ہو جاتا ہے مثلاً اگر ایک مملکت جس کے اندر ایک مخصوص قوم بستی ہو اور اس ملک کے تمام باشندے خدا پر ایمان رکھتے ہوں، وحی و رسالت پر عقیدہ رکھتے ہوں اور روز قیامت کا اقرار کرتے ہوں تو وہ سرزمین اسلام کے زمرے میں شمار ہو گی، اس کی حفاظت لازمی اور اس کا دفاع واجب ہو گا اس قسم کی سرزمین کو بچانے کی خاطر جنگ کرنا راہ خدا میں جہاد شمار ہو گا۔ کافروں کے وطن کے برخلاف کہ اس کا دفاع کرنا راہ خدا میں جہاد محسوب نہیں ہوتا چونکہ سرزمین شرک کا ہرگز دینی والٰہی رنگ نہیں ہوتا اس سے دفاع کرنا بھی جہاد شمار نہیں ہوتا۔

بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے اپنے نبی سے خواش کی کہ وہ ان کے لئے ایک سپہ سالار لشکر اور ایک عسکری قائد متعین کریں تاکہ اس کی سرکردگی میں راہ خدا میں جہاد کر سکیں۔ قرآن کریم نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِی اِسْرَائِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوسٰی اِذْ قَالُوا لِنَبِیٍّ لَهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِکاً نُقَاتِلْ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالُ اَلاَّ تُقَاتِلُوا قَالُوا مَا لَنَا اَلاَّ نُقَاتِلَ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَائِنَا (25)

کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل کے سرکردہ لوگوں نے جب اپنے نبی سے چاہا کہ ہمارے لئے کوئی سالار مقرر کیجئے تاکہ ہم اس کی زیر کمان اللہ کی راہ میں جنگ کر سکیں تو ان کے نبی نے جواب دیا شاید جب تم پر جنگ واجب ہو جائے تو تم جنگ سے گریز کرو انہوں نے جواب میں کہا کہ یہ ہم سے کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم راہ خدا میں نہ لڑیں جبکہ ہمیں اپنے وطن سے نکال دیا گیا ہے اور اپنے بچوں سے بھی دور کر دیا گیا ہے۔

اس میں اہم نکتہ یہی ہے کہ وطن اسلامی اور تحت کفالت بچوں اور اہل و عیال سے

دفاع کرنا یا اپنے وطن اور خاندان تک پہنچنا اگر مسلمانوں سے متعلق مسائل میں شمار ہوتا ہو تو یہ سب راہ خدا میں جہاد محسوب ہوگا، جیساکہ فلسطینی مسلمان اپنے اسلامی وطن کے دفاع کی خاطر غاصب صیہونیوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں ان کی نبرد راہ خدا میں جہاد ہے۔

چونکہ قداست اصل میں فقط اسلام کو حاصل ہے اور اسلام کی اس قداست کے سائے میں کچھ خاص زمانے بھی قداست و حرمت پیدا کر لیتے ہیں جیسے رجب، ذیقعدہ، ذی الحجہ اور محرم وغیرہ جیسے حرام مہینے نیز اسی اسلامی قداست کے زیر سایہ بعض زمینیں بھی مقدس اور محترم ہو جاتی ہیں، لہذا اگر کسی وقت دشمن اسلامی احکام کی قداست و حرمت کی مراعات نہ کرتے ہوئے بعض حرام مہینوں میں حملہ شروع کر دے یا بعض مقدس مکانات میں جنگ شروع کر دے تو اس صورت میں اسلام سے دفاع کرنا واجب ہو جائے گا اگرچہ یہ دفاع کسی زمان خاص یا کسی خاص مقام کی حرمت و قداست کے پامال ہونے کا باعث ہی کیوں نہ ہو کیونکہ زمان و مکان کا یہ احترام و قداست اسلام کے زیر سایہ ہے اسی وجہ سے قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اَلشَّہرُ الحَرَامُ بَالشَّہرِ الحَرَامِ وَ الحُرُمَاتُ قِصَاص فَمَنِ اعتَدیٰ عَلَیکُم فَاعتَدُوا عَلَیہِ بِمِثلِ مَا اعتَدیٰ عَلَیکُمُ وَاتَّقُوا اللہَ وَ اعلَموا اَن اللہَ مَعَ المُتَّقِینَ (26)

ماہ حرام کے مقابلے میں ماہ حرام ہے لیکن اگر وہ اس کا پاس نہ کریں تو تمام حرمتوں پر قصاص ہوگا لہذا جو بھی تمہارے اوپر تجاوز کرے تو اس کے تجاوز کے حد تک تم بھی اس کا مقابلہ اسی طرح سے کر سکتے ہو تقوی الہی اختیار کرو اور جان لو کہ خدا اہل تقوی کے ساتھ ہے۔

مراد یہ ہے کہ اگر دشمن کسی حرام مہینے کی حرمت کا پاس نہ کرے تو تم بھی ماہ حرام میں دفاع کرو اور تمام زمانی و مکانی حرمتیں اور قداستیں محل قصاص واقع ہوں گی۔ چنانچہ قرآن

کریم میں مسجد الحرام کے نزدیک جنگ کرنے سے منع کیا گیا ہے لیکن اگر اسلام کے دشمن مسجد الحرام کی نزدیک ہی جنگ کا آغاز کردیں تو اس صورت میں اس مقدس سرزمین کی حرمت کی پاسداری لازمی نہیں ہوگی کیونکہ حرمت اسلام کی پاسداری ان تمام چیزوں پر مقدم ہے جنہیں اسلام کے سائے میں احترام نصیب ہوا ہے۔

راہ خدا میں شہادت پانے کا شرف صرف یہی نہیں ہے کہ شہداء اس دنیا سے منتقل ہو جانے کے بعد عالم برزخ میں زندہ رہیں گے کیونکہ دوسرے افراد بھی اس دنیا سے چلے جانے کے بعد عالم برزخ میں زندہ ہوں گے البتہ برزخ میں ہر انسان اپنے عمل کا مرہون منت ہوتا ہے نیک لوگ برزخی بہشت کے روضہ جنت میں آرام پائیں گے اور بدکار لوگ برزخی جہنم میں جلیں گے نیز شہادت کی کرامت محض اس وجہ سے بھی نہیں ہے کہ شہداء عالم برزخ میں داخل ہوتے ہی خداوند تعالی سے مخصوص رزق پاتے ہیں کیونکہ بعض ایسے نیک صالح اور خالص مومنین بھی اس کرامت سے مستفید ہوں گے جنہوں نے سرے سے جنگ میں شرکت ہی نہیں کی یا اس وجہ سے کہ ان پر لازمی نہیں تھا کہ جنگ میں شرکت کریں یا اصلا جنگ کے نہ ہونے کی وجہ سے یا پھر میدان جنگ میں حاضر ہونے سے معذور ہونے کی بناء پر شریک نہ ہو سکے۔

بلکہ جو چیز بظاہر شہادت کی مخصوص خصوصیت شمار ہو سکتی ہے وہ ایک تو توفیق لقاء اللہ ہے جو بعض دینی نصوص سے بھی استفادہ ہوتی ہے کہ جسے بعض برگزیدہ افراد کے علاوہ کوئی بھی نہیں پا سکتا اور دوسری یہ کہ شہداء زندہ حالت میں برزخ میں داخل ہوتے ہیں نہ کہ مردہ طور پر۔

اس کی مزید توضیح یوں دی جا سکتی ہے کہ فقہ اسلامی کی رو سے موت سے مراد یہ ہے کہ روح بدن کو ترک کر جائے اور اطباء کی تصدیق کے مطابق بدن روح کے تحت تدبیر نہ رہے۔ اسی وجہ سے فقہ اسلامی میں اس مرحلے کے لئے بعض خاص احکام مقرر ہوئے ہیں مثلاً" یہ کہ میت کو غسل و کفن و حنوط دینے کے بعد نماز جنازہ ادا کی جائے اور پھر دفن کیا

جائے۔ ان احکام میں سوائے غسل و کفن کے باقی تمام احکام کے لحاظ سے شہید اور غیر شہید میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن علم کلام اور علم تفسیر کی رو سے موت کی حقیقت کچھ اور ہے ان علوم کے مطابق موت کا تعلق روح سے ہے نہ کہ بدن سے یعنی بعض ارواح ایسی ہیں جو اس دنیا سے مردہ حالت میں برزخ میں منتقل ہوتی ہیں اور وہاں جاکر زندہ ہوتی ہیں یعنی موت کے وقت یہ ارواح جہان مادہ و طبیعت سے (World of Matter) غافل اور دنیا کے حوادث وامور سے کاملاً بے خبر ہو جاتی ہین فقط برزخ کے حالات سے وہ بھی اپنی ہستی کے (Existence) اندازے کے مطابق مطلع ہوتی ہیں لہذا ایسی ارواح مردحالت میں برزخ میں داخل ہو کر فقط برزخی حیات کی حد تک زندہ ہوتی ہین۔ جب کہ شہداء زندہ حالت میں برزخ کے اندر داخل ہوتے ہیں اور شہید و غیر شہید کے درمیان یہی وہ بنیادی امتیاز ہے۔ البتہ بعض برگزیدہ انگشت شمار انسان اس سے مستثنٰی ہیں جو شہداء کے حقیقی معلم ہیں اور جن کے قلم و سخن سے شہداء نے شرف شہادت سیکھا ہے شہداء کے زندہ ہ حالت میں برزخ کے اندر جانے اور حالات دنیا سے مطلع ہونے پر سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹۔ ۷۰ ابہترین اور صریح دلیل ہیں ،ان آیات میں شہداء کے لئے کئی فضیلتیں رکھی گئی ہیں مثلاً" یہ کہ انہیں مردہ نہ سمجھا جائے بلکہ یہ اپنے پروردگار کے یہاں زندہ ہیں اور رزق پاتے ہیں اور یہ کہ جو کچھ بھی خداوند تعالی کی جانب سے ملتاہے اس پر راضی اور خوشحال ہیں۔

وَلاَتَحسَبَنَّ الّذِینَ قُتِلُوا فِی سَبِیل اللّٰہِ اَمواَتاً بَل اَحیَاءُ عِندَ رَبّھِم یُرزَقُونَ فَرِحِینَ بِمَا آتَاھُمُ اللّٰہ مِن فَضلَہ وَیَستَبشرِوُنَ بِالّذِینَ لَم یَلحقُوا بِھِم مِن خَلِفھِم اَلاّ خَوف عَلَیھِم وَلاَ ھُم یحزَنوُنَ (27)

اللہ کی راہ میں مارے جانے والوں کو ہرگز مردہ گمان نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے

پروردگار کے یہاں رزق پاتے ہیں انہیں جو کچھ خدا کے فضل و عنایت کے طفیل ملتا ہے اس پر خوشحال ہیں اور ان کے وہ ساتھی جو ان کے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی ان سے ملحق نہیں ہوئے ان کے بارے میں شہداء کو بشارت دی جاتی ہے کہ ان باقی رہنے والوں کو نہ کوئی خوف لاحق ہے اور نہ ہی کوئی حزن و ملال ہے۔

یعنی شہداء بشارت پانے والے اور خداوند تعالی بشارت دینے والا ہے اور وہ مسرت بخش خبر جو ان شہداء کو خداوند تعالی کی جانب سے ملتی ہے وہ ان کی راہ کو جاری رکھنے والوں کے حالات کے بارے میں ہے یعنی وہ لوگ جو راہ شہداء کو جاری رکھنے کی خاطر اپنی پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی تک ان سے ملحق نہیں ہو سکے شہداء ان کے بارے میں کاملا مطلع ہیں یعنی ایک تو اصل راہ کے تداوم اور جاری رہنے سے آگاہ ہیں دوم اس راہ کے تمام حالات اور اسے جاری رکھنے والوں کے احوال سے بھی آگاہ ہیں لہذا شہداء زندہ طور پر برزخ میں جاتے ہیں اور اس طریقے سے حیات دنیا و آخرت دونوں کے حامل ہوتے ہیں۔

اس قسم کے نکات کی طرف توجہ سے عرفان و حماسہ (معرفت و شجاعت) میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے اور انہی نکات کی طرف توجہ عارف کو کوی شہادت میں جا پہنچاتی ہے اور شہدائے اہل شہود کو اوج عرفان پر پہنچا دیتی ہے

طوبیٰ لهم و حسن مآب

زہے نصیب یہ مقام و یہ انجام

راہ حق میں جہاد کو فقط اخلاق کی کسوٹی پر ہی نہیں پرکھا جاتا بلکہ وقت کی ضرورت کے لحاظ سے اور ضرورت کے وقت جہاد کی اہم تاثیر کے اعتبار سے بھی پرکھا جاتا ہے چونکہ کبھی جہاد بہت ہی سخت اور مشکل ہوتا ہے اور بعض اوقات آسان و سہل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بعض اوقات حق و باطل میں فرق کرنا سخت دشوار ہوتا ہے اگر بالفرض حق کو باطل سے جدا کر بھی لیا جائے تو تشخیص حق کے بعد اس پر عمل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے چونکہ صحیح و غلط کی پہچان کے لئے نہ تو مناسب تہذیب و ثقافت (Civilization) کا ماحول ہوتا ہے اور نہ ہی

گھٹن کے ماحول میں جہاد کی کوئی گنجائش ہوتی ہے- چنانچہ ایسے وقت میں اگر کوئی شخص حق کو باطل سے تمیز دے لے اور حق کو صحیح طریقے سے سمجھ لینے کے بعد اس سے دفاع بھی کر لے تو قابل تحسین ہوگا-

جیسا کہ حضرت علی علیہ السلام کے امتیازات میں سے ایک قابل فخر امتیاز یہ ہے کہ آپؑ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا یعنی ایک طرف سے آپ کی قوت فکر اتنی بلند تھی جس کی بدولت آپ نے فوراً حق کو باطل سے تمیز دے لیا جب کہ دوسرے ابھی جہالت میں غوطہ ور خالص و ناخالص کی تمیز میں حیران و سرگردان تھے دوسری طرف سے آپ کے اندر انتہائی عالی سطح کی عملی شجاعت بھی موجود تھی جس کی بناء پر آپؑ حق پر ایمان لے آئے اور اس کے علاوہ ہر چیز کو باطل قرار دیا- پس ایمان میں علیؑ کی سبقت صرف زمانے کے لحاظ سے نہ تھی تاکہ اسے آپ کے لئے کمال وجودی (Existential Excellece) نہ سمجھا جائے ،بلکہ یہ آپؑ کی فکری و ثقافتی برتری اور سیاسی تقدم اور علمی و عملی سبقت تھی اور یہ تمام اوصاف تقدم وجودی (Existential Proiority) اور مرتبہ ہستی کی سبقت کے زیر سایہ ہی حاصل ہو سکتے ہیں-

خلاصہ کلام یہ کہ جہاد کی عظمت کو پہنچاننے کے اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ تاریخ کے حساس مواقع پر اس کی ضرورت کا احساس کیا جائے اور پھر اس آگاہی کے نتیجے میں مناسب اقدام کیا جائے- لیکن اگر کوئی حساس ترین تاریخی مراحل میں اپنا فریضہ تشخیص دینے سے قاصر رہے یا فریضہ تشخیص دینے کے بعد مناسب اقدام نہ کرے تو ایسا شخص اگرچہ جہاد کی بعض خوبیوں و اقدار کو پالیتا ہے لیکن اس کی عظمت اور اوج پر پہنچنے سے محروم ہی رہتا ہے- چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

لاَ یستوِی مِنکم مَن اَنفقَ مِن قَبلِ الفَتح وَ قَاتَل اُولِئكَ اَعظَمُ دَرَجَةً مِنِ اَلذینَ اَنفقوا مِن بَعدُ وَ قَاتَلوا وَکُلاً وَعَدَ اللّٰہُ الحُسنیٰ و اللّٰہُ

بِمَا تَعمَلُونَ خَبِیر(28)

تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے فتح مکہ سے پہلے اپنا مال خرچ کیا اور جہاد کیا ان کا مقام ان لوگوں سے کہیں زیادہ بڑا ہے جنہوں نے فتح مکہ کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد کیا ہے وہ ہرگز ان کے مساوی نہیں ہیں البتہ خدا نے سب کو اچھی عاقبت کا وعدہ دیا ہے چونکہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو خدا اس سے آگاہ ہے

یعنی فتح مکہ سے پیشتر جن لوگوں نے حجاز میں موجود شرک کے خلاف اسلام کی کامیابی و کامرانی کیلئے انفاق و جہاد کیا ہے ان کا مرتبہ زیادہ ہے ان لوگوں سے جو فتح مکہ کے بعد انفاق و جہاد میں مشغول ہوئے ہیں اس کے باوجود سب کی عاقبت اچھی ہے لیکن مراتب و مقامات میں فرق محفوظ ہے۔

ان مطالب کی روشنی میں درج ذیل حدیث میں موجود نکتے کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے۔

اور وہ حدیث یہ ہے کہ چونکہ جنگ احزاب میں پورے کا پورا اسلام تمام کے تمام کفر کے مقابلہ میں آکھڑا ہوا تھا لہذا دونوں میں سے ہر ایک کی فتح و کامیابی دوسرے فریق کی دائمی شکست کا باعث بن رہی تھی اور حضرت علی علیہ السلام جو اسلام کے مظہر کامل (Perfect Manifestation) تھے اسلام سے دفاع کرنے کے عنوان سے عمرو بن عبدود کے مقابلے میں آکھڑے ہوئے۔ اس وقت بہت سے لوگ حق و باطل میں فرق کرنے سے عاجز تھے اور بہت سے حق کو باطل میں تمیز کرنے کے بعد بھی اپنے فریضے پر عمل کرنے سے قاصر رہے جب کہ اس حساس تاریخی موقع پر علی علیہ السلام کے جہاد کا بہت ہی اہم نتیجہ نکلا اور کیونکہ بعد میں ہونے والے وہ تمام نیک اعمال جو خود حضرت علیؑ نے انجام دیئے یا دوسروں نے انجام دیئے وہ سب اس میدان میں اسلام کی حفاظت اور دین کے بچ جانے کے طفیل ہیں۔ اسی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ احزاب میں علی علیہ السلام کے جہاد کے بارے میں فرمایا۔

ضَربَةُ عَلِیٍّ یَومَ الخَندَقِ اَفضَلُ مِن عِبَادَةِ الثَّقَلَینِ(29)

خندق کے دن علیؑ کی ضربت ثقلین کی عبادت سے افضل ہے

نبی اکرمؐ کا یہ قول علیؑ کے جہاد کی اہمیت کی بخوبی حکایت کرتا ہے

اس واقعہ میں علیؑ کا اخلاص زبان زد خاص و عام ہے اور عربی و فارسی وغیرہ کے شعراء کے کلام میں بھی بکثرت بیان ہوا ہے۔ جیسا کہ مولانا روم کی مثنوی معنوی کی وہ معروف نظم جس کا مطلع یہ ہے۔

او خدو انداخت بر روی علیؑ ۔ افتخار ہر نبی و ہر ولیؓ

یعنی اس عمرو بن عبدود نے علیؑ کے چہرے پر آب دہن پھینکا وہ علیؑ جو ہر نبی اور ہر ولی کا افتخار ہیں۔

لیکن حضرت علی علیہ السلام کا یہ اخلاص آپ کے اور بھی بہت سارے کاموں میں موجود تھا جیسے مسکین و اسیر و یتیم کو کھانا کھلانا جس کے بارے میں سورہ ہل اتی کی کئی آیات اتری ہیں لیکن جنگ احزاب کی طرح وہ عالی شان تعبیر دوسرے مواقع پر بیان نہیں ہوئی بہر حال روح کی ترقی و تکامل میں حماسہ و شجاعت اور ظلم سے مقابلے کی تاثیر ہی حقیقی عرفاء کے لئے شوق شہادت کا باعث بنتی ہے اور راہ حق کے مجاہدین کو حقیقی اور اصلی عرفان سے آشنا کرتی ہے اور یہ حقیقت میں شجاعت و عرفان کے مابین ہم آہنگی و سازگاری ہے۔

راہ خدا میں جہاد و مبارزہ کے لئے کچھ خاص اصول و شرائط ہیں جن کا حصول ضروری ہے اسی طرح کچھ موانع اور رکاوٹیں بھی ہیں جن سے اجتناب لازمی ہے لیکن جہاد کا اہم ترین رکن اور اصلی شرط دنیا و آخرت کی تجارت یعنی دنیا بیچ کر آخرت خریدنا ہے۔ البتہ وہ دنیا جو ہر خطا کی جڑ اور بنیاد ہے اس سے مراد خدا کے علاوہ کسی اور طرف متوجہ ہونا ہے اور جس طرح آخرت کے درجات ہیں دنیا کے بھی کئی درکات ہیں ، جن میں سے بعض درکات دوسرے سے پست تر ہیں راہ خدا میں جہاد کی بنیادی شرط میں دنیا کے تمام درکات کو سمجھ کر ان سے نجات پانا اور آخرت کے درجات حاصل کرنا ہے

سورہ مبارکہ نساء کی آیۂ کریمہ ۷۴ نے اس راز پنہان سے یوں پردہ اٹھایا ہے۔

فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا

اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے جہاد کرنا چاہیۓ جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا کا سودا کر لیا اور جو بھی اللہ کی راہ میں جہاد کے دوران مارا جائے یا دشمن پر غلبہ پالے تو ہم اسے جلد ہی اجر عظیم عطا کریں گے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ خدا کی راہ میں انہیں جہاد کرنا چاہیۓ جو دنیا کو آخرت کے بدلے بیچ چکے ہوں البتہ جو بھی یہ تجارت کر کے راہ خدا میں جہاد کرے تو اس کے سامنے دو ہی راستے ہیں یا شہادت یا فتح لہذا صلح یا دشمن کے سامنے تسلیم ہونے وغیرہ کی مانند کوئی تیسری راہ موجود نہیں ہیں- چنانچہ اسکی طرف پہلے بھی اشارہ ہوا ہے-

پس دنیا کو ترک کر دینا جہاد کی واحد شرط ہے جیسا کہ بہشت کی قیمت بھی فقط ترک دنیا ہے یعنی دنیا چھوڑے بغیر جہاد میں خدائی رنگ پیدا نہیں ہوتا اور ایسا جہاد حقیقی فتح کا سبب بھی نہیں بنتا اور دنیا چھوڑے بغیر بہشت میں جانا ہی ممکن نہیں ہے چنانچہ حضرت امیر المومنین علیہ السلام یوں فرماتے ہیں-

طَلَاقُ الدُّنيَا مَهرُ الجَنّتِه (30)

جنت کا مہر دنیا کو طلاق دینا ہے

البتہ مہر جتنا ہو گا اتنی ہی جنت بھی ملے گی چونکہ بعض لوگ دنیا کو اس لئے چھوڑ دیتے ہیں تاکہ بہشت کی حسی (Sensory Delight)، خیالی (Imaginative Delight) یا عقلی (Intellective Delight) لذتوں کو پا سکیں- لیکن بعض افراد تمام قسم کی لذتوں سے اس لئے صرف نظر کرتے ہیں تاکہ الٰہی لذتوں کو پا سکیں اسی وجہ سے زاہد و عابد لوگ عرفاء کے ہم پلہ نہیں ہیں چنانچہ تمام عرفاء بھی آپس میں مساوی نہیں ہیں- پس لامحالہ زاہدوں کے جہاد اور عابدوں کی جنگ میں فرق ہو گا جیسا کہ ان دونوں کی

نبرد اور عرفاء کی مجاہدت میں بھی فرق ہے چنانچہ خود عرفاء کے جہاد میں بھی عرفانی مراتب کے مختلف ہونے کے وجہ سے بھی فرق ہوتا ہے۔

(31)ابن سینا قدس سرہ زہد کی تعریف یوں بیان فرماتے ہیں۔ دنیا کی لذتوں ، خوشبوں اور پاکیزہ چیزوں سے منہ موڑنے کو زہد کہتے ہیں اور جس شخص میں پرہیز اور اجتناب کی یہ صفت پائی جاتی ہو اسے زاہد کہتے ہیں۔

وہ عبادت کی تعریف یوں کرتے ہیں کہ فرائض ونوافل کو انجام دینا ، نماز وروزہ جیسے دیگر واجبات کی پابندی کو عبادت کہتے ہیں اور جس شخص میں یہ مثبت صفت پائی جاتی ہو اسے عابد کہتے ہیں۔

اور عرفان کے معنی بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اپنے اندر نور حق پیدا ہونے کی خاطر قدس جبروت (The World of Holy spiritual realities) کی طرف دائمی طور پر اپنی باطنی اور فکری توجہ رکھنے کو عرفان کہتے ہیں۔

اور جس شخص میں ایسی نفسانی صفت موجود ہو اور جو اپنے خیالات وافکار کو کنٹرول کر سکتا ہو وہ عارف کہلاتا ہے۔

البتہ کبھی زہد وعبادت آپس میں یا ہر دو عرفان کے ساتھ یکجا بھی ہو جاتے ہیں بلکہ زہد وعبادت کے لازمی نصاب کے بغیر عرفان ممکن ہی نہیں ہے لیکن عرفان کے بغیر زہد حاصل ہو جاتا ہے جیسا کہ زہد وعبادت ہر دو بغیر عرفان کے بھی حاصل ہو جاتے ہیں چونکہ ترتیب وار مراتب اور درجات میں ہمیشہ نچلے مرتبے کا اپنے سے مافوق مرتبے میں موجود ہونا ضروری ہے غیر عارف انسان کا زہد تجارت سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے گویا ایک متاع دیکر ایک متاع دیگر حاصل کرتا ہے جب کہ عارف شخص کا زہد ہر قسم کے ایسے متاع کو ترک کرنے سے عبارت ہے جو حق کی طرف توجہ میں مانع ہو اور خدا کے علاوہ ہر شے پر فائق آنا بھی اس کا زہد ہے۔ غیر عارف انسان کی عبادت بھی محض ایک قسم کی خرید و

فروخت ہے یا پھر فقط مزدوری اور اجرت ہے یعنی اس دنیا میں مزدوری کرتا ہے تاکہ آخرت میں اس کی اجرت دریافت کرلے۔ جب کہ عارف کی عبادت ان تمام باطنی قوتوں (Esoteric power) کی ریاضت (Ascetic Exercise) کا نام ہے جو اپنی قلمرو مادی (Material Domain) سے خارج ہو کر مرتبہ ماورائے مادہ (Immaterial) میں جا پہنچتی ہیں اور اولیاء اللہ کی معراج کی رفعت واوج پر ان کی رسائی ہے تاکہ تجلی حق کے موقع پر حرم دل کی پر امن قلمرو میں کوئی چیز راہزن نہ بن سکے اور صفحہ دل کو غبار آلود نہ بنا سکے۔ عارف کے لئے یہ امر ملکہ راسخہ (Deep Rooted Habit) کی صورت میں ثابت ہے اور یہ اس لئے ہے کہ جب بھی عارف کا باطن اشراقات (Intelligible Irra-diations) حق کے شہود (Intuition) کا متمنی ہو تو افکار و خیالات یا خواہشات کی جانب سے کسی قسم کی مزاحمت کے بغیر اس کی یہ تمنا پوری ہو جائے اور اس کی تمام خیالی (Imag-inal and sensation powers) و وہمی قوتیں اور اس کی ساری ہمیتیں بھی اس کی پیروی کر سکیں اور عارف اپنے پورے وجود سمیت حالت قدس اور لباس قداست میں ظاہر ہو سکے۔

بو علی سینا رحمتہ اللہ علیہ کے کلام میں جو کچھ بیان ہوا ہے خاص کر عرفاء کے زہد کے بارے میں وہ دراصل دینی نصوص سے ماخوذ ہے چونکہ اس کلام کی اساس امیر سخن حضرت علی علیہ السلام کے فرامین میں بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ علی علیہ السلام متقی اور پرہیزگار افراد کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

عَظُمَ الْخَالِقُ فِی اَنْفُسِهِمْ فَصَغُرَ مَادُوْنَهُ فِیْ اَعْیُنِهِمْ(32)

ان کے نفوس میں خالق کی عظمت ایسے رچی ہوئی ہے کہ اسکے علاوہ ہر چیز ان کی نگاہوں میں حقیر اور ذلیل ہے۔

پس متاع دنیا کو ترک کرنے کے کئی مراتب ہیں جیسا کہ اجر دریافت کرنے کے بھی کئی درجے ہیں ترک دنیا کا سب سے اہم ترین مرتبہ خدا کے ماسوا ہر چیز سے آزاد ہونا ہے اس

کے مقابلے میں اجرو پاداش کا سب سے عالی ترین مرتبہ لقاء اللہ و صال خدا ہے۔

چونکہ راہ خدا میں شہادت پانے والے صاحبان شہود خدا کے ماسوایا ہر چیز کو ترک کرنے کی توفیق پیدا کر سکتے ہیں لہذ القاء اللہ یا وصال حق کی لذت بھی پائیں گے اور یہ بعینہ عرفان و شجاعت کے درمیان ہم آہنگی ہے۔

وہ انسان جو لقاء اللہ کے درپے ہے اسے ہر اس شے سے آزاد ہونا چاہئے جو خدا کے علاوہ ہو لہذا اگر کسی موقع پر نام خدا کی حفاظت کے لئے مالی ایثار یا جان نثار کرنے کی ضرورت ہو تو وہ اپنی تمام محبوب چیزوں کو ترک کر دیتا ہے تا کہ نام خدا اور یاد حق باقی رہے چونکہ عرفان کے دعویدار کا ایمان و عقیدہ یہی ہوتا ہے کہ فقط خدا کے نام کو باقی رہنا چاہئے اور جہاد کا اصلی محرک بھی یہی ہے کہ:

لِتَكُونَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا (33)

تا کہ نام خدا ہی بلند و بالا ہو۔

اس طرح کا مجاہد دوسرے ہر مجاہد سے افضل اور ایسا عارف دوسرے تمام عرفاء سے برتر ہوتا ہے۔

حضرت امام سجاد علیہ السلام مناجاۃ العارفین میں دیگر اوصاف و شرائط کے ضمن میں عرفان کے نتائج و آثار کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

قَرَّتْ بِالنَّظَرِ اِلٰى مَحْبُوبِهِمْ اَعْيُنُهُمْ...... وَرَبِحَت فِيْ بَيْعِ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ تِجَارَتُهُمْ (34)

اے خدایا مجھے ان لوگوں میں سے قرار دے جن کی آنکھیں اپنے محبوب کی طرف نگاہ کرنے سے ٹھنڈی ہوتی ہیں اور دنیا کو آخرت کے بدلے بیچنے میں جنکی تجارت میں نفع ہوا ہے''۔

عرفاء کے یقین کا بہترین پھل زہد اور دنیا سے آزادی ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

ثَمَرَةُ الیَقِینِ اَلزَّهَادَۃُ(35)

یقین کا پھل زہد ہے

یہاں پر زہد سے مراد ترک دنیا ہے نہ کہ خلق خدا کی تعلیم اور ان کا تزکیہ نفوس ترک کرنا یا پھر معاشرے کی خدمت سے کنارہ کش ہونا ، پس زہد اور گوشہ نشینی میں فرق ہے ،ایک اہل یقین عارف انسان توحید کے پرچار اور اہل توحید کی خدمت کے لئے کسی بھی کوشش سے دریغ نہیں کرتا- چونکہ انسان کی قدروقیمت اس کے دل وزبان کی وجہ سے ہے لہذا اگر دل کے لحاظ سے دلیر اور زبان کے لحاظ سے صاف گو ہو تو قلبی اعتبار سے خدا کی معرفت اور اس کی یاد میں کامیاب ہوگا اور لسانی جہت سے دینی معارف کی ترویج میں بھی کامران ہوگا- چنانچہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں-

اَلْمَرءُ بِاَصْغَرِیَهُ ‘بِقَلِبِهِ وَلِسَانَهَ ‘اَن قَاتَلَ قَاتَلَ بِجِنَانٍ وَاِن نَطَقَ نَطَقَ بِبَیَانٍ (36)

انسان کے پاس بس دو چھوٹی سی چیزیں ہیں ایک دل اور ایک زبان اگر جنگ کرنا چاہے تو دل کے ذریعے کرے گا اور اگر بولنا چاہے تو زبان کے ذریعے بولے گا:

عارف انسان کو اپنے محبوب کے بغیر کبھی بھی چین نہیں آتا اور محبوب کا وصال اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے اختیار میں موجود ہر چیز کو محبوب کی راہ میں قربان نہ کردے چنانچہ سورہ توبہ کی آیت ۲۴ سے بھی استفادہ ہوتا ہے کہ-

قُلْ اِن کَانَ آبَائُکُمْ وَ اِخْوَانُکُمْ وَ اَزوَاجُکُم وَ عَشِیرَتُکُمْ وَ اَموَالُ اِقْتَرَفتُمُوهَا وَتِجَارَۃ تَخشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسَاکِنُ تَرضَوْنَهَا اَحَبّ اِلَیکُمْ مَنَ اللّٰهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِی سَبِیلِهِ فَتَرَبَصّوا حَتّیٰ یَاتِیِ اللّٰهُ بِاَ مرِهِ وَاللّٰهُ لاَ یَهدِی القَومَ الفَاسِقِینَ التوبہ۔ 34

”اے رسول انہیں کہہ دو کہ اگر تمہیں خدا اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے زیادہ اپنے آباؤ اجداد و اولاد ، بھائی ، بیویاں ، قبیلے ، بٹورے ہوئے اموال ، خوف خسارہ سے دوچار تجارتیں اور کاروبار اور پسندیدہ گھر عزیز ہیں تو پھر منتظر رہو کہ امر خدا آنے والا ہے اور جان لو کہ خدا فاسق قوم کو ہرگز ہدایت نہیں کرتا“۔

ایسے ہی سورہ مجادلہ کی آیت ۲۲ میں ارشاد ہوتا ہے۔

لاَ تَجِدُ قَوماً یُومِنُونَ بِاللّٰہِ وَ الْیَومِ الأخِرِیُوادُّونَ مَنّ حَادّ اللّٰہَ وَ رَسُولَہُ وَ لوکانُوا آبَائَہُمْ اَوْاَبْنائَہُمْ اَوْ اِخْوانَہُم اَوْ عَشیرَتَہُمْ أُولٰئِكَ کَتَبَ فِیْ قُلُوبِھِمُ الأِیمانَ وَ اَیّدَھُمْ بِرُوحٍ مِنہُ وَیُدخِلُھُم جَنّاتٍ تَجرِیْ مِنْ تَحتِھاَ الأَ نھَارُ خالِدِینَ فِیھاَ رَضِیَ اَللّٰہُ عَنھُمْ وَرَضُوا عَنہُ اولئِكَ حزب اللّٰہِ اَلا اِنّ حزِبَ اللّٰہِ ھُمُ المُفْلِحُونَ

”آپ کو ایسی قوم نہیں ملے گی جو ایک طرف سے اللہ اور روز قیامت پر ایمان رکھتے ہوں اور دوسری طرف سے خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں کے ساتھ محبت بھی کرتے ہوں اگرچہ وہ دشمنان خدا ان کے باپ دادا ، بھائی ، بیٹے یا قوم قبیلہ ہی کیوں نہ ہوں چونکہ خدا نے ان اہل ایمان کے دلوں میں ایمان اتار دیا ہے اور خدا کی جانب سے روح قدس بھی ان کی موئید ہے خدا انہیں نہریں بہتی ہوئی جنت میں بھیجے گا جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے خدا ان سے راضی ہے اور یہ خدا سے راضی ہیں یہی لوگ حزب خدا ہیں اور جان لو کہ حزب خدا ہی کامیاب ہے“۔

ان آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو انسان خدا اور قیامت پر ایمان رکھتے ہیں وہ خدا اور رسول کے دشمنوں کو ہرگز پسند نہیں کرتے خواہ وہ ان کے باپ دادا بھائی بیٹے یا عزیز و

اقارب ہی کیوں نہ ہوں۔ یعنی معرفت خدااور وصال حق کا شوق ہر راہزن سے نجات کا باعث ہے اور ہراس مقام تک پہنچنے کا سبب ہے جواس شوق کی تسکین کر سکے۔

عارف کا شوق سوائے وصال کے کسی چیز سے تسکین نہیں پاتا اور وصال ، قتال کے بغیر ممکن نہیں ہے اور قتال معرفت کامل کے بغیر ممکن نہیں ہے پس اس بناء پر میدان سیاست کے اندر حماسہ شجاعت و ستم ستیزی اور عرفان حقیقی کے درمیان مکمل آہنگی ایجاد ہوتی ہے۔

اور یہ جو کہا گیا ہے کہ شوق کی آگ وصال کے علاوہ کسی شے سے نہیں بجھ سکتی اس کی دلیل خالصانہ جنگ کے مرد میدان اور حقیقی صاحب عرفان مولی الموحدین امیر المومنین علی علیہ السلام کے کلام مبارک میں یوں بیان ہوئی ہے۔

لَم تَسکُن حَرَقَتهُ الحِرمَانِ حَتّیٰ یَتَحَقّقُ الوِجدَانُ(37)

حرمان کی جلن اور فراق کی آگ وصال کے بغیر ٹھنڈی نہیں ہوتی

شاید شہود حق کے شوق کے باعث ہی درج ذیل آیت کریمہ میں مجاہدین اور شرط جہاد کے ذکر سے پہلے مقصد جہاد کو بیان کیا گیا ہے جو راہ خدا کو زندہ کرنے سے عبارت ہے چنانچہ ارشاد ہوا ہے:

فَلیُقَاتِل فِی سَبِیلِ اللّٰہِ الّذِینَ یَشرُونَ الحَیَاۃَ الدنیَا(38)

جو لوگ آخرت کے بدلے دنیا فروخت کردیتے ہیں انہیں اللہ کی راہ میں جہاد کرنا چاہئے۔

اس آیت میں کلمہ فی سبیل اللہ کا ذکر کلمہ الذین سے پہلے جب کہ الذین سے مراد مجاہدین ہیں جو قتال کرنے والے ہیں۔

پس عارف انسان کا مقصود اصلی عقیدہ توحید اور اس کے پرچار کے علاوہ کچھ اور نہیں ہوتا اور قرآن کریم نے دوسری طرف سے حماسہ کا اصلی مقصد بھی احیاء توحید اور ہر قسم کے کفر و شرک کو ختم کرنا قرار دیا ہے لہذا خداوند تعالی کا ارشاد ہے۔

وَقَاتِلُوْ هُمْ حَتّیٰ لَاتَکُونَ فِتْنَةٌ وَیَکُونَ الدِّیْنُ کُلُّهُ لِلّٰه (39)

"تم ان لوگوں کے ساتھ قتال کرو تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو اور تمام کا تمام دین فقط اللہ کے لئے ہو جائے"۔

یعنی ان کفار کے خلاف جہاد کرو تاکہ شرک و طغیان اور خدا کے علاوہ دوسروں کی ربوبیت کا دم بھرنے جیسے فتنے فروکش ہو سکیں اور دین محض خدا کے لئے ہو۔ چونکہ فتنے سے مراد یہاں پر شرک و طغیان ہے لہذا یہ قتل سے بدتر ہے خداوند تعالی کا ارشاد ہے:

وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ (40)

اور فتنہ قتل سے زیادہ برا ہے

عارف انسان چونکہ ہمیشہ خداوند تعالی کی رحمت خاصہ کو حاصل کرنے کی فکر میں ہوتا ہے لہذا کبھی بھی دین کی راہ میں جہاد کرنے سے پہلو تہی نہیں کرتا اس کی وجہ یہ ہے کہ راہ خدا میں جہاد کرنا بجائے خود اللہ تعالی کی رحمت خاصہ اور خیر مخصوص ہے البتہ جہاد کے رحمت ہونے کا راز سب کو معلوم نہیں ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔

کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِتَالَ وَھُوَ کُرْہٌ لَّکُمْ وَ عَسیٰ اَنْ تُکْرِھُوا شَیْئاً وَھُوَ خَیْرٌ لَّکُم (41)

"تمہارے لئے جنگ و قتال کو ضروری قرار دیا گیا ہے حالانکہ تم اسے ناپسند سمجھتے ہو لیکن ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند سمجھو اور وہ تمہارے لئے خیر ہو"۔

جہاد حقیقی کبھی بھی عرفان خالص کے بغیر نہیں ہو سکتا جیسا کہ خالص عرفان بھی ہرگز مال و شہرت کے ایثار اور جان نثار کئے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا لہذا حقیقی مجاہدین کی توصیف میں عرفاء کی نشانیاں مشہود ہیں اور عرفاء واقعی کی شناخت میں مجاہدین کی علامتیں نمایاں ہیں اس بارے میں دینی نصوص بکثرت موجود ہیں لیکن ہم یہاں پر ان میں سے بعض کے نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں حضرت علی علیہ السلام اپنے بچھڑے ہوئے شہید ساتھیوں کے بارے میں یوں فرماتے ہیں۔

اَیْنَ الْقَوْمُ الَّذِیْنَ دُعُوا اِلَی الْاِسْلَامِ فَقَبِلُوْہ، وَ قَرَؤُالْقُرآنَ فَاَحْکَمُوْہُ وَ ھِیْجُوا اِلَی الْجِھَادِ فَوَلَھُوْا وَلَہَ اللّقَاحِ اِلَی اَولاَ دِھاَ، وَ سَلَبوا السّیوفَ اَغمادَھاَ وَ آخَذُوا بِاطرَافِ الْأَرضِ زَحفاً زَحفاً و صَفّاً صَفّاً، بَعْضُ ھلكَ وَ بَعْضُ نَجاَ لاَیَبْشَرُونَ بِالْأَحیاَءِ وَ لاَیَعزّونَ عَنِ الْمَوْتیٰ (القتلیٰ)(42)

کہاں ہیں وہ لوگ جنہیں اسلام کی دعوت دی گئی تو انہوں نے فورا" اسے قبول کر لیا۔ جنہوں نے قرآن پڑھا تو اسے متقن و محکم پایا ، جہاد کے لئے انہیں ابھارا گیا تو وہ اس کی طرف اس طرح عاشقانہ طور پر بڑھے جیسے دودھ پلانے والی اونٹنیاں مشتاقانہ طور پر اپنے بچوں کی طرف دوڑ پڑتی ہیں۔ وہ تلواروں کو اپنی نیاموں سے نکال کر دستہ بہ دستہ اور صف بہ صف زمین کے اطرف میں پھیل گئے ان میں سے کچھ مارے گئے اور کچھ نجات پاگئے۔ نہ بچ جانے والوں کی نجات پر مژدہ و شاباش لیتے تھے اور نہ ہی مرنے والوں اور شہید ہونے والوں کی موت پر تسلیت و تعزیت وصول کرتے تھے"۔

یعنی نہ زندہ بچ جانے والوں کی نجات اور زندگی پر خوش ہوتے تا کہ کوئی انہیں شاباش دیتا اور نہ ہی شہید ہونے والوں کے لئے پریشان ہوتے تا کہ کوئی انہیں تسلیت و تعزیت کہتا اور شوق کے ساتھ جہاد کے لئے جاتے یہ مقام عرفان حقیقی کے بغیر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا۔

اِنّ اللّٰہَ وَ ملٰئکَتَہُ یُصلّون اعلی اَصحاَبِ الْخَیْلِ مَنِ اتّخَذَھاَ وَ اَعدّھاَ لِماَرِقٍ فِی دِیْنِہ اَوْمُشْرِكٍ(43)

"خدا اور اس کے ملائکہ ان گھڑ سواروں پر درود بھیجتے ہیں جو اپنے گھوڑوں کو لیکر مشرکین اور دین سے خارج ہونے والوں کے مقابلوں کے لئے آمادہ کریں۔"

پیامبر اکرمؐ سے ہی مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا شہید کے لئے سات خصلتیں اور فضیلتیں ہیں۔

1- شہید کے خون کا پہلا قطرہ گرتے ہی اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔

۲- شہید کا سر بہشتی حوروں کی گود میں قرار دیا جاتا ہے جو اس کے چہرے سے غبار ہٹاتیں اور اسے تحسین کرتی ہیں۔

۳- اسے بہشتی لباس پہنایا جاتا ہے۔

۴- بہشت کے نگہبان معطر خوشبوؤں کے ساتھ اس کے استقبال کے لئے آتے ہیں۔

۵- شہید بہشت میں اپنا مقام ملاحظہ کرتا ہے۔

٦- روح شہید سے کہا جاتا ہے کہ بہشت میں جس جگہ چاہو آزادی کے ساتھ انتخاب کر کے اس میں رہ سکتے ہو۔

وَالسّابعَتهُ اَنْ یَنظُرَ فی وَجهِ اللهِ وَاَنّها لَراَحتَهُ لِکُلّ نَبیٍ وَ شَهِیدِ(44)

۷- شہید وجہ اللہ کا نظارہ کرتا ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جو ہر نبیؑ اور شہید سے ہر قسم کے رنج و غم کو دور کر دیتی ہے۔

حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ آپؑ نے فرمایا۔

بِانفاقِ المُهجِ یَصِلُ العَبدُ اَلٰی برّحبیبه وَ قُربَهِ(45)

"راہ خدا میں خون دینے سے ہی بندہ محبوب کی خوبیوں تک پہنچ سکتا ہے اور محبوب کی قربت حاصل کر سکتا ہے۔"

یعنی راہ خدا میں خون دینے کے بعد بندہ قرب محبوب حاصل کر کے ابرار کی صف میں داخل ہوتا ہے اور مقام ابرار تک پہنچنا یا مقام قرب خدا حاصل کرنا عرفاء کے ان عالی ترین

مقاصد میں سے ہے جن پر شہداء عارف ہی نائل آسکتے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے کہ قیامت میں تین ایسے گروہ شفاعت کریں گے جن کی شفاعت خداوند تعالی کے یہاں مقبول ہوگی۔ انبیاء ' علماء ، شہداء اور مقام شفاعت تک پہنچنا عرفاء کی بہترین آرزوں میں سے ہے۔

البتہ عارف واقعی لقاء اللہ اور وصال خدا کے علاوہ کسی اور چیز کا طلب گار نہیں ہوتا لیکن راہ معرفت و عرفان کو مسلسل جاری رکھنا خود ہی اسے مقام شفاعت تک پہنچا دیتا ہے۔جو کچھ بھی ایک عارف کی آرزو ہوتی ہے وہ سب اہل شھود و شہداء کو نصیب ہو جاتا ہے مذکورہ مقاصد کے لئے جہاد ایک تعمیری عرفان کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ مذکورہ محرکات کے ہمراہ عرفان بھی دین کی راہ میں فداکاری کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اگرچہ عرفان ہمیشہ جہاد اکبر کے ہمراہ ہوتا ہے لیکن جہاد اصغر کو ہرگز ترک نہیں کرتا ورنہ جہاد اصغر کو ترک کرنے سے جہاد اکبر میں بھی ناکام رہے گا نہ فاتح۔

ممکن ہے بعض اوقات سرے سے جنگ کی ضرورت ہی نہ ہو جیسے صلح وامن کے دنوں میں لیکن یہ بہت ہی نادر ہے کیونکہ قرآن مجید کے اس اصول کی بناء پر کہ۔

قَاتِلوُ هُم حتیٰ لَا تکوُنَ فتنۃً وَ یکوُنُ الدِینُ کُلّہُ لِلّہ(47)

ان کفار کے ساتھ جنگ کرو تاکہ فتنہ پیدا نہ ہو اور دین تمام کا تمام اللہ کے لئے ہو۔

موجودہ دور میں ہرگز آرام وآسائش کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

دین کی راہ میں حماسہ اور حقیقی عرفان کے درمیان یگانگت کی امید کے ساتھ۔

والسلام علی عباد اللہ الصالحین

عبداللہ جوادی آملی

حوزہ علمیہ قم

پہلی فصل

سید الشہداء حضرت امام حسین بن علی علیہما السلام گوناگوں اور مختلف انداز میں عالم انسانیت کے سامنے ظاہر ہوئے۔ عرفاء کے لئے دعائے عرفہ کے روپ میں ، عدل و انصاف کے محافظ، محروم و ستم رسیدہ مظلوموں کے حامی، حکمرانوں اور رہبروں کے لئے نمونہ عمل اور بنوامیہ کی ستم کاریوں اور مظالم کے خلاف ایک بھرپور انقلاب کی شکل میں جبکہ پرہیز گار اور با تقویٰ انسانوں کے لئے کئی اور صورتوں میں نمایاں ہوئے۔

دعائے عرفہ کے عالی شان مضامین حماسہ کربلا کے ساتھ فقط امام حسین علیہ السلام ہی جمع ہو سکے ہیں۔ البتہ عصر حاضر میں آپ کے نائبین میں امام خمینی رحمتہ اللہ علیہ ایسے انسان ہیں جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کی پیروی کرتے ہوئے مترقی عرفان کو شرق و غرب کے ظالموں اور ستم کاروں کے خلاف جہاد کے ساتھ یکجا کیا ہے۔ تو جسطرح سید الشہداء علیہ السلام کی شناخت ایک مدت دراز کے بعد ممکن ہوئی ہے اسی طرح "آپ کے پیرو حقیقی" یعنی امام خمینیؒ کی شخصیت سے حقیقی آشنائی بھی ایک مدت دراز اور طویل تاریخ کے بعد ہی ممکن ہو گی۔

امام خمینیؒ اکثر اوقات سیاسی مسائل کو عرفانی مطالب کے پرتو میں بیان کیا کرتے تھے عید فطر اور عید قربان وغیرہ جیسی مختلف مناسبتوں کے حوالے سے سالانہ ملاقاتوں کے دوران عام مجمع میں ظاہر ہوتے اور نہایت وسیع اور عالمی سطح کی گفتگو فرماتے ، نیز زائرین اور حجاج بیت اللہ الحرام کے نام اور دیگر بعض مواقع پر سالانہ کئی تحریر شدہ پیغام بھی صادر کرتے تھے جن میں تمام اہل عالم سے ہم کلام ہوتے البتہ یہ خطابات و پیغامات کئی حصوں پر

مشتمل ہوتے جن میں سے اہم ترین حصے' خداشناسی' خودشناسی اور خود سازی جیسے اہم عرفانی مسائل کے ہوتے۔

"اس بارے میں قرآن کریم و عترت طاہرہ سے منقول مطالب عالیہ کو یہاں بیان کیا جاتا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ امام خمینیؒ کی زبان اور نوک قلم سے ادا ہونے والے ان مسائل کی بنیاد کتنی عمیق اور عظیم الشان ہے۔

آیت میثاق:

قرآن مجید نے تمام انسانوں کو اصل میثاق کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا ہے :

وَ اِذاَخذَرَبُّكَ مِنْ بَنِى آدمَ مِنْ ظُهُوْرِ هِمْ ذُرِّيّتهمْ واشهدهُم على اَنفُسهِمِ اَلَستُ بِرَبّكمْ قَالُوابَلٰى(1)

یاد کرو اس موقع کو جب تمہارے پروردگار نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو خارج کیا اور انہیں خود ان کے اوپر شاہد قرار دیا ،تب ان سے یہ عہد و میثاق لیا کہ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں تو سب نے جوابا" کہا کیوں نہیں۔

گویا قرآن مجید تمام انسانوں سے مخاطب ہے کہ اس منظر کو یاد کرو جس میں تم نے خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں عہد کیا تھا۔وہ منظر آج بھی موجود ہے۔اگر تم اسے فراموش نہ کردو تو وہ بھلایا نہیں جاسکتا اور اگر تم نے اسے ترک نہ کیا تو وہ بھی کبھی تمہیں ترک نہیں کرے گا۔

اس آیت کریمہ میں خطاب تمام مسلمانوں اور توحید پرستوں بلکہ پوری انسانیت سے ہے'عربی ادب کے قواعد کے مطابق کلمہ "اذاخذ" ظرفِ منصوب ہے جس کا فعلِ ناصب "اذکر" محذوف ہے دراصل معنی یہ ہے کہ واذکر اذاخذ ...... یعنی یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے میثاق لیا۔

قرآن کریم نے بہت سی جگھوں پر تاریخی واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے اور پھر نبی اکرم کو خطاب ہے کہ ان تاریخی واقعات کو یاد کرو ،اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تمام واقعات جو انبیاء

سلف کے ساتھ پیش آئے ہیں ان کے دو رخ ہیں۔

ایک ان کا زمانی پہلو ہے جس کی بنا پر یہ واقعات کسی خاص زمانے میں وقوع پذیر ہوئے ہیں اور تاریخ کا حصہ قرار پائے ہیں۔

دوسرا ان کا ملکوتی چہرہ ہے جو کسی زمان کے اندر نہیں سما سکتا بلکہ زمانے کی حدود سے باہر ہے لہذا کسی زمانے سے منسوب و مقید بھی نہیں ہے۔

مثال کے طور پر قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کو خطاب ہوا ہے۔

وَاذکُرْ فِی الْکِتَابِ اِبْرَاھِیْمَ اِنَّهُ کَانَ صِدِّیْقاً نَبِیّاً (2)

اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو کہ وہ صدیق اور نبی تھا۔

حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے سبق آموز واقعہ کے دو رخ ہیں ایک وہ رخ ہے جو تاریخ کا حصہ بن گیا ہے اور دوسرا وہ پہلو ہے جس میں حضرت ابراہیم کا خداوند تعالی کی ذات مقدس سے ملکوتی رابطہ Angelic Relation ship بر قرار ہوا کہ یہ رخ کسی زمانے میں نہیں سما سکتا بلکہ زمان سے ماوراء ہے۔ ایسے ہی رسول اکرمؐ کو خطاب ہوا ہے۔

وَاذکُرْفِی الْکِتَابِ مَرْیَمَ اِذَا انْتَبَذَتْ مِنْ اَھْلِھَا مَکَاناً شَرْقِیّاً(3)

اور اس کتاب میں مریم کو یاد کرو جب وہ اپنے خاندان سے دور ہو کر مشرق کی جانب مکان میں گوشہ نشین ہو گئیں۔ اور اس طرح کے دیگر واقعات جو انبیاء سلف کے بارے میں قرآن مجید نے بیان کئے ہیں۔ ان سب کا ایک حصہ کسی معین زمانے میں رونما ہوا ہے جبکہ دوسرا چہرہ زمانے کی حدود سے مافوق ہے۔

اگرچہ مورخین نے بھی حضرت ابراہیمؑ ، حضرت موسیؑ ، حضرت عیسیؑ اور کئی دیگر ابراہیمیؑ انبیاءؑ کے ساتھ پیش آنے والے واقعات کو تاریخ میں ثبت کیا ہے لیکن تاریخ کے اندر ان کا صرف وہی چہرہ سما سکتا ہے جس کا تعلق زمانے سے ہو اور جو چیز زمانے سے مربوط

نہ ہووہ تاریخ وزمان سے ماوراء ہے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے تمام انسانوں سے عہدو میثاق لینے کا واقعہ بھی تاریخ وزمان سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ مکمل طور پر ایک غیر زمانی اور غیر زمینی مسئلہ ہے۔ یہ جو خداوند تعالی نے تمام انسانوں کو خطاب کر کے فرمایا ہے۔ "یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے ہر انسان کی ذریت کو حاضر کر کے پھر الگ الگ سب سے اقرار لیا اور خود سے ان کے وجود کا مشاہدہ کروایا۔ تب ان سے پوچھا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں ؟ سب نے کہا کیوں نہیں" یہ ایسا مسئلہ نہیں ہے جسے مورخین نے اپنی تاریخوں میں قلمبند کیا ہو کہ فلاں دن خدا نے بشر سے عہد لیا اور انسان نے فلاں دن خدا سے عہد کیا ۔نہ ہی افسانوں میں اسکا ذکر ہے۔ حاصل یہ کہ نہ کسی مدون تاریخ میں بیان ہوا ہے اور نہ ہی غیر مدون تاریخ میں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ ایک زمانی یا زمینی مطلب نہیں تھا کہ جسے تاریخ قلمبند کرتی چونکہ زمین وزمان سے بالاتر ہے لہذا ہمیشہ کے لئے زندہ و موجود ہے اور اسی جاودانی کی بناء پر تمام انسانوں کو ہمیشہ اس کی طرف بلایا جاسکتا ہے جب بھی اس کی کھوج میں نکلیں گے خود اسی کو پائیں گے لہذا آج بھی اگر میثاق کے اس منظر کی طرف رجوع کیا جائے تو اس منظر کو اسی طرح دیکھیں گے کہ خداوند تعالی انسانوں سے عہد لے رہا ہے اور ہم آج اور اسی لحظہ عہد کر رہے ہیں چونکہ خداوند تعالی نے ہم سے فرمایا ہے کہ اس عہد کرنے کے منظر کو یاد کرو تو اس سے مراد یہ ہے کہ ابھی تم عہد کر رہے ہو۔ پس ثابت ہوا کہ میثاق و عہد لینے کا منظر ایک تاریخی واقعہ نہیں ہے ماضی وحال و مستقبل کے حدود سے بھی باہر ہے تاریخ کی کہنگی سے فرسودہ بھی نہیں ہوتا بنابریں ہر وقت اس کی طرف رجوع کیا جاسکتا ہے' ہر لحظہ اسے یاد میں بھی لایا جاسکتا ہے۔ چونکہ ہمیشہ زندہ ہے خداوند تعالی کا ارشاد ہے یاد کرو اس وقت کو جب تم سے تمہارے پروردگار نے پوچھا کہ تمہارا رب کون ہے تو خود تم نے جواب دیا کہ خدا ہمارا رب ہے۔ اس آیت کریمہ کا مضمون ہر گز یہ نہیں ہے کہ خداوند تعالی نے فقط آدم علیہ السلام کی ذریت کو چھوٹے چھوٹے ذروں کی شکل میں حاضر کر کے پھر ان سے یہ پیمان لیا ہے۔ چونکہ یہ مطلب قرآن کے ظاہر کے بھی خلاف ہے اور عقل بھی اس کی

مخالف ہے آیت کریمہ میں بھی سرے سے چھوٹے ذرات یا صلب آدمؑ سے ان ذرات کو نکالنے کی بات ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ قرآن میں ذریہ بنی آدمؑ کی بات ہو رہی ہے یعنی اس انسان کی پشت سے خود اسی شخص کی ذریعہ کو حاضر کیا گیا اور پھر اسے اس حد تک پہنچادیا کہ اپنے آپ کو پہچان سکے ،البتہ یہ وہ خود شناسی نہیں ہے جس کی طرف امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے اس کلام میں اشارہ فرمایا ہے۔

عَرَفْتُ اللّٰهَ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَ حَلِّ الْعُقُودِ وَ نَقْضِ الْهِمَمِ (4)

میں نے اللہ کو ارادوں کے ٹوٹ جانے ،نیتوں کے بدلنے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے پہچانا ہے۔

دراصل خدا کی معرفت کا یہ راستہ علی علیہ السلام نے درمیانی درجے کے لوگوں کے لئے بیان فرمایا ہے جو حصولی وذہنی Empirical Knowledge And Mental Knowledge علم کا راستہ ہے چونکہ جو شخص استدلال کے ذریعے اپنے آپ کو پہچانتا ہے درحقیقت وہ اپنے بجائے کسی اور کو پہچانتا ہے جو علم بھی الفاظ ،تصورات Apprehen-sions اور تصدیقات Acknowledgements کے ذریعے ہو وہ غیر کے متعلق ہوتا ہے نہ کہ اپنے متعلق بلکہ انسان جب بھی فکر Thought کرتا ہے یا سوچتا ہے تو کسی غیر کے بارے میں سوچتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ فکر واندیشہ Thought یا حروف Prepo-sition مفہوم ہو یا تصور Conception تصدیق Acknowledgement استدلال یہ سب انسان سے جدا ہیں چونکہ سب علم حصولی ہیں لیکن اگر استدلال وفکر وتصور وغیرہ درکار نہ ہوں اور

عَرَفْتُ اللّٰهَ بِفَسْخِ الْعَزَائِمِ وَ حَلِّ الْعُقُودِ وَ نَقْضِ الْهِمَمِ(4)

خدا کو ارادوں کے ٹوٹنے ،نیتوں کے بدلنے اور ہمتوں کے پست ہو جانے سے پہچاننے کی بات نہ ہو۔ بلکہ اس سے عمیق تر وجدان Intuition حضور ومشاہدہ باطنی کے

ذریعے انسان اپنی شناخت کر لے تو اس وقت جوں ہی انسان اپنی طرف دیکھے اسی لحظے ذات خداوند تعالیٰ کو بھی دیکھ لے گا۔ اس کا موقع آج بھی ہے خداوند تعالیٰ نے ہمیں اسی کی یاددہانی کرائی ہے گویا یوں فرمایا ہے کہ اس منظر کو یاد کرو جب تم نے عہد کیا تھا جس میں تم دم بدم اور ہمیشہ عہد کر رہے ہو۔ کبھی پردہ غفلت تمہارے لئے اس عہد کو پورا کرنے میں حائل ہو جاتا ہے لیکن چونکہ تم نے عہد کیا ہے لہذا اس عہد کو پورا کرو۔ ارشاد خداوند تعالیٰ ہے۔

اَوۡفُوۡا بِعَھۡدِیۡ اُوۡفِ بِعَھۡدِکُمۡ (5)

تم میرے عہد کو پورا کرو میں تمہارا عہد وفا کروں گا۔ میرا عہد یہ ہے کہ تم نے اقرار کیا تھا کہ میں خدا ہوں۔ مقام شہود اس قدر شیریں، لذت بخش اور گوارا ہے کہ وہاں پر میں اور تو کے ذریعے خطاب نہیں ہوتا۔ یوں نہیں پکارا جاتا کہ

اَنۡتَ الۡخَالِقُ وَ اَنَا الۡمَخۡلُوۡقُ.......... اَنۡتَ الرَّبّ وَ
اَنَا الۡمَرۡبُوۡبُ.......... اَنۡتَ الۡغَنِیُّ وَ اَنَا الۡفَقِیۡرُ..........
اَنۡتَ الۡحَیّ وَ اَنَا الۡمَیِّتُ.......... (6)

الٰہی تو خالق ہے میں مخلوق ہوں ______ تو رب ہے میں مربوب ہوں
تو غنی ہے میں فقیر ہوں ______ تو زندہ ہے میں میت ہوں۔

بلکہ مقام شہود اس سے بالاتر ایک مرتبہ ہے اسی وجہ سے آیہ کریمہ

اَلَسۡتُ بِرَبِّکُمۡ قَالُوۡا بَلٰی

میں من و تو کے خطاب کے بجائے سوال بھی ایک کلمہ ہے اور جواب بھی ایک کلمہ ہے رب اور عبد کی بات نہیں ہے خداوند تعالیٰ نے یہ نہیں پوچھا کہ آیا تم عبد اور بندے ہو یا نہیں ؟ اور آیا میں تمہارا خدا ہوں یا نہیں ؟ بلکہ سوال فقط اس حد تک ہے کہ آیا میں پروردگار ہوں یا نہیں ؟

الست بربکم میں جو ضمیر مخاطب ہے یعنی 'کم' اسکے معنی عبید اور بندوں کے نہیں ہیں بلکہ اس سے مراد ایسا مربوب محض Object of lord ship ہے جو خود سے کچھ بھی

نہیں ہے۔ ایسے ہی جیسے آئینہ کے اندر تصویر ہوتی ہے ؟

یہی وجہ ہے کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کے کلمات اور مناجات یکساں نہیں ہیں بلکہ ان مقدس ہستیوں سے منقولہ کلام میں بہت زیادہ نشیب و فراز ہیں - چونکہ حضرات معصومین علیہم السلام اپنے کمزور شاگردوں سے ایک طرح سے بات کرتے تھے اور درمیانے درجے کے افراد سے کسی اور طرح سے ہم کلام ہوتے جبکہ بعض ذہین شاگردوں کے ساتھ کسی اور طرز سے مخاطب ہوتے تھے۔

چنانچہ عبداللہ بن سنان باوجودیکہ امام صادق علیہ السلام کے معروف شاگردوں میں سے ہیں- لیکن پھر بھی امام صادق علیہ السلام نے ذریح محاربی کو ایک ایسا مطلب بتایا جو عبداللہ بن سنان کو نہیں بتایا تھا- ابن سنان کو جب معلوم ہوا تو وہ امام علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے اس آیت کے معنی آپ سے پوچھے تو آپ نے اور طرح سے جواب فرمایا جبکہ ذریح محاربی نے بھی آپ سے اسی آیت کے معانی پوچھے تو آپ نے اس کو مختلف جواب دیا ہے ،اس پر امام علیہ السلام نے فرمایا۔

وَمَنْ يَحْتَمِلُ مِثْلَ مَا يَحْتَمِلُ الْمُحَارِبِی(7)

"کون ہے جو محاربی کی طرح ہمارے علوم و معارف کو تحمل کر سکتا ہو"

گویا امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر ہمیں ایسا شاگرد میسر آجائے جس میں ان تعلیمات کو برداشت کرنے کی قدرت ہو تو ہم اسے بہت گہرے اور عمیق مسائل بھی بتائیں گے۔ آج بھی ہم زیارت کے موقع پر جب ائمہ معصومین علیہم السلام کی بارگاہ میں شرفیاب ہوتے ہیں تو اسی حقیقت سے دوچار ہوتے ہیں-

اس کی دلیل زیارت جامعہ کبیرہ ہے جو ان مشاہد مشرفہ میں شرفیابی کے لئے پڑھی جانے والی بہترین زیارت ہے- اس زیارت کا ایک بڑا حصہ ائمہ معصومین کی بارگاہ میں اظہار ادب اور ان کی تجلیل و تعظیم پر مشتمل ہے۔ لیکن اس زیارت کا ایک بہت ہی عالی شان اور نورانی حصہ دعا و مناجات سے متعلق ہے ،البتہ اس حصے کے تمام جملات انشائی -Exelara

tive Sentence جملے ہیں نہ کہ خبری Declartive Sentence چنانچہ زیارت جامعہ کے ضمن میں ہم ائمہ معصومینؑ کی خدمت میں یوں عرض کرتے ہیں:

اِنِّی مُحتَمِلٌ لِعِلمِکُم مُحتَجِبٌ بِذِمَّتِکُم (8)

میں آپ کے علوم کا بوجھ اٹھانے والا اور آپ کی امان میں پناہ لینے والا ہوں۔

یعنی آپ نے مجھے امان دی ہے اور میں آپ کی امان میں پناہ لینے آیا ہوں اور چونکہ اب میں آپ کی پناہ اور آپ کے حصن ولایت میں آچکا ہوں لہذا اب آپ کے علوم کا بوجھ اٹھانے آیا ہوں نہ کہ تحفہ تحائف خریدنے کے لئے، چونکہ آپکا فرمانا ہے۔

اِنّ اَمرَنَا صَعبٌ مُستَصعَبٌ لاَ یَحتَمِلُهُ اِلاّعَبدٌ مُؤمِنٌ اِمتَحَنَ اللّٰهُ قَلبَهُ لِلاِیمَان (9)

ہمارا کلام بہت ہی سخت اور مشکل ہے اسے سوائے ایسے مومن کے کوئی بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ جس کے دل کو خدا نے ایمان کے لئے آزمالیا ہو۔

حضرت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

اِنّ حَدِیثَ آلِ مُحَمّدٍ صَعبٌ مُستَصعَبٌ لاَیُؤمِنُ بِهِ اِلاّملَكٌ مُقَرّبٌ اَوْ نَبِیّ مُرسَلٌ اوعَبدٌ اِمتَحَنَ اللّٰهُ قَلبَهُ لِلاُیمَان (10)

آل محمدؐ کا کلام بہت سخت اور مشکل ہے کسی مقرب فرشتے۔ نبی مرسل اور ایسے عبد مومن کے سوا کوئی بھی اس پر ایمان نہیں لاتا کہ جسکے دل کو خدا نے ایمان کے لئے آزمالیا ہو۔

یعنی انسان اس زیارت میں گویا یوں پکار رہا ہے کہ چونکہ آپؑ نے فرمایا ہے ہمارے پاس کچھ ایسے علوم ہیں جنہیں فقط انبیاء ہی اٹھا سکتے ہیں جنہیں اولیاء ہی برداشت کر سکتے ہیں جنہیں صرف خاص مومنین ہی اپنے دوش پر اٹھا کر سکتے ہیں لہذا میں بھی آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں تاکہ آپ کے ان علوم کا بوجھ اٹھا سکوں۔ میں اس لئے آیا ہوں تاکہ آپ مجھے

شرح صدر عطا کریں پہلے مجھے استعداد اور ظرفیت عطا فرمائیں اور پھر اس ظرفیت کے مطابق علم بھی عطا کریں انسان ہر گز یہ نہ سوچ کہ دوسروں میں چونکہ سمجھنے کی قدرت تھی لہذا وہ سمجھ گئے ہیں ہم میں یہ قدرت موجود نہیں ہے۔ کیونکہ جس نے دوسروں کو یہ قدرت فہم عطا کی ہے وہ طلب و دعا کے نتیجہ میں ہمیں بھی یہ قدرت عطا فرمائے گا۔

اسی طرح حضرت امام سجاد علیہ السلام سے منقول وہ نورانی دعا بھی ہے جو دعائے ابی حمزہ ثمالی کے نام سے معروف ہے اس میں حضرت امام سجاد علیہ السلام ہمیں خدا کی بارگاہ میں کچھ عرض کرنے کا طریقہ اس طرح سے سکھا رہے ہیں:

اے پروردگار تو نے ہمیں حکم دیا ہے کہ صالح انسان ہو ، ہم صالح و نیک انسان بننا چاہتے ہیں لیکن نیکی اور اچھائی اور خیر سب کی سب تیرے پاس ہے' تیرے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ پروردگار تو نے جو کچھ دیا ہے ہم اس پر راضی ہیں اور جو کچھ نہیں دیا ہے اس پر بھی قانع اور مطمئن ہیں لیکن خیر و نیکی فقط تیرے پاس ہے اور تیرے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ اگر ہم سے کہا جائے کہ دوسروں نے جو کچھ خدا سے دریافت کیا ہے ان میں اس کی صلاحیت Preparedness اور ظرفیت موجود ہے اور ان میں عطائے خدا کو دریافت کرنے کے لئے شرح صدر موجود ہے تو ہم بھی رو رو کر ناز کے طور پر تیری بارگاہ میں عرض کریں گے کہ دوسروں کو یہ سب کچھ کس نے عطا کیا ہے ؟ انہیں یہ سب صلاحیت و ظرفیت کس نے عطاء کی ہے ؟ چونکہ بعض اوقات انسان کو یہ اجازت مل جاتی ہے کہ وہ اپنے پرودگار کی بارگاہ میں دوستانہ طور پر راز و نیاز کر سکے اسی کو دلال Dalal ناز کرنا کہتے ہیں کہ ایک دوست دوسرے دوست کی بارگاہ میں جائے اور اس سے کسی حجاب کے بغیر بات کرے۔

چنانچہ دعائے ابی حمزہ ثمالی کے بعض حصوں میں ہمیں خداوند تعالیٰ سے عرض کرنے کا طریقہ یوں بتایا گیا ہے کہ اے پروردگار اگر تو نے مجھے میرے جرم و گناہ کی بناء پر پکڑا اور میرا مواخذہ کیا تو میں تیری عفو و بخشش کے سہارے عرض کروں گا کہ اگر میں نے گناہ کیا ہے تو تو نے بخشا کیوں نہیں اور یوں کہوں گا:

الٰہی اِن اَخَذتَنِی بِجرُمِی اَخَذتُك بِعَفوِكَ (11)

الٰہی اگر تو مجھے میرے جرم پر پکڑے گا تو میں تیری بخشش کا دامن پکڑوں گا۔ یہ کون سا مقام ہے۔اور وہ کونسا انسان ہے جسے یوں خدا نے بے پردہ بات کی اجازت دی ہے۔البتہ انسان کو اس طرح ناز و دلال کی اجازت مل تو جاتی ہے لیکن اس وقت یہ اذن ملتا ہے جب انسان اپنے منہ کو پاک کرے اور اپنی تطہیر کرلے چنانچہ ارشاد ہوا ہے

طَهِّرُوا افواهكم فَانها طُرُقُ القرآن (12)

اپنے منہ کو پاکیزہ کرلو کہ یہ قرآن کے راستے ہیں۔

دعائے ابو حمزہ ثمالی کے آغاز میں امام سجاد علیہ السلام یوں فرماتے ہیں

مِن اَینَ لِی الخَیرُ یَا رَبِّ وَ لاَ یُوجَدُ اِلاّ مِن عِندِكَ وَمِن اَینَ لِیَ النَّجاۃ ولاَ تُستَطاعُ اِلاّ بِكَ

یعنی اے پروردگار تو نے مجھے حکم تو دیا ہے کہ اہل خیر میں سے ہو جاؤں اور اہل نجات میں سے ہوں لیکن اے پروردگار بھلائی تو ساری تیرے پاس ہے اور نجات دینے والا بھی فقط تو ہی ہے۔

لاَالَّذِی اَحسَنَ اِستَغنیٰ عَن عَونِكَ وَ رَحمتِك وَ لاَ الذی اَساءَ وَاجتَرءَ عَلَیكَ وَلَم یُرضِكَ خَرَجَ عَن قُدرِتكَ

اگر کسی نے کوئی نیکی اور بھلائی کی ہے تو وہ اس میں تیری مدد اور رحمت سے بے نیاز نہیں ہے اگر کسی نے برائی کی ہے اور تیری بارگاہ میں جسارت کی ہے اور تجھے ناراض کیا ہے تو وہ بھی تیری قدرت سے باہر نہیں ہے۔ یعنی اے میرے پالنے والے اگر بعض لوگ اہل خیر میں سے ہیں اور نجات پا گئے ہیں تو یہ تیرے دیئے ہوئے فیض کی وجہ سے ہے اور اگر مجھ جیسے محروم رہ گئے ہیں تو تیرے علاوہ کہاں سے پائیں؟

یہ دعا ہر ایک کے لئے نہیں ہے چونکہ ہر ایک اس طرح سے بات کرنے کا مجاز

نہیں ہے بلکہ فقط کوئی آشنا ہی اس طرح سے مخاطب ہو سکتا ہے۔

اگر اس قسم کے مسائل حل ہو جائیں تو معلوم ہو جائے گا کہ امام خمینی قدس سرہ کے تشیع جنازہ میں لاکھوں افراد کیوں اس قدر آہ و فریاد و شیون کرتے تھے اور کیوں یہ داغ آج تک نہیں مٹ سکا بلکہ ہرگز نہیں مٹے گا۔

امام خمینی دشمنوں کے تمام پراپیگنڈے کے باوجود ایک دنیاوی آلائشوں سے پاک انسان تھے۔ جو شخص انہیں نزدیک سے نہ جانتا ہو اور صحیح تجزیہ کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو ان کے بارے میں کچھ کہنے سے قاصر ہے وہ ایک ایسے انسان تھے جو بلا شبہ اس آیہ مجیدہ کا جلی مصداق تھے کہ

لَا يَخَافُونَ لَومَةَ لَائِمٍ (المائدہ ۵۴)

وہ خدا کی راہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے ہرگز نہیں ڈرتے۔

ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے کہ ایک طرف سے تمام بدکار لوگ اسکو بدنام کر رہے ہوں اور دوسری طرف سے وہ نادان دوست جن میں انقلاب کو سمجھنے کی قدرت مفقود تھی نصیحت کے روپ میں مخالفت کر رہے ہوں لیکن وہ خطرات کے باوجود اپنے اقدام سے دست بردار نہ ہو بلکہ مستقلاً اس راہ پر ثابت قدم رہے حتی کہ اسلام کو اپنی عالمی عزت و شوکت پر پہنچا کر دم لے۔

بعض لوگ انقلاب سے قبل اسلام کے بارے میں بحث و تمحیص میں مشغول تھے وہ اسلام کے بہت ہی عمیق اور گہرے مطالب و معارف اور آزادی خواہانہ اسلامی احکام، حقوق اور قوانین کو فقط کتابوں کے اندر ہی موجود پاتے تھے۔ لیکن جس انسان نے ان علوم و معارف کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر منصہ واقعیت و سیاست میں منتقل کیا ہے وہ فقط امام خمینی کی عظیم شخصیت ہے۔

یہ عظیم مقام انسان کو اسی صورت میں نصیب ہوتا ہے جب وہ ان عظیم الشان مضامین پر مشتمل دعائے عرفہ، مناجات شعبانیہ اور دعائے ابی حمزہ ثمالی میں کافی غور و فکر کرلے

-اور یہ کہ جب تک انسان آیت میثاق پر عمل نہ کرے اور ان دعاؤں اور مناجات میں جھانک کر نہ دیکھ لے اس مقام تک ہر گز نہیں پہنچ سکتا۔ آیت میثاق میں خداوند تعالی کا فرمان ہے کہ میثاق کے اس منظر کو یاد کرو۔ انسان اگر اپنے آپ میں آئے تو بخوبی اپنے آپ کو عہد دینے کی حالت میں پائے گا اور ہر آن اپنے آپ کو اس ندائے الٰہی کے جواب میں بلیٰ کہتے ہوئے پائے گا۔ البتہ یہ بلیٰ اگر انسان کی فطرت و روح سے نکل رہا ہوتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں اور پاؤں سے ''لا'' کیوں سنا جا رہا ہے ؟

یہ کوئی تاریخ واقعہ بھی نہیں ہے جو طاق نسیاں کے سپرد کر دیا جائے بلکہ ابھی اسی حالت میں ہم میں سے ہر ایک خداوند تعالیٰ کو عہد دے رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہم اس شہودی اور حضوری عہد و پیمان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ یہ واقعہ کس قلم سے لکھنے کے قابل ہے ؟ یہ کوئی ایسا واقعہ نہیں ہے جو رونما ہو کر گزر گیا ہو تا کہ کوئی یہ کہہ سکے۔

در روز الست بلیٰ گفتی امروز به بستر لا خفتی (13)

یعنی روز الست کو تو تم نے بلیٰ کہا ہے اور آج بستر لا پر سوئے ہوئے ہو۔ واقعہ میثاق میں توامروز و فردا متصور نہیں ہیں بلکہ جسطرح کل بلیٰ کہا تھا آج اور آئندہ بھی اپنی روح کے اندر بلیٰ کہہ رہے ہو اگر چہ یہ قالب بدنی بستر لا پر سویا ہی کیوں نہ ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عالم جس میں بلیٰ کہا جاتا ہے ایک نہ ختم ہونے والا عالم ہے۔

انسان اگر اپنے باطن میں جھانک کر دیکھے تو اندر سے چند چیزیں سنے گا۔ ایک تمام اشیاء کی اپنی اپنی مخصوص زبان میں تسبیح سنے گا اور دوسرے اندر سے بلیٰ کا جواب سنے گا۔ وہ لوگ جو اپنے باطن سے یہ جواب نہیں سنتے ان کی روح کے کان بہرے اور روحانی آنکھیں اندھی ہیں اور جو لوگ اپنے اندر یہ آواز سن لیتے ہیں وہ سمیع و بصیر ہیں۔

لَاتَعمَی الابصَارُ وَلکِن تَعمَی الْقُلوبُ الّتیِ فِی الصّدوُرِ (14)

ان کی آنکھیں اندھی نہیں ہیں بلکہ سینوں میں ان کے دل اندھے ہیں۔

انسان کو چاہئے کہ پہلے اپنی روح کی آواز سنے بعد میں دوسروں کی باتوں کو سنے۔ جو اپنی

روح کی آواز نہیں سن سکتا اسے یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی روح اس سے کیا کہہ رہی ہے اسے یہ توقع نہیں ہونی چاہئے کہ دوسروں کا کلام سن کر اسے سمجھ لے گا۔ چونکہ انسان جب اپنی بات سن لے تو دوسروں کی باتیں سمجھنے کے قابل ہوتا ہے۔ نہ یہ کہ فقط پرندوں کی آوازیں سمجھ سکتا ہے۔

عُلِمنَا مَنطِقَ الطَّیر (15)

ہمیں پرندوں کی بولیاں سکھائی گئی ہیں۔

بلکہ زمین و آسمانوں کی بولیاں بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اور یہ مقام سب کے لئے مقدور ہے پس ہمیں اپنے آپ کو سستا اور ارزاں فروخت نہیں کرنا چاہئے۔ ممکن ہے ایک انسان سرے سے اہل درس و بحث ہی نہ ہو مدرسے اور کتاب جیسے حجاب میں بھی مبتلا نہ ہو کوئی ایسی چیز بھی جو اسے اپنی طرف جذب کر لے اس کے پاس موجود نہ ہو تو یہ ایک آزاد انسان ہے ایسا انسان بقول حافظ نہ فقط ہر اس چیز سے آزاد ہوتا ہے جس پر رنگِ تعلق Attach-ment چڑھا ہوتا ہے بلکہ ہر اس چیز سے بھی آزاد ہوتا ہے جس پر رنگِ تعین چڑھا ہوا ہو ۔ درحقیقت یہی وہ انسان ہوتا ہے جس کے بارے میں خداوند تعالی کا ارشاد ہے۔

لاَ یَخَافُونَ لَومَتہَ لاَئِم (المائدہ54)

اللہ کی خاطر کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خائف نہیں ہوتے۔

اگر کسی شخص کے ساتھ ایک ایسا ناگوار واقعہ پیش آئے جس کی وجہ سے اس کی عزت و آبرو خطرے میں پڑ جائے تو وہ کتنا خائف رہتا ہے۔ لیکن پوری عمر میں آیا کبھی ایسے بھی ہوا ہے کہ قیامت کے دن اپنی رسوائی کی وجہ سے خوف خدا ہمارے دل میں پیدا ہوا ہو۔ چونکہ خداوند تعالی کا ارشاد ہے۔

رَبَّنَاَ مَن تُد خِلِ النَّارَ فَقَد اَخزَیتَہُ (16)

اے ہمارے پروردگار تو جسے جہنم میں ڈالتا ہے اسے رسوا کر دیتا ہے۔

امام خمینی مرحوم قدس سرہ نے لوگوں کو یہی راہ دکھائی ہے آپ نے علمی اور عملی طور

پر لوگوں کے لئے عرفان کے دروازے کھولے ہیں انہوں نے انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم بھی اپنے باطن میں جھانک کے دیکھ اپ باطن کی آواز کو سنو جب یہ راہ طے کی جاسکتی ہے تو پھر کیوں نہ ہم سب یہ راہ طے کریں اور معلوم نہیں کیوں ہم یہ راہ طے نہیں کررہے ؟

حضرت امام حسین علیہ السلام سے منقول دعائے عرفہ میں بھی اگر غور کیا جائے تو بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اس دعا میں بھی علم حصولی Empirical Knowledge and Mentel Knowledee کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ اسکے کئی جملات میں معرفت حضوری Intuition کی تصریح ہوئی ہے۔

امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں بارگاہ خداوند تعالیٰ میں یوں عرض کرتے ہیں

اِلٰهِی مَن کَانَت حَقَائِقُهُ دَعَاوِی فَکَیفَ لَاتکُونُ دَعَاوِیه دَعَاوِی

اے میرے معبود جسکے حقائق سارے کے سارے محض دعویٰ ہیں اس کے دعوے کیونکر دعویٰ محض نہ ہوں۔

یعنی امام علیہ السلام عرض کررہے ہیں کہ اے پروردگار ہمارے پاس ایک حقیقت ہے اور ایک محض دعویٰ چونکہ انسان میں کچھ کمالات ہیں اور کچھ فقط دعوے ہیں جو لوگ اہل راہ نہیں ہوتے وہ دعوی محض کو بھی حقیقت سمجھتے ہیں لیکن جو اہل راہ ہوں اپنے حقیقی کمالات کو بھی اور حقائق کو بھی محض دعویٰ سمجھتے ہیں۔ چونکہ میرے پاس جو کچھ بھی ہے وہ سب تیرا ہے۔ دوسروں کے پاس جو چیز نہیں ہے اس کا بھی دعویٰ کرتے ہیں لیکن میرے نزدیک ہر شئے دعویٰ محض ہے اور کوئی چیز میرے لئے نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص خدا کے ساتھ اپنے عہد کے اس منظر وواقعہ سے آشنا ہو جائے اسے رب اور مربوب کے درمیان رابطے کا علم ہو جائے تو اسے بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ انسان کے پاس کوئی چیز بھی اپنی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی شخص نے مرحوم امام خمینی سے خط کے ذریعے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے

کوئی نصیحت کیجئے توامام خمینی نے جواب میں فرمایا:

ہماری ہر شئے خدا کی جانب سے ہے پس بہتر یہی ہے کہ اپنی ہر چیز راہ خدا میں خرچ کردیں۔

امام خمینی کے جواب کی سند توحید کی تعلیمات ہیں چونکہ اگر ایک خوبصورت وزیبا چہرہ آئینہ کے سامنے آئے اور اس میں منعکس ہو تو آئینے کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ کہے میں حسین ہوں بلکہ اسے کہنا چاہئے کہ صاحب صورت حسین ہے نہ کہ میں ، جیسا کہ اگر آئینے میں ایک پھل دار درخت کا سایہ منعکس ہو تو آئینہ کو حق نہیں پہنچتا کے کہے میں پھل دیتا ہوں بلکہ اسے کہنا چاہئے جس درخت کی تصویر ہے پھل بھی اسی کا ہے ایسے ہی انسان بھی اپنے اندر جو کچھ رکھتا ہے سب فیض خداوند تعالیٰ کا ہے اور انسان فیض الٰہی کی عکاسی کرتا ہے لہذا خداوند تعالیٰ سے یوں عرض کرتا ہے۔

اِلٰهِی مَن کَانَت حَقَائِقُهُ دَعَاوِی فَکَیفَ لَاتَکُونُ دَعَاوِیه دَعَاوِی

یعنی خدایا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے بلکہ میرے تو حقائق بھی محض دعوے ہیں۔

چنانچہ اگر امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ سمجھ میں آجائے تو اس صورت میں شہادت کا رمز و راز بھی معلوم ہو جائے گا اور یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ امام حسین علیہ السلام شہادت کے اتنے مشتاق کیوں تھے۔

ائمہ معصومین علیہم السلام میں ہر امام کی ذات گرامی خداوند تعالیٰ کے اسمائے حسنی میں سے کسی ایک اسم کی مظہر ہے لہذا جو امام بھی امام حسین علیہ السلام کے زمانے میں موجود ہوتے آپ ہی کی طرح مطالب بیان کرتے اور عمل کرتے اور اگر حضرت سید الشہداء علیہ السلام صادقین علیہما السلام کے عہد میں ہوتے تو انہی کی مانند دین کے مروج ہوتے چونکہ ہر معصوم کا ایک خاص مقام اور ایک جدا ظہور ہے۔ ہمیں سید الشہداء علیہ السلام کے نام کو ہمیشہ کے لئے زندہ و باقی رکھنا چاہئے چونکہ آپ کا ہدف و مقصد جاودانی ہے اور یہ امام

حسین علیہ السلام کی ذات ہی ہے جس نے دعائے عرفہ میں عرفان کے ساتھ کربلا کا حماسہ بھی خلق کیا ہے یہ آپ کی ذات گرامی ہی ہے کہ جب صحیح وسالم تھے تو اس وقت فرمایا۔

اِلٰهِی مَن کَانَت حَقَائِقُهُ دَعَاوِی فَکَیفَ لَاتَکُونُ دَعَاوِیهِ دَعَاوِی

اور جب زخمی حالت میں گھوڑے کی زین سے زمین پر تشریف لائے تو اس وقت بھی بارگاہ خدا میں یوں عرض کی۔

رِضاً بِقَضَائِكَ تَسلِیماً لِاَمرِكَ ، لَامَعبُودَ سِوٰكَ یَا غِیَاثَ المُستَغِیثِینَ (17)

اے پروردگار تیری قضاء پر راضی اور تیرے حکم کے سامنے تسلیم ہوں تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اے پکارنے والوں کی مدد کرنے والے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیشہ خدا کے ساتھ میثاق کا منظر آپؑ کے سامنے تھا بلکہ جو بھی اس عہد نامہ الٰہی پر اپنے دستخط دیکھ لے تو اپنی حرمت کا پاس کرتے ہوئے اس کا احترام کرے گا اور ہمیشہ اپنے آپ کو خدا کی ربوبیت کا اقرار کرتے ہوئے پائے گا۔

مرحوم سید حیدر آملی قدس سرہ تیس سال کی عمر میں اپنے ملکی اور ملکوتی سفر کی تفصیل بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اکثراوقات یہ آیت کریمہ میرے ورد زبان رہتی تھی۔

وَمَن یَخرُجْ مِن بَیتِهِ مُهَاجِراً اِلَی اللّٰهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ یُدرِکهُ المَوتُ فَقَدَ وَقَعَ اَجرُهُ عَلَی اللّٰهِ وَکَانَ اللّٰهُ غَفُوراً رَحِیماً (18)

"اور جو بھی اپنے گھر سے اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف ہجرت کرے اور پھر اسے موت آجائے تو اس کا اجر خدا کے ذمے ہے اور خدا غفور ورحیم ہے۔

اسکے علاوہ ایک مشاق عارف کا کہا ہوا یہ شعر بھی ورد زبان رہتا۔

تَرَکتُ الخلق طرا" فی هواکا　　　وایتمت العیال لکی اراکا

فلو قطعتنی اربا اربا　　　لما حن الفواد الی سواکا (19)

تیری چاہت میں میں نے ساری مخلوق کو چھوڑ دیا ہے اور تجھے دیکھنے کے لئے اپنے بچوں کو تنہا چھوڑ آیا ہوں۔ پس اگر تو مجھے کاٹ کر ٹکڑے ٹکڑے بھی کر دے تو بھی میرا دل تیرے علاوہ کسی طرف مائل نہیں ہو گا۔

سید حیدر آملی کے بقول یہ شعر بہت بعد میں کسی شاعر نے کہا ہے اور حضرت سید الشہداء علیہ السلام سے منسوب کر دیا گیا ہے بہر حال شاعر نے آپ کے اس راز کو مختصر طور پر پالیا ہے جبھی تو اس کا راز بیان کر سکا ہے۔

اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اپنے بچوں کو اس لئے اسیر کروا آیا ہوں تاکہ بہشت میں جا سکوں بلکہ مدعا یہ ہے کہ میں نے اپنی اولاد اسیر کروائی ہے تاکہ وصال خدا کے رفیع مقام تک پہنچ سکوں۔ اس طرح وہ غزل بھی ہے جو مرحوم امام خمینی نے ''حسن ختام'' کے نام سے لکھی ہے یاد رہے کہ یہ غزل آپ نے ان ایام میں کہی تھی جب ایران کے تمام شہر اور رہائشی علاقے ہوائی حملوں کی زد میں تھے اور ایران کے رہائشی علاقوں پر دور مار عراقی میزائلوں نے ایک قیامت مچا رکھی تھی ان تمام مصیبتوں کا بوجھ فقط امام خمینی کے دوش پر تھا جنگ کے سارے مصائب بھی آپ ہی کو برداشت کرنے پڑ رہے تھے اس کے باوجود خدا سے عرض کرتے ہیں کہ اے خدا یہ عدم اندر عدم مجھ سے لے لے اور حسن ختام مجھے عطاء فرما نیز یہ زمام و مقام اور نام و ننگ مجھ سے لے لے اور اپنی ذات مجھے عطاء فرمایہی ان کی سب سے بڑی آرزو تھی۔

یہ وہی راہ ہے جس پر ان کے مولیٰ و آقا حضرت امام حسین علیہ السلام چلے ہیں یہی عاشورا ہے ہم سب کو عاشورا ایسے ہی منانا چاہیئے۔ غزل حسن ختام:

۱ - الا یا ایها الساقی زمی پر ساز جامم را

که از جانم فرو ریزد هوای ننگ و نامم را

۲- از آن می ریز در جانم که جانم را فنا سازد
برون سازد ز ہستی هسته نیرنگ و دامم را

۳- از آن می ده که جانم را ز قید خود رہا سازد
بخود گیرد زمامم را فرو ریزد مقامم را

۴- از آن می ده که در خلوتگه رندان بی حرمت
بهم کو بد سجودم را بهم ریزد قیامم را

۵- نبودی در حریم قدس گل رویان می خانه
که از هر روزنی آیم گلی گیرد لجامم را

۶- روم در جرگه پیران از خود بی خبر شاید
برون سازند از جانم همی افکار خامم را

۷- توای پیک سبک باران دریای عدم ازمن
به دریا دار آن وادی رسان مدح و سلامم را

۸- بساغر ختم کردم این عدم اندر عدم نامه
به پیر صومعه بر گو ببین حسن ختامم را (20)

۱- اے ساقی (میخانہ ہستی) میرے جام کو اس شراب سے بھر دے جو میری جان وروح سے نام و ننگ کی خواہشات کو دور کر دے۔

۲- میری جان کے پیمانے میں ایسی شراب ڈال دے جو میرے وجود کو فانی کر دے اور میرے وجود اور میری ہستی سے تمام نیر نگ و حیلے باہر نکال دے۔

۳- مجھے وہی شراب پلا جو میری جان کو اسکی اپنی ہی قید سے آزاد کر دے۔ ایسی شراب جو میری لگام خود سنبھال لے اور میرے مقام و منصب کو نیست و نابود کر دے۔

۴- ایسی مے پلا جو بے حرمت رندوں کی خلوت گاہ میں میرے سجدے اور قیام کو درہم

برہم کردے۔

۵- تم میخانے کے پھول جیسے چہروں کی مقدس محفل میں موجود نہ تھے ورنہ دیکھتے کہ میں جس طرف سے بھی گزرتا ایک پھول میری لگام تھام لیتا تھا۔

۶- میں مدہوش و بے خبر مرشدوں کے جرگے میں جاؤں کہ شاید وہ میری روح سے ان خام افکار کو نکال سکیں۔

۷- اور تو اے بحر عدم کے سبک بار مسافروں کے قاصد میری طرف سے اس دیار کے ناخدا کو سلام و ادب کہنا کہ

۸- میں نے یہ عدم اندر عدم کا پیغام قصئہ ساغر پہ آکر ختم کیا ہے پیر صومعہ سے کہہ دو کہ وہ آکر میرا حسن ختام ملاحظہ کرے۔

دوسری فصل

ائمہ ھدیٰ حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں۔

شجاعت اور عرفان کے درمیان اجتماع ممکن ہے یا نہیں ؟ یعنی کیا ہو سکتا ہے کہ انسان ایک طرف لطیف اور ایثار پسند روح کا مالک ہو اور دوسری طرف ایک نہ جھکنے والی روح بھی اس میں موجود ہو۔ اور جس روح میں جہاد و فداکاری جیسا وصف موجود ہو کیا ایسی روح حق تعالیٰ کے ساتھ مناجات اور رازدل بھی بیان کر سکتی ہے یا نہیں ؟

خداوند تعالیٰ کی طرف سے منصوب معصوم پیشواؤں سے مذکورہ دو اوصاف علماء نے بالعموم اور انقلابی رہنماؤں نے بالخصوص وراثت میں پائے ہیں۔ چونکہ الہٰی پیشوا، حق تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے مظاہر ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی ذات کے اندر کئی اسمائے حسنیٰ کو جمع کئے ہوئے ہے۔ لہذا ایک نرم و ملائم روح کے ساتھ ساتھ جہاد و دفاع اور ستم گروں کے ستم کو تسلیم نہ کرنے کی روح بھی ان میں زندہ ہے اس مطلب کے اثبات کے لئے ائمہ معصومین علیہم السلام کی مناجات میں بھی غور کرنا چاہئے اور محاذ جنگ پر بیان کئے گئے ان کے کلمات پر بھی توجہ کرنی چاہئے چونکہ تمام باتیں ایک ہی روح سے ادا ہوئی ہیں ۔یہ تو ممکن ہے کہ ایک انسان پوری زندگی فقط عرفان کا روپ دھار لے اور دوسرا شخص فقط حماسہ و شجاعت کا رنگ اختیار کر لے لیکن یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اہم بات یہ ہے کہ ایک انسان ایک ہی وقت میں ایک ہی زمانے اور ایک ہی حالت میں اہل حماسہ و شجاعت بھی ہو اور روح عرفان بھی رکھتا ہو۔

ائمہ ہدیٰ علیہم السلام سے منقول مناجات اور محاذ جنگ پر بیان کئے گئے خطبات کا تعلق دو زمانوں سے نہیں ہے ، علی علیہ السلام جو کلمات خلافت اور جنگ سے پہلے ادا کرتے تھے وہی خلافت و جنگ کے بعد بھی فرمایا کرتے تھے جنگ کی حالت میں جب جنگی فرامین جاری

کرتے اسی حالت میں آپؑ سے حق تعالی کے ساتھ مناجات کی گنگناہٹ بھی سنائی دے رہی ہوتی۔

چونکہ ایک کامل انسان جہاں رحمت کا مظہر ہوتا ہے وہاں مقدس قہر کا بھی مظہر ہو سکتا ہے اور اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ ذیل کی آیت کا مصداق کامل بن جاتا ہے۔

لاَیَخَافونَ لَومتَهَ لاَئِم (المائده ٥٤)

کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

لہٰذا ائمہ ہدیٰ علیہم اسلام کا کلام بالعموم اور بالخصوص حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی مناجات اور محاذ جنگ کے خطبات ملاحظہ کئے جائیں تو بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ عرفان الٰہی کس طرح حماسہ و شجاعت کی ساتھ سازگار ہے۔ پس ثابت ہوتا ہے کہ ایک انسان کا اہل گریہ وزاری و اہل مناجات ہونا در حالانکہ وہ اہل رزم و جنگ ہونا عین ممکن ہے البتہ پوری تاریخ میں ایسے بارعب و اہل شجاعت انسان بہت کم ہیں جو وطن سے دوری اور ہجرت کے رنج و مصائب کو بھی برداشت کرتے ہوں اور ساتھ ساتھ اہل مناجات بھی ہوں۔

اگر اس مطلب کو قبول کرنے میں دشواری پیش آئے تو حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی ذات گرامی کو ملاحظہ کیا جائے جو تمام انقلابات کا سرچشمہ ہے تاریخ نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی زندگی کے دو پہلو واضح و آشکار کئے ہیں۔

ایک وہ چہرہ جو ہرگز تسلیم ہونے پر آمادہ نہیں ہے اور ایک وہ چہرہ جس میں نرم دلی اور مناجات کے علاوہ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

امام علیہ السلام سے منقول دعائے عرفہ سراسر عرفان، عشق، شوق اور بارگاہ خدا میں خشوع و خضوع کا اظہار ہے جب کہ میدان کربلا کے تمام خطبے سراسر حماسہ و شجاعت جنگ و جہاد کے فرامین اور دشمنوں سے بیزاری کا اظہار ہیں۔

اس کا اصلی سبب بھی خود دعائے عرفہ میں بیان ہوا ہے دعائے عرفہ اگرچہ ہمیں درس

مناجات دیتی ہے لیکن اس کے آغاز میں بعض راز و رموز بھی بیان ہوئے ہیں امام حسین علیہ السلام اس دعا میں خداوند تعالی کی جن بہترین نعمتوں کو شمار کرتے ہیں اور ان کے بدلے میں خداوند تعالی کی حمد وثناء کرتے ہیں ان میں سے بعض کا ذکر یوں کرتے ہیں کہ

اے پروردگار ، تونے ان آسمانوں کو خلق کیا ہے۔ تو ظالموں کی سرکوبی کرتا ہے -اے پالنے والے تونے مجھ پر دیگر احسانات کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا احسان یہ کیا ہے کہ تونے انتظار کیا تاکہ ظلم و جاہلیت کا زمانہ ختم ہوجائے کفر کی بساط لپیٹ دی جائے اور اسلامی نظام برپا ہوجائے تب تونے مجھے اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کے سائے میں خلق کیا۔

پس امام حسین علیہ السلام خداوند تعالیٰ کی محض اس بات پر حمد کررہے ہیں کہ خدا نے انہیں زمانہ جاہلیت میں خلق نہیں کیا۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ ہم تو زمانہ جاہلیت میں رہتے تھے۔ سرے سے کچھ معلوم ہی نہ تھالہذا ہم معذور تھے لیکن انسان کامل کی بلند پرواز روح اس معذور ہونے پر قانع نہیں ہوتی بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی عذر پیش نہ آئے اس کی سعی یہ ہوتی ہے کہ آگاہ ہوجائے اور جہالت کے عذر کے بغیر زندگی بسر کرے۔ لہذا امام حسین علیہ السلام بارگاہ خداند تعالیٰ میں عرض کرتے ہیں کہ خدایا تیرا شکر ہے اس امر پر کہ تونے مجھے ائمہ کفر کی حکومت میں پیدا نہیں کیا۔یعنی خدایا تونے مجھے نعمت اسلام اس کے عمیق معارف اور اس کی تعلیمات سے محروم نہیں کیا۔

یہ مطلب انسانی معاشرے کو اسلامی حکومت تشکیل دینے کی طرف رغبت دلاتا ہے کیونکہ کفر کی حکومت میں معارف الٰہی اور اخلاق انسانی تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ مناجات کی توفیق بھی فقط حکومت اسلامی کے زیر سایہ ہی کسی کو نصیب ہوسکتی ہے۔

اب انہی جملوں کو حضرت امام حسین علیہ السلام کے ان تاریخی کلمات کے ساتھ رکھ کر ملاحظہ کریں جو آپؑ نے کربلا کے راستے میں بیان فرمائے ہیں تو بخوبی معلوم ہوجائے گا

کہ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی پاک روح کسی بھی طاقت کے سامنے خم نہیں ہو سکتی تھی اور خوف نام کی کوئی چیز آپ کی روح میں موجود نہیں تھی۔

قرآن کریم نے دو چیزوں کو علمائے ربانی کی صفات میں سے شمار کیا ہے اور ہر دو کو بعنوان حصر Restriction ذکر کیا ہے۔

اِنَّمَا یَخشَی اللّٰہَ مِن عِبَادِہِ العُلَمَا (1)

لوگوں میں سے فقط علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

اَلّذِینَ یُبلّغُونَ رِسَالاَتِ اللّٰہ وَیَخشَونَہُ وَلاَیَخشُونَ اَحدَاًاِلاّاللّٰہَ (2)

وہ (حقیقی علماء) فقط خدا سے ڈرتے ہیں اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

یہ دونوں آیات سراسر درس توحید ہیں۔ البتہ علماء سے مراد فقط وہی افراد نہیں ہیں جو مکتب و مدرسے میں پڑھے ہیں بلکہ ان کے علاوہ وہ بھی مراد ہیں جو مکتب تو نہیں گئے لیکن ایک اشارے سے مطلب سمجھ جاتے ہیں۔

امام صادق علیہ السلام عالم حقیقی کی توصیف میں فرماتے ہیں۔

العالِمُ مَنُ یُصدّقَ فِعلُہُ قولَہ (3)

عالم اسے کہتے ہیں جس کا فعل اس کے قول کی تصدیق کرتا ہو۔ جو انسان کبھی غیر کی زبان سے اپنے آپ کو پہچانتا ہے اور غیر کی نگاہ سے اپنے آپ کو دیکھتا ہے ایسا انسان ہمیشہ اپنے باطن کے مشاہدے سے محروم رہتا ہے ،بلکہ ایسے شخص نے حقیقت میں اپنے آپ کو پہچانا ہی نہیں ہوتا۔جب اسے اپنی شناخت نہیں ہوتی تو کائنات کی پہچان بھی نہیں ہوتی چنانچہ اسے اپنے خدا کی پہچان بھی نہیں ہوتی۔

اور کبھی انسان اپنے آپ کو کسی پردے یا واسطے اور عینک کے بغیر دیکھتا ہے ،چونکہ اس طرح سے اسے اپنی شناخت ہو جاتی ہے لہذا کائنات کو بھی پہچان سکتا ہے اور اپنے خدا کی معرفت بھی اسے حاصل ہو جاتی ہے۔

جو شخص اس طرح سے استدلال کے ذریعے خدا کو ثابت کرتا کہ "میں نہیں تھا اور اب میں موجود ہوں پس کوئی ایسی ذات ہونی چاہئے جس نے مجھے پیدا کیا ہے" تو اس نے حقیقت میں استدلال کے پردے میں اپنے آپ کو دیکھا ہے وہ دلیل پیش کرتا ہے کہ چونکہ میں حادث Creatable ہوں لہذا ایک قدیم علت فاعلی Eternal Cause کا محتاج ہوں یا برھان پیش کرتا ہے کہ چونکہ میں منظم Organised ہوں لہذا ایک ناظم کا نیاز مند ہوں یا برھان حرکت Demonistration of Movement پیش کرتا ہے کہ چونکہ میں حرکت کرتا ہوں پس ایک محرک کا محتاج ہوں یا برھان امکان

Demonstration of Possibility لاتا ہے کہ چونکہ میں ممکن الوجود

Possible Existent ہوں لہذا ایک واجب الوجود Necessary Exis-tent کا محتاج ہوں یا پھر امکان وجودی Existential Possibility کو واسطہ قرار دے کر اپنے بارے میں علم حصولی Emprical Knowledge پیدا کرتا ہے تو یہ سب طریقے دراصل اپنے آپ کو دوسروں کی زبان سے پہچاننے کے برابر ہیں۔ چونکہ اس قسم کی شناخت میں تصور Conception، تصدیق Acknowledgement اندیشہ وفکر Thaught کا دخل ہے اور اس قسم کی شناخت علم حصولی اور مفاہیم ذھنیہ کے باب سے ہے لہذا انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ افکار اور ذھنی صورتیں میری حقیقت Reality نہیں ہے بلکہ یہ سب میرے علاوہ کچھ اور چیزیں ہیں اگر میں ان کی جانب اشارہ کرنا چاہوں تو لفظ "وہ" کے ذریعے کروں گا نہ کہ کلمہ "میں" کے ذریعے۔

ممکن ہے انسان اپنے بارے میں اس قسم کی شناخت رکھتے ہوئے بھی اپنے آپ کو فراموش کردے اور خود کو گم کر بیٹھا ہو۔ قرآن مجید نے بھی بعض لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ اپنی حقیقی خودی کو بھول چکے ہیں اور اس کے بجائے ایک کاذب خودی اختیار کرکے اسی کی فکر میں ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنسٰهُم اَنفُسَهُم (4)

ان لوگوں کی طرح نہ بن جاؤ جنہوں نے خدا کو فراموش کر دیا ہے جس کے نتیجے میں اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا ہے۔

خداوند تعالی نے ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اپنی فکر میں ہیں یعنی جب جہاد و محاذ جنگ کی بات ہو تو انہیں فقط اپنی فکر لاحق ہوتی ہے چنانچہ قرآن مجید کا فرمان ہے۔

اهمّتهم اَنفُسُهُم یَظنّونَ بِاللّٰهِ غیرَ الحقّ ظَنّ الجاهِلیتہِ (5)

انہیں فقط اپنی پڑی رہتی ہے یہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق جاہلیت کا گمان رکھتے ہیں۔سوال یہ ہے کہ وہ کونسی خودی ہے کہ بزدل انسان جسے فراموش کر چکا ہے ؟ اور وہ کونسی خودی ہے کہ بزدل آدمی ہمیشہ جس کی فکر میں رہتا ہے۔

بنابریں قرآن مجید نے ایک حصر Restriction کے ذریعے فرمایا کہ خدا کے بندوں میں فقط علماء خدا سے ڈرتے ہیں اور دوسرے حصر Restriction میں فرمایا ہے کہ علماء فقط خدا سے ڈرتے ہیں

اِنّماَ یَخشَی اللّٰهَ من عِبادِهِ العُلَمَاءُ (6) خدا کے بندوں میں فقط علماء ہی خدا سے ڈرتے ہیں۔

اَلّذینَ یُبلّغُونَ رِسالاَتِ اللّٰه وَیَخشَونَهُ وَلاَیَخشُونَ اَحداًاِلاّاللّٰهَ (7)

جو خدا کا پیغام پہنچاتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں وہ خدا کے علاوہ کسی اور سے نہیں ڈرتے۔

انبیاء اور مرسلین ایسے ہی ہیں چنانچہ انبیاء کے شاگرد علماء الہی بھی ایسے ہی ہیں۔

بلکہ خوف خدا ہی تنہا وہ نعمت ہے جو عرفان کو شجاعت کے ساتھ یکجا کر سکتی ہے۔

کیونکہ جو شخص خدا اور غیر خدا دونوں سے ڈرتا ہو وہ عارف کی مناجات تو رکھتا ہے

لیکن شوق بھرے مجاہدانہ حماسے اور شجاعت سے محروم ہوتا ہے اور وہ شخص جو کسی سے بھی نہیں ڈرتا حتیٰ خدا سے بھی ، تو وہ تہورانہ انداز میں لڑتا ہے چنانچہ امام حسین علیہ السلام کے بالمقابل لوگوں میں کچھ ایسے بھی تھے لیکن یہ ایک مذموم شجاعت ہے۔ لہذا جو خدا سے ڈرتا ہے لیکن غیر خدا سے نہیں ڈرتا فقط وہی شجاعت و عرفان کو یکجا کر سکتا ہے۔ وہ جو خدا سے ڈرتا ہے بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے۔

اِلٰهِی ..... اَلوَیلُ لِی ثُمّ الوَیلُ لِی اِن کَانَ الجَحِیمُ مَوئِلِی

ہلاکت ہو میرے لئے اگر جہنم میرا ٹھکانہ بنے۔

دوسری طرف چونکہ غیر خدا سے نہیں ڈرتا لہذا ستم گروں کو للکارتا ہے چنانچہ شام کے اندر اگرچہ امام سجاد علیہ السلام کی گردن مبارک پر طوق و زنجیر پڑے ہوئے تھے اور اسی حالت میں آپ نے کئی منزلیں بھی طے کی تھیں لیکن جب آپ کی زبان مطہر گویا ہوئی تو آپ نے اموی ستم گروں کو للکارا جبکہ امام سجاد علیہ السلام سے ہی مختلف عارفانہ مناجات بھی منقول ہیں۔

امام زین العابدین علیہ السلام کی شجاعت دیگر ائمہؑ سے ہرگز کم تر نہیں ہے۔ چنانچہ اگر آپؑ کو بھی اذن مل جاتا تو دوسروں کے ہم پلہ ہوتے۔

قرآن مجید کے ان دو حصریہ جملوں Restrictiue Sentences نے در حقیقت دو فضیلتوں کو ہم کنار کر دیا ہے یعنی آہ و زاری کرنا اور جہاد و مبارزہ کرنا۔ آہ وزاری خدا سے ڈرنے کی وجہ سے اور جہاد و مبارزہ غیر خدا سے نہ ڈرنے کی وجہ سے اور یہ عین توحید ہے چونکہ ایک موحد انسان خوف کھانے اور ڈرنے میں بھی موحد ہوتا ہے جیسا کہ اعتقاد میں اور امید رکھنے میں بھی موحد ہوتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ خدا ہے ، لیکن ... یعنی خدا کے بعد لیکن ، البتہ وغیرہ نہیں کہتا انبیاء کرامؑ سب کے سب اسی طرح تھے قرآن کریم نے انبیاء علیہم السلام سے جو مناجات ذکر کی ہیں وہ بھی ایسے ہی ہیں۔

اور جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے انسان کبھی خداوند تعالیٰ پرامن بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے اور اس قدر خدا سے مانوس ہو جاتا ہے کہ اس ذات مقدس سے "ناز" کرنے لگتا ہے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کرتا ہے کہ اے پروردگار! تونے اگر مجھے میرے گناہ پر پکڑا کہ میں نے گناہ کیوں کیا ہے تو میں تجھے تیری عفوو بخشش پر پکڑوں گا کہ اے خدا تونے مجھے بخشا کیوں نہیں۔

الٰہی اِن اَخَذتَنی بِجرمِی اَخَذتُکَ بِعَفوِکَ (9)

البتہ اس قسم کا "ناز" ہر ایک کی زبان سے نہیں سنا جائے گا اور مناجات میں وصف "مدلاً علیک" فقط بعض خاص اہل مناجات کے لئے ذکر ہوا ہے ورنہ عام لوگ جو اہل دعا ہیں وہ اس مقام پر پہنچنے سے بہت ڈرتے ہیں البتہ کبھی انسان ایسے مقام پر بھی جا پہنچتا ہے کہ خداوند تعالیٰ اس سے مناجات کرتا ہے چونکہ پہلے مناجات انسان کی جانب سے ہیں اور بعد میں خداوند تعالیٰ کی طرف سے۔ جیسا کہ محبت پہلے انسان کی طرف سے ہوتی ہے بعد میں خدا کی جانب سے۔

چنانچہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

عِبادُ نَاجَاهُم فِی فِکرِ هِم وَ کَلمَهُم فِی ذاَتِ عُقُولِهِم (10)

ایسے بندے جن کی فکروں میں خدا سرگوشیاں (نجویٰ) کرتا ہے اور ان کی عقلوں میں خدا ان سے کلام کرتا ہے۔

پس یہ لوگ ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں کہ خدا ان سے مناجات (سرگوشی) کرتا ہے ان کے نہاں خانہ اسرار میں ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ چونکہ کبھی انسان کا دل مسجد اور حرم بن جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ اس میں مناجات کرتا ہے جبکہ یہی دل کبھی خواہشات کے لئے میدان رقص بن جاتا ہے۔ چنانچہ علی علیہ السلام فرماتے ہیں

وَلَهُنَّ رَقص عَلٰی سُوَیداَ قَلبِهِ (11)

خواہشات بعض افراد کے دل کی گہرائیوں میں رقص کناں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ

بعض افراد کا دل رقص کا میدان اور خواہشات کے ناچنے کی جگہ بن جاتا ہے جبکہ بے چارہ صاحب دل بے خبر ہوتا ہے غلط تصورات' بیہودہ خیالات' لالچ ، بہتر اور زیادہ مال بٹورنے جیسی لمبی آرزوئیں انسان کے دل کی گہرائیوں اور دل کے نہاں خانے میں محور قص ہیں جب کہ یہ بے چارہ خود اس سے بے خبر ہے۔

اور دوسری جانب یہ دل اس مقام پر بھی جا پہنچتا ہے کہ خداوند تعالی اس سے مناجات کرتا ہے۔ خوف وامید توحید کی علامت ہے۔ ایک موحد انسان کی تمام امیدوں کا سہارا فقط ذات خداوند ہوتی ہے اس کے سوا کوئی اور سہارا نہیں ہوتا اس کے نزدیک خدا کے سوا سب فیض خدا کا واسطہ ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے۔

مَن لَم یَشکرِ المَخلُوقَ لَم یَشکُرِ الخَالِقَ (12)

جو مخلوق کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا۔

اس حدیث شریف میں حکم کو ایک وصف کے ساتھ مشروط قرار دیا گیا ہے جو اس وصف کے لئے مذکورہ حکم کی علت ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ چونکہ اس میں یہ نہیں فرمایا کہ مثلاً زید و عمر و وغیرہ کا شکر کرو کہ جنہوں نے تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے بلکہ فرمایا ہے کہ مخلوق کا شکر کرو چونکہ مخلوق کی طرف سے اگر تمہیں کوئی خیر ملے تو جان لو کہ وہ خالق کی طرف سے ہے یعنی دراصل یہ خالق کا ہاتھ ہے جو مخلوق کی آستین سے باہر آیا ہے اور جس نے تمہیں خیر پہنچادی ہے یعنی حقیقت میں خالق کا شکریہ ادا کرو ، مخلوق کو مخلوق کے عنوان سے دیکھو نہ کہ زید و عمرو کے طور پر ،اور مخلوق پر خالق کا قاصد ہونے کے عنوان سے نگاہ کرو نہ یہ کہ خود مخلوق نے ہمارے ساتھ کوئی بھلائی کی ہے۔ چونکہ جو مخلوق کو مخلوق کے عنوان سے دیکھے گا گویا اس نے خالق کو دیکھا ہے۔

یہ دو خصلتیں خوف میں توحید کی علامت ہیں اور یہی دو صفتیں انسان میں عرفان و مناجات بھی پیدا کرتی ہیں اور شجاعت وحماسہ بھی۔

وہ جو خدا سے ڈرتے ہیں اور غیر خدا سے نہیں ڈرتے وہی جہاد و مبارزہ کرتے ہیں اور جو خدا اور غیر خدا دونوں سے ڈرتے ہیں وہ اہل جہاد نہیں ہیں چونکہ جنگ وہی کر سکتا ہے جس کی امید فقط خدا سے ہو اس کے سوا کسی سے کوئی امید نہ رکھتا ہو۔

ان دونوں صفتوں کی بنیاد اور اساس اول قرآن کریم میں ہے اس کے بعد کلمات معصومین علیہم السلام میں ہے خاص کر حضرت امام حسین بن علی علیہ السلام کے کلام مبارک میں۔

چنانچہ حضرت امام حسین علیہ السلام بارگاہ خدا میں عرض کرتے ہیں:

اِلٰہی مَن کَانَت حَقَائِقُہ دَعَاوِی فَکَیف لاَتَکُون دَعَاوِیہِ دَعَاوِی (13)

خدایا جس کے حقائق محض دعوے ہیں تو اس کے دعوے کیونکر محض دعوے نہ ہوں گے۔

اور جس کی خوبیاں بھی برائیاں ہیں تو اس کی برائیاں کیونکر برائیاں نہ ہوں گی۔

یعنی میرے پاس جو حقیقت ہے وہ بھی میری نہیں ہے خدایا میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اور اگر کچھ ہے تو وہ محدود ہونے کی بناء پر اتنا ناقص ہے کہ تیری ذات کے شایان شان نہیں ہے۔

حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی یہ مناجات نرم دلی کی علامت ہیں:

جبکہ دوسرے مقام پر آپؑ ہی نے فرمایا۔

اِلٰہی مَن کَانَت مَحَاسِنہ مَسَاوِی فَکَیفَ لاَتَکونُ مَسَاوِیہِ مَسَاوِیَ

خدایا جسکی اچھائیاں سب برائیاں ھیں اسکی برائیاں کیونکر برائیاں نہ ہوں گی۔

اِذَالَم یَکُن لِی فِی الدنیا مَلجَئًا، وَلاَ مَاوَیَ لَمَا

بَایعتُ یَزِید بنَ مُعَاوِیَۃَ (14)

اگر دنیا میں میرے لئے کوئی بھی پناگاہ اور کوئی بھی ٹھکانہ نہ رہے تو بھی میں یزید بن معاویہ کی بیعت نہیں کروں گا۔

ان دو جملوں کا آپس میں تقابل کیا جائے کہ باطل کے مقابلے میں ڈٹا ہوا اپنے دل میں ذرہ برابر نرمی نہ رکھنے والا یہ وہی انسان ہے جس کا دل خدا کے سامنے اتنا نرم ہے اور بارگاہ خدا میں وہ دلپذیر مناجات کرتا ہے۔

اس قسم کے مسائل میں جہاں پر ہم معرفت توحید پیدا کرتے ہیں اور ائمہ معصومین علیہم السلام کو پہچانتے ہیں وہاں پر اپنے مقصد و منزل کی طرف راستہ بھی تلاش کر سکتے ہیں ۔اس لئے کہ یہ مسائل حضرت امام حسین علیہ السلام کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں چونکہ معصومینؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ ہمارے مخصوص امتیازات میں سے ہیں۔ آپ یہ کام کرنے کے مجاز نہیں ہیں جیسا کہ امیر المومنین علیہ السلام نے فرمایا کہ جس طرح میں زندگی بسر کر رہا ہوں تمہارے لئے مقدور نہیں ہے میں اپنی خشک روٹی اس لئے چھپا کر رکھتا ہوں کہ کہیں میرے عزیز و اقارب اس پر روغن نہ لگا دیں لہذا ایسی جگہ چھپا کر رکھتا ہوں جہاں ان کا ہاتھ نہ پہنچے۔ لیکن یہ عمل اور یہ روش تمہارے لئے نہیں ہے اور نہ ہی تم ایسا کر سکتے ہو۔

کتاب الغارات کے مؤلف اپنے بعض مشائخ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا ۔میں بہت چھوٹا تھا اپنے والد کے ہمراہ کوفہ کی جامع مسجد میں گیا ، مسجد میں بہت بھیڑ تھی لہذا والد نے مجھے اپنے کندھوں پر بٹھالیا۔ میں نے دیکھا کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام خطبہ دیتے ہوئے اپنی آستین بھی ہلا رہے ہیں میں نے اپنے والد سے کہا کہ چونکہ بھیڑ زیادہ ہونے کی وجہ سے گرمی ہے اور علی بن ابی طالب کو اسی وجہ سے گرمی زیادہ محسوس ہو رہی ہے لہذا آستین کے ذریعے اپنے آپ کو ہوا دیکر ٹھنڈا کر رہے ہیں۔ والد نے مجھے جواب دیا کہ یوں نہیں ہے علیؑ کو نہ گرمی لگ رہی ہے اور نہ سردی بلکہ علی کے پاس فقط یہ ایک ہی قمیض

ہے اسے دھو کر خشک ہونے سے پہلے پہن لیا ہے چنانچہ اسے ہلا رہے ہیں تاکہ خشک ہو جائے۔

ہم اس واقعہ کے نقل کرنے پر بہت ہی شرمندہ ہیں چونکہ اس پر عمل نہیں کر رہے۔ ایسی طرز زندگی کے بارے میں علی علیہ السلام نے فرمایا کہ جو روش میری ہے تمہارے لئے مقدور نہیں ہے۔

دنیا کو علی علیہ السلام کی طرح کسی اور نے اتنا رسوا نہ کیا چنانچہ اگر دنیا ایک باشعور چیز ہوتی اور بات کرنے کی قابل ہوتی تو سب سے پہلا اعتراض علی علیہ السلام پر کرتی کیونکہ علیؑ نے دنیا کی ساری حیثیت خاک میں ملادی ہے۔ آپ نے دنیا کو کبھی کوڑھی کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی خنزیر کی آنتوں اور کبھی بکری کی چھینک اور کبھی دیگر پست چیزوں سے تشبیہ دی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ دنیا کا یہ زرق و برق کوڑھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خنزیر کی اس آنت کی مانند ہے جس سے کوئی بھی رغبت نہیں رکھتا۔ کبھی دنیا کو خطاب کر کے فرماتے ہیں کہ اگر میں تجھے دیکھ لوں تو تجھے کوڑے ماروں گا چنانچہ فرماتے ہیں:

وَاللّٰہِ لَوْکُنْتِ شَخْصاً مَرْئِیّاً وَ قَالِباً حِسِّیّاً لَاَقَمْتُ عَلَیْكِ حُدُوْدَاللّٰہِ (15)

خدا کی قسم تو اگر قابل رویت چیز ہوتی اور محسوس روپ میں ہوتی تو میں تجھ پر حدود خدا جاری کرتا۔ اور پھر امیر المومنین علیہ السلام ہمیں فرماتے ہیں کہ یہ روش تمہارے لئے مقدور نہیں ہے۔ البتہ یہ راہ رتبوں کے اختلاف کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طے کرنے کے قابل ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام بھی جب اپنے موقف کا اظہار فرماتے ہیں تو یوں نہیں کہتے کہ میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا بلکہ اکثر حساس مواقع پر فرماتے ہیں کہ مجھ جیسا یزید جیسے کی بیعت نہیں کر سکتا یعنی یہ واقعات انفرادی نہیں ہیں بلکہ پوری تاریخ میں میری طرح طرز تفکر رکھنے والا انسان یزید جیسے طرز تفکر رکھنے والے کی بیعت نہیں کر سکتا چنانچہ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

وَعَلَی الْاِسْلَامِ اَلسَّلَامُ اِذْ بُلِیَتِ الْاُمَّۃُ بِرَاعٍ مِثْلِ یَزِیْدَ (16)

جب امت یزید جیسے حکمرانوں میں مبتلا ہو جائے تو پھر اسلام پر فاتحہ پڑھ لینی چاہئے۔

امام علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام پر فاتحہ اس صورت میں پڑھ دی جائے گی جب امت یزید میں مبتلا ہو جائے بلکہ آپ نے فرمایا کہ اسلام پر سلام وداع کہہ دیں جب امت یزید جیسے حکمران میں مبتلا ہو جائے۔

چونکہ بحث انفرادی مسائل کے بارے میں نہیں ہے بلکہ ایک قاعدہ اور قانون کی گفتگو کی جارہی ہے جو ہمیشہ کے لئے جاری ہے کہ امت جب یزید جیسے حکمرانوں میں مبتلا ہو جائے تو اس قوم کے اندر سے دین کے اصول و فروع رخت سفر باندھ لیں گے اور حضرت امام حسین علیہ السلام نزدیک سے ان خطرات کو محسوس کر رہے تھے البتہ نہ علم غیب کے ذریعے بلکہ علم شہودی کے ذریعے جانتے تھے۔ کربلا کے راستے میں حضرت نے جو کچھ حالت خواب میں دیکھا وہ حالت نیند کی نہیں تھی کہ حضرت سوئے ہوئے تھے بلکہ سب کچھ بیداری میں دیکھا لیکن حضرت پر حالت منامیہ Slumbering Condition طاری تھی یعنی بیداری میں حالت منامی طاری تھی۔ اس کے باوجود آپؑ اپنے مقصد سے دستبردار نہیں ہوئے اور یہ توحید در خوف کا نتیجہ ہے۔ اب یہ سوال اٹھتا ہے کہ آپؑ نے شب عاشور بارگاہ خدا میں مناجات ودعاء اور وداع کرنے کے لئے مہلت کیوں مانگی تھی۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ موحدانہ عرفان تھا جو مذکورہ شجاعت کے ساتھ یکجا ہو گیا تھا۔

خداوند تعالیٰ جب کسی سے مناجات کرنا چاہے تو اس کے اندر ایک میلان پیدا کر دیتا ہے۔ تو جس طرح گناہ گاروں کی توبہ خداوند تعالیٰ کی جانب سے دو توبہ کے درمیان لپٹی ہوتی ہے اسی طرح سے نیک افراد کی مناجات بھی خداوند تعالیٰ کے دو افعال کے درمیان لپٹی ہوتی ہیں۔ چونکہ جو شخص توبہ کرتا ہے اور اس کی توبہ قبول بھی ہو جاتی ہے

اسے پہلے خدا کی طرف سے توبہ کی توفیق ملتی ہے جو پہلی توبہ ہے۔ اسی لئے خداوند تعالی تواب بھی ہے (تاب کا معنی رجوع کرنے کے ہیں اور تائب یعنی رجوع کرنے والا) لہذا جب رحمت خدا انسان کی طرف رجوع کرتی ہے تو اسے بیدار کر دیتی ہے۔ خدا کی طرف سے انسان کے لئے یہ پہلی توبہ ہے۔ دوسرے مرحلے میں بندے کی جانب سے توبہ ہے لیکن تیسرے مرحلے میں پھر خدا کی طرف سے توبہ ہے یعنی بندے کی توبہ کو قبول کرنا چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

الَم' یَعلَموُا اَنّ اللّٰه 'هَو 'یقبُل الُتو'بَه مَن' عبادِهِ (17)

کیا یہ نہیں جانتے کہ فقط خدا ہی اپنے بندوں سے توبہ قبول کرتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب خداوند تعالی کی رحمت انسان کی شامل حال ہوتی ہے تو انسان بیدار ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے سالکین الی اللہ کی پہلی منزل ''یقظہ'' بیداری ہے چونکہ غافل انسان جب بیدار ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ میں کہاں ہوں' کیا کر رہا تھا' مجھے کیا کرنا چاہئے' میں کہاں جا رہا ہوں' کیوں اپنے آپ کو بھول گیا ہوں۔ لہذا جب بیدار ہو کر خدا کی طرف پلٹتا ہے تو دوبارہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے رحمت اس کے شامل حال ہوتی ہے اور خداوند تعالیٰ اسے اپنی طرف بلا لیتا ہے اور یہ تیسری توبہ ہے۔

پس ہمیشہ بندے کی ایک توبہ خدا کی طرف سے دو توبہ کے درمیان لپٹی ہوتی ہے۔ یعنی انسان ہمیشہ خدا کی جانب سے دو رحمتوں کے درمیان گھرا ہوتا ہے۔

خداوند تعالیٰ کے صالح اور نیک بندوں کی مناجات بھی ایسی ہی ہیں۔ پہلے خدا بعض افراد کے دل میں اپنے ساتھ مناجات کی لذت ڈالتا ہے جس کے نتیجے میں ان لوگوں میں خدا کے ساتھ مناجات کا شوق پیدا ہو جاتا ہے اور جب مناجات میں مشغول ہو جاتے ہیں تو خداوند تعالی ان کی مناجات سننے لگتا ہے چونکہ وہ سمیع الدعاء ہے۔ دعا سننے اور کوئی اور بات سننے میں بہت فرق ہے۔

لہذا بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ خدا ہر بات سنتا ہے۔ غیبت کرنے والوں کی غیبت بھی سنتا ہے۔ گالیاں بکنے والوں کی گالیاں بھی سنتا ہے اور صالحین کی اچھی اچھی باتیں بھی سنتا ہے -ان اللہ بکل شئی سمیع کا یہی معنی ہے اور اس میں عمومیت پائی جاتی ہے- لیکن خداوند تعالیٰ کا سمیع الدعاء ہونا ایک جدا مطلب ہے۔ سمیع الدعاء ہونا یعنی دعا پر توجہ کرنا -لہذا بعض دعاؤں کے درمیان میں جب یہ کلمہ آتا ہے کہ انک سمیع الدعاء جو بجائے خود ایک دعاء ہے اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ تو سنتا ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ خدا ہماری دعاؤں پر توجہ دیتا ہے اور انہیں پورا کرتا ہے ورنہ فقط سن لینا تو عام باتوں سے تعلق رکھتا ہے-

لہذا جب ایک بندہ اور سالک خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں مناجات کرتا ہے تو خدا اس کی مناجات پر توجہ فرماتا ہے- سالک انسان کی مناجات بھی خداوند تعالیٰ کے طرف سے دو رحمتوں میں گھری ہوئی ہیں- ایسا انسان خدا کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرتا اور ذات خداوندی کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہے- حکومت کفر میں متولد نہ ہونے پر اگر خدا کا شکر ادا کرتا ہے تو ہر طرح کی حکومت کفر کا تختہ الٹنے کو اس نعمت کا شکرانہ سمجھتا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی اسی لئے انقلاب برپا کیا۔ چنانچہ جیسا کہ دعائے عرفہ کے آغاز میں خود بیان فرمایا ہے نہ فقط خود حکومت حق کے زیر سایہ رہے بلکہ دوسروں کے لئے بھی حکومت حق برپا کرنے کی کوشش کی۔ لہذا آپؑ نے فرمایا کہ ہم نے انقلاب اس لئے برپا کیا ہے تاکہ کفر کا خاتمہ کریں اور اس میں کامیاب بھی ہوئے:

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں:

اِنَّمَا خَرَجْتُ لِطَلَبِ الْاِصْلَاحِ فِیْ اُمَّۃِ جَدِّیْ مُحَمّد صلی اللہ علیه وآله وسلّم (18)

میں نے اپنے جد بزرگوار حضرت محمدؐ کی امت میں اصلاح کی غرض سے خروج کیا ہے- کوئے ولایت کے سالک تمام الٰہی انسان ایسے ہی ہوتے ہیں-

یہی وجہ ہے کہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ نے اپنے سیاسی اور الٰہی وصیت نامے میں بھی مناجات اور شرق و غرب کے تسلط کے خلاف احتجاج کو یکجا کر دیا ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کا مکتب بھی ہمیں انہی دو اصولوں کے تعلیم دیتا ہے۔

جو لوگ امام علیہ السلام کے لئے فقط روتے اور آنسو بہاتے ہیں ان کے مد نظر فقط مظلوم حسینؑ ، ہیں نہ کہ عارف ، مبارز اور مجاہد حسینؑ وہ امامؑ کو اپنے درمیان نہ پاکر فقط گریہ کرتے ہیں۔

پس آج بھی بعض ایسے افراد موجود ہیں جو اہل دفاع و جہاد نہیں ہیں لیکن حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے لئے احترام کے قائل ہیں۔ چونکہ امام عصرؑ ان کے درمیان موجود نہیں ہیں انہیں فقط حضرت حجتؑ کی غیبت سے لگاؤ ہے نہ کہ آپ کے انقلاب و جہاد سے جبکہ حالانکہ حضرت ولی عصرؑ جب قیام فرمائیں گے تو سب سے پہلا گروہ جو آپ کی مخالفت کرے گا انہی لوگوں کو ہوگا۔ بنابریں ہم حضرت سید الشہداء علیہ السلام کو ان کے عرفانی اور حماسی چہرے کی بناء پر مانیں اور اگر ہم میں یہ دو خاصیتیں یعنی شجاعت و عرفان پیدا ہو جائیں تو جان لیں کہ ہم حسینی ہیں۔

دعائیں پڑھتے ہوئے خیال رہے کہ اگر دعاؤں کا وہ حصہ زیادہ پسند ہے جس میں مغفرت و بخشش کا تذکرہ ہے تو جان لو کہ خدا سے خوف کھاتے ہو لیکن غیر خدا سے بھی ڈرتے ہو اور اگر دعاء کے دونوں حصوں میں برابر کی رغبت محسوس کریں تو خدا کا شکر کریں کہ ہم اپنے ائمہؑ کو دونوں پہلوؤں کے اعتبار سے پہچانتے ہیں۔ مثال کے طور پر دعاء میں اس قسم کے جملوں میں بھی تمایل محسوس ہونا چاہیئے کہ

اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَرْغَبُ اِلَيْكَ فِيْ دَوْلَةٍ كَرِيمهٍ تُعِزّ بِهَا الْاِسْلَامَ وَاَهْلَهُ وَ تُذِلّ بِهَا النِّفَاقَ وَاَهْلَهُ (19)

خدایا ہم تیری بارگاہ سے ایسی باکرامت اسلامی حکومت طلب کرتے ہیں جس کے ذریعے تو اسلام اور مسلمین کو عزت عطا فرمایئے اور اہل کفر و نفاق کو ذلت عطا فرمایئے۔

یعنی خدایا ہم حکومت اسلامی بر قرار کرنا چاہتے ہیں تا کہ اسلام غالب ہو اور منافقین ذلیل ہوں۔ البتہ اس کے لئے زحمت و مشقت کی ضرورت ہے۔

امام عصرؑ کے منتظر وہی لوگ ہیں جو اپنے آپ کو آمادہ رکھیں اگرچہ ایک تیر فراہم کر کے ہی سہی۔ چنانچہ امام صادق علیہ السلام فرماتے ہیں

لِيُعِدَّ اَحَدُكُمْ لِخُرُوجِ الْقَائِمِ وَلَوْ سَهْماً (20)

تم میں ہر ایک کو چاہئے کہ اپنے آپ کو حضرت قائمؑ کے ظہور کے لئے تیار کرے اگرچہ تیاری ایک عدد تیر فراہم کرنے کی حد تک ہی کیوں نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلح مومن اور تیر انداز انسان ہی حضرت ولی عصرؑ کا منتظر ہو سکتا ہے۔ جو شخص تیر اندازی اور جنگ سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو اس کا اپنے امام سے کوئی رابطہ نہیں ہے بلکہ ایسا انسان فقط امام عصرؑ کی غیبت سے دل لگائے ہوئے ہے اور آپؑ کے ظہور سے لاتعلق ہے۔ چونکہ حضرت حجتؑ، جب تشریف لائیں گے تو آپ کا پہلا اقدام ہی جنگ ہو گا۔ اولین قدم یہ ہو گا کہ آپ سخت اور کھردرا لباس پہنیں گے اور سادہ زندگی بسر کریں گے۔ پس امام عصرؑ کا منتظر جنگجو وہ ہے جو خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتا ہو یہ دو انحصاری صفتیں خداوند تعالی نے حقیقی علماء کو عطا فرمائی ہیں اور یہ دو صفات وہی ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا ہے ایک فقط علماء کا خدا سے ڈرنا اور دوسرے علماء کا فقط خدا سے ڈرنا۔

واقعہ کربلا سے تقریباً بیس سال پہلے حضرت امیر المومنین علیہ السلام جنگ صفین کے دوران جب سرزمین کربلا سے گزرے تو اپنے مرکب سے نیچے اتر آئے، مٹھی بھر خاک اٹھائی اور اسے سونگھا اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کی اور فرمایا یہی وہ جگہ ہے یہی وہ جگہ ہے۔ لوگوں نے عرض کی کونسی جگہ ہے آپؑ نے فرمایا عاشقوں کے گرنے کی یہی جگہ ہے، عشاق یہیں پر کٹیں گے اور یہ ان کی آرامگاہ ہے۔

اس مقدس کلمہ عشق کی تعلیم سب سے پہلے ہمارے ائمہ علیہم السلام نے ہمیں دی ہے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس سے صحیح استفادہ کرتے دوسروں نے بڑھ کر ہم سے پہلے

اس سے غلط استفادہ کیا ہے ورنہ روایات میں حقیقی عشق کی طرف بہت زیادہ رغبت دلائی گئی ہے مثلاً ذات مقدس خداوند تعالی سے عشق۔ عبادت الٰہی سے عشق۔ عشق عرفانی بھی یہی ہے۔ امیر علیہ السلام کے کلام مبارک میں جس عشق کا تذکرہ ہے وہ عشق حماسی ہے۔ پس روایات میں دو قسم کے عشق کا ذکر ہے ایک عشق عرفانی اور ایک عشق حماسی۔

پہلے عشق کے بارے میں جناب کلینی مرحوم نے کافی میں روایت نقل کی ہے۔جس میں امام علیہ السلام نے فرمایا۔

اَفضَلُ النّاسِ مَن عَشِقَ الْعِبَادَةِ فَعَانَقَهَا

(21)

سب سے بہترین انسان وہ ہے جو عبادت سے عشق کرتا ہو اور عبادت کو گلے لگاتا ہو اور دوسرے عشق کے بارے میں جنگ صفین کے دوران امیر علیہ السلام نے سرزمین کربلا سے گزرتے ہوئے فرمایا۔

یہ عاشقوں کے گرائے جانے کی جگہ ہے۔

یعنی جنگ کے مشتاق یہاں پر گریں گے۔

چنانچہ بیس ۲۰ سال بعد جب حضرت امام حسین علیہ السلام اسی سرزمین میں داخل ہوئے اور اس کا نام کربلا سنا تو فرمایا:

یہی وہ جگہ ہے جہاں ہمارے سوار اتریں گے۔ ہمارے مردوں کی قربان گاہ یہی ہے ۔ہمارا خون یہیں پر بہے گا اور ہمارے بچوں کی قربان گاہ یہی ہے۔

چنانچہ آپؑ نے حکم دیا کہ یہیں پر اترا جائے اور خیمے نصب کئے جائیں۔ چنانچہ درمیان میں بنی ہاشم کے خیمے اور اطراف میں اصحاب و انصار کے خیمے نصب کئے گئے۔

تیسری فصل

امام خمینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ کے الٰہی اور سیاسی وصیت نامے میں ہمیں بڑی طاقتوں کے خلاف جہاد کی دعوت کے ساتھ ساتھ دعائے عرفہ اور صحیفہ سجادیہ کی طرف بھی دعوت دی گئی ہے۔ کیونکہ آپ کی روح میں ہر طرح کے ظلم وستم کے خلاف احتجاج کے ساتھ ساتھ عرفان و معنویت کی روح بھی موجود تھی۔

اس نکتہ پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عارف اہل شجاعت ہو اور ایک شجاع اہل معرفت ہو۔ کیسے ممکن ہے کہ ایک روح لطیف و نرم بھی ہو اور اسی کے ساتھ معترض بھی۔ چونکہ اس وصیت نامے میں ہمیں معارف الٰہی کی طرف بھی دعوت دی گئی ہے اور بڑی طاقتوں کے مقابلے میں نہ جھکنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے لہذا یہ ملاحظہ کرنا چاہئے کہ ان دو خصلتوں میں کیسے ہم آہنگی پیدا کی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ وہ کونسا مکتب ہے جس میں لطافت روح کو ظلم وستم کے خلاف احتجاج و جہاد کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے؟

قرآن کریم کی آیات کریمہ میں اور ائمہ طاہرین علیہم السلام بالخصوص حضرت علی علیہ السلام کی علمی اور عملی سیرت میں ان دونوں کے درمیان مکمل ہم آہنگی قابل مشاہدہ ہے۔ لیکن یہاں ہم حضرت سید الشہداء علیہ السلام کی سیرت طیبہ میں ان دو خصلتوں کو اپنے وجود کے اندر پیدا کرنے اور ہم آہنگ کرنے کا طریقہ ملاحظہ کرتے ہیں۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے کسی ظالم کے سامنے نہ جھکنے اور کسی بھی ظلم پر راضی نہ ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے چونکہ اس بات کو سب نے تسلیم کیا ہے۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام کے خلاف اس وقت کی تمام طاقتیں یکجا ہو چکی تھیں۔ آپ نے تمام خطرات کو گلے

لگالیالیکن ان کے سامنے جھکنا قبول نہیں کیا۔ اگرچہ آپ کو یہ معلوم بھی تھا کہ یہ خطرہ آپ کی شہادت سے ٹل نہیں جائے گا بلکہ آپ کا خاندان گرامی بھی اسیر ہو جائے گا۔ آپ یہ بھی جانتے تھے کہ علیؑ کی گرامی قدر دختر بھی اسیر ہو جائیں گی۔ حجت وقت یعنی حضرت سجاد علیہ السلام کو گردن میں طوق وزنجیر ڈال کر قیدی بنالیا جائے گا۔ لیکن اس کے باوجود کہ آپ تمام خطرات کو پہلے سے ہی جان چکے تھے نہ آپ نے امویوں کی جابر اور ستم گر حکومت کو قبول کیا اور نہ ہی آپ کے خاندان کے کسی فرد نے اسے تسلیم کیا۔ امام حسین علیہ السلام کی یہ شجاعت کسی پر پوشیدہ نہیں ہے لیکن آپ کی ذات گرامی میں فقط یہ شجاعت ہی نہیں تھی بلکہ اس کے ساتھ مناجات و دعا کی خوگر روح بھی موجود تھی۔ ہم نے آپ کے حماسی اور شجاعانہ کلمات تو سنے ہیں لیکن عرفانی مناجات کی جانب بہت کم توجہ کی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم دعائے عرفہ سے بہت کم آشنا ہیں۔

امام حسین علیہ السلام دعائے عرفہ میں فرماتے ہیں:

وَاجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّیْ اَرَاکَ

خدایا مجھے اپنی ذات سے اسطرح خوفزدہ کردے کہ گویا میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔

پہلے بھی بیان ہو چکا ہے کہ توحید کی خاصیت یہ ہے کہ انسان خدا سے ڈرتا ہو اور خدا کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام ایسے ہی تھے۔ وہ خدا سے ڈرتے تھے اور خدا کے سوا کسی شے سے ہراساں نہیں تھے۔ انبیاء کے وارث یعنی علماء بھی اس طرح ہیں۔

لیکن جو لوگ خدا سے بھی ڈرتے ہیں اور اپنی عزت کے جانے سے بھی خائف ہیں وہ ہرگز کوئے نبوت ورسالت کے راہی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر کسی کو عزت حاصل ہے تو بہتر ہے کہ وہ دین کی راہ میں پیش کی جائے اور اگر کسی میں خون ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ مذہب کے لئے بہایا جائے۔ بلکہ جس کے پاس جو بھی متاع گرانقدر ہے وہ اسے دین پر قربان کردے۔ جس شخص کا کہنا یہ ہے کہ مجھے اپنی عزت کا خوف ہے تو دوسرے لفظوں میں وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں اپنا یہ سرمایہ دین کے لئے قربان کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ایسا

انسان خدا سے بھی ڈرتا ہے اور خلق خدا سے بھی ڈرتا ہے۔وہ خوف کے مسئلہ میں ثنوی اور مشرک ہے موحد یا توحید پرست نہیں ہے۔

بتوں کی دو قسمیں ہیں ایک محسوس بت اور دوسرے غیر محسوس اور نامرئی بت۔عارف نامدار محی الدین ابن عربی کہ جنہیں امام خمینی نے بھی بہت سراہا ہے اپنی معروف کتاب فتوحات مکیہ میں لکھتے ہیں کہ طول و عرض والے جسمانی بت یہی ہیں جو پتھر اور لکڑی سے بنائے جاتے ہیں جب کہ لطیف و نامرئی بت باطنی خواہشات ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

اَلطَفُ الاَوثَانِ اَلهَوىٰ وَاَكثَفُهَا اَلحِجَارَةُ (1)

لطیف ترین بت خواہشات اور دبیز ترین بت پتھر کے ہیں۔

دل کے صنم کدہ میں رکھا ہوا بت اس قدر لطیف اور ظریف ہوتا ہے کہ خود بت تراش ،بت فروش اور بت پرست کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی۔ بیرونی بت چونکہ پتھر کا بنا ہوا ایک مجسمہ ہوتا ہے لہذا سب اسے دیکھ سکتے ہیں لیکن اندرونی اور باطنی بت چونکہ حب جاہ ،ہوس پرستی اور خواہشات کی شکل میں ہوتا ہے لہذا بت پرست ،بت فروش اور بت تراش بھی اسے نہیں دیکھ پاتا۔

بیشتر مواقع پر ہم اپنی خواہشات کو خدا کے کھاتے میں شمار کرتے ہیں ،اپنی اندرونی خواہشات کو احکام شرعیہ میں محسوب کرتے ہیں اور اپنے آپ کو خدا کی جگہ لا کھڑا کرتے ہیں تب ہم اس آیت کریمہ کا مصداق بن جاتے ہیں جس میں خداوند تعالی کا ارشاد ہے:

اَفَرَاَيتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهُ هَوَاهُ (2)

کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا ہے جو اپنی خواہشات کو خدا مانتا ہے ؟

انسان خواہ بیرونی بت کا پجاری ہو یا اندرونی بت کا حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کی اس توبیخ کا مصداق ہے جس میں آپ نے فرمایا۔

اُفٍّ لَكُم وَلِمَا تَعبُدُونَ مِن دُونِ اللّٰهِ (3)

تف ہو تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر کہ خدا کو چھوڑ کر جن کی تم پرستش کرتے ہو۔

حضرت خلیلؑ حق کا کلام فقط لکڑی اور پتھر کے بنائے ہوئے بیرونی بتوں میں منحصر نہیں ہے بلکہ آپ نے فرمایا کہ تف ہو تم پر اور تمہارے ان تمام معبودوں پر جو خدا کے سوا تم نے اختیار کرر کھے ہیں۔ حضرت ابراہیم خلیلؑ کا یہ قول تمام ابراہیمی انبیاء کا قول ہے اور آج بھی زندہ و جاوید قول ہے پس اگر آج بھی کوئی شخص خوف ور جاء میں اہل توحید ہو تو یقیناً اعتقادی اور قلبی اعتبار سے بھی موحد ہو گا۔ یعنی ایسا شخص پہلے موحدانہ طور پر جہان اور خالق جہان کی معرفت پیدا کرتا ہے اور پھر موحدانہ انداز میں کسی چیز سے ڈرتا ہے یا کسی چیز سے دل لگا بیٹھتا ہے۔

خشیت و خوف موحدین کی صفت ہے۔ کبھی انسان ایک غائب خدا سے ڈرتا ہے اور کبھی ایک حاضر و ناظر اور شاہد خدا سے ڈرتا ہے۔ پس خوف ہمیشہ ایک جیسا نہیں ہوتا بلکہ باطنی اور اندرونی معرفت کی خصوصیت خوف میں بھی وہی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ اگر خدا کو اس طرح سے غائب مان لیں اور سوچیں کہ جس خدا سے ہم ڈرتے ہیں بعد میں اسے دیکھیں گے اس کی عدالت میں بھی بعد میں حاضر ہوں گے تو یہ ایک غائب خدا سے خوف ہے جبکہ غائب چیز سے خوف کچھ زیادہ موثر نہیں ہوتا۔ لیکن اگر خداوند تعالیٰ کو حاضر و ناظر مان لیں اور جان لیں کہ اس کی بارگاہ میں کھڑے ہیں اور یقین پیدا کر لیں کہ کل کو قاضی وہی ہو گا جو آج شاہد ہے اور یہ بھی جان لیں کہ خداوند تعالیٰ کی عدالت میں ہاتھ پاؤں اور فرشتوں کی شہادت کے علاوہ ذات خدا بھی شاہد ہے تو کہیں زیادہ بہتر اس کی اطاعت کریں گے اور اس حالت میں اگر خدا سے ڈریں تو یہ شاہد و حاضر خدا کا خوف ہو گا۔

علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں:

اِتَّقُوا الْمَعَاصِیَ فِی الْخَلَوَاتِ فَاِنَّ الشَّاهِدَ هُوَ الْحَاکِمَ (4)

چھپ کر خلوتوں میں گناہ کرنے سے ڈرو کیونکہ آج جو دیکھ رہا ہے وہی کل قاضی ہو گا۔ ایسے نہیں ہے کہ قاضی ایک شخص ہو گا اور شاہد کوئی اور بلکہ ہاتھ پاؤں اور فرشتوں

کے شہادت دینے کی ضرورت ہی نہیں ہو گی کیونکہ خود ذات حق تعالیٰ شاہد ہے جیسا کہ وہی قاضی بھی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی غیر کے شہادت دینے کی بھی ضرورت نہیں ہو گی بلکہ خود انسان شہادت دے گا۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان کے ہاتھ پاؤں قیامت میں شہادت دیں گے اس کی چند صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ انسان اپنی اسی معمولی شکل میں محشور ہو گا اس کے ہاتھ پاؤں انسانی ہوں گے البتہ یہ ہاتھ پاؤں بولنا شروع کر دیں گے اور انسان کے جرائم پر شہادت دیں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جو انسان درندہ صفت ہو گا وہ معاذاللہ ایک درندے کی شکل میں محشور ہو گا اس درندے حیوان کا پورا وجود اس کی درندگی پر شہادت دے گا۔ قرآن مجید نے بھی اسے یوں ہی بیان فرمایا ہے کہ ہاتھ پاؤں شہادت دیں گے جبکہ منہ بند ہو گا مثلاً "اگر کوئی شخص کتے کی شکل اختیار کرے تو اس کے ہاتھ پاؤں ہی اس کی درندگی پر شہادت دیں گے اگرچہ اس کا منہ بند ہو۔ بات نہ بھی کرے تو بھی اس کی زبان درندگی پر شاہد ہو گی۔ دیکھیے یہ کتاب خدا کس قدر لطیف ہے چنانچہ ارشاد ہے؛

اَلْیَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰی اَفْوَاهِہِمْ وَتُکَلِّمُنَا ایدیهم وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا کَانُوا یَکْذِبُوْنَ (5)

اس دن ہم ان کا منہ بند کر دیں گے ان کے ہاتھ بولیں گے اور پاؤں ان چیزوں کے متعلق شہادت دیں گے جو انہوں نے جھوٹ سے کہی ہیں۔

کتے کی زبان ہوتی ہے لیکن بولتا نہیں ہے لیکن یہی بے کلام زبان اس کی درندگی کی شاہد ہے۔ کتے کی درندگی کے متعلق قرآن مجید کا فرمان ہے۔

اَنْ تَحْمِلْ عَلَیْهِ یَلْهَثْ اوتَتْرُکه یَلْهَث (6)

اگر اس پر حملہ کرو تو بھی زبان نکالے اور اگر چھوڑ دو تو بھی زبان نکالے۔ کتا ہر حال میں درندہ ہوتا ہے اور اس طرح اپنی زبان کے ذریعے اپنی درندگی کی شہادت دیتا ہے۔ اگر کوئی شخص معاذاللہ کسی درندے کی صورت میں محشور ہوا تو اس کا سراپا وجود اس کی درندہ خوئی کی

شہادت دے گا۔ خود مجرم اپنے خلاف شہادت دے گا چنانچہ قرآن مجید میں اس کی تعبیر یوں آئی ہے:

شَهِدُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ (7)

وہ اپنے خلاف خود ہی شہادت دیں گے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ نہ فقط اپنے جرم کا اعتراف کریں گے بلکہ اس پر شہادت بھی دیں گے۔ چونکہ مجرم بعض اوقات اپنے جرم کو قبول کر لیتا ہے اس صورت میں کہا جاتا ہے کہ اس نے جرم کا اعتراف کر لیا ہے اور یہ شہادت کے علاوہ ہے جس کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے:

فَاعِتَرفُوا بِذَنبِهِم فَسُحقاً لِاَصحَابِ السَّعِير (8)

انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا لیکن محروم ہیں اہل جنہم خدا کی رحمت سے۔

نیز قرآن کریم میں فرمایا کہ مجرمین اپنے خلاف خود شہادت دیں گے:

شَهِدُوا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ

وہ اپنے خلاف خود ہی شہادت دیں گے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ انسان اپنے خلاف خود شہادت دے۔ اگر انسان کے اعضاء انسان کے خلاف شہادت دیں تو یہ کہنا درست ہوگا کہ انسان کے اعضاء اور جوارح اس کے خلاف شہادت دے رہے ہیں کیونکہ انسان کی روح گناہ گار ہوتی ہے اور اعضاء و جوارح روح کے علاوہ ہیں۔ غیر جب بھی کسی مجرم کے بارے میں کچھ کہے تو اسے شہادت کہا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ مجرم انسان کا خود اپنے خلاف شہادت دینا کس طرح قابل تصور ہے۔ البتہ یہ اس صورت میں ہے جب شہادت کا ترجمہ اقرار و اعتراف نہ کیا جائے۔

کسی بھی مجرم کی اپنے خلاف شہادت دینے کی ایک صورت یہ ہے کہ جب کوئی شخص درندہ خو ہو جائے تو وہ حقیقت میں درندے کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس حالت میں اس

کا وجود خود اس کی درندگی پر شاہد ہوتا ہے مثلاً" جب لالچی انسان قیامت میں چیونٹی کی شکل میں محشور ہوگا تو اس وقت اس کے اندام و اعضاء اس کے لالچی ہونے پر شہادت دیں گے اس کے حق میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ **شهد و اعلیٰ انفسهم۔**

اس قسم کی شہادتیں یقیناً ہوں گی اور اسکے ساتھ ساتھ خود ذات خداوند تعالیٰ بھی شاہد ہے۔لہذا اگر ہمیں یقین ہو جائے کہ ہمیشہ بارگاہ خدا میں حاضر ہیں تو یہی کوشش کرینگے کہ کبھی بھی گناہ نہ کریں یا کم از کم گناہ کبیرہ کے مرتکب نہ ہوں۔ کیونکہ جب ہم بڑے گناہوں کو ترک کریں گے تو ہمارے چھوٹے گناہ بھی بخش دیئے جائیں گے۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِنۡ تَجۡتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ نُكَفِّرۡ عَنۡكُمۡ سَيِّئَاتِكُمۡ (9)

اگر تم ان بڑے گناہوں سے اجتناب کرو جن سے تمہیں منع کیا گیا ہے تو تمہارے چھوٹے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

سالکین الی اللہ کی دلی آرزو یہ ہوتی ہے اور خدا سے بھی یہی مانگتے ہیں کہ خدایا ہمیں اتنی توفیق عطاء فرما کہ تیری اس طرح عبادت کریں گویا تجھے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایمان سے بھی بالاتر ایک مقام ہے جسے اصطلاح میں ''احسان'' کہتے ہیں گو جو شخص مقام احسان پر پہنچ گیا ہو وہ ابھی راستے میں ہی ہوتا ہے چونکہ مقام اتقان ابھی باقی ہے۔

مقام احسان اسے کہتے ہیں کہ انسان اللہ کی اس طرح سے عبادت کرے گویا اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ چنانچہ رسول اکرمؐ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا۔

اُعۡبُدِاللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهُ يَرَاكَ(10)

اللہ کی اس طرح سے عبادت کرو گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہ بھی دیکھ سکو تو وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

البتہ یہ کانَّ یا گویا کا لفظ اس شخص کے لئے ہے جو ابھی راستے میں ہو لیکن جب انسان مقام شہود کے اوج پر جا پہنچتا ہے تو پھر حروف تشبیہہ گویا' وغیرہ ساقط ہو جاتے ہیں اور حروف تحقیق (اِنَّ ' اَنَّ) شروع ہو جاتے ہیں۔ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں۔

مَا کُنتُ اَعبُدُ رَبّاً لَم اَرَہُ (11)

میں ایسے خدا کی عبادت کرنے والا نہیں ہوں جسے میں نے دیکھا نہ ہو۔

امام حسین علیہ السلام نے بھی دعائے عرفہ کے اوائل میں خداوند تعالیٰ سے مقام احسان طلب کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اجعَلنِی اَخشَاکَ کَاَنِّی اَرَاکَ

خدایا مجھے اپنی ذات سے اس طرح خوفزدہ کردے کہ گویا میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔

اور اسی نرم ولطیف روح سے وہ زندہ جاوید شجاعانہ کلام بھی ادا ہوا جس میں آپ نے فرمایا کہ اگر اس تمام زمین پر میرے لئے کوئی جگہ بھی نہ رہے تب بھی نہیں جھکوں گا۔

پس یہ ممکن ہے کہ ایک انسان عارف بھی ہو اور جنگجو بھی ہو۔ اس لئے کہ جو شخص کسی بھی ظلم کو قبول نہ کرے وہ بہت ہی قوی روح کا مالک ہوتا ہے اور جس کی روح قوی ہوتی ہے وہی اللہ کی بارگاہ میں راز و نیاز اور مناجات و عبودیت بھی کر سکتا ہے۔ اصولی طور پر اہل اللہ افراد ایک ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں اپنے اندر احساسِ خضوع پیدا کرتے ہیں اور اس احساس کے بعد ہی عزیز بنتے ہیں جناب کلینی رضوان اللہ تعالیٰ علیہ نے ایک روایت نقل کی ہے جس میں ائمہ معصومین علیہم السلام میں سے کسی سے پوچھا گیا کہ آپ کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ مقام امامت پر فائز ہو گئے ہیں تو امام علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: ''جب اپنے اندر خدا کی بارگاہ میں احساس خضوع و نرمی پانے لگتے ہیں اور اپنے اندر کسی قسم کی قدرت کا احساس نہیں کرتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی عنایات ہمارے شامل حال ہو گئی ہیں۔''

مقام احسان ائمہ معصومین علیہم السلام کے علاوہ دیگر افراد کے لئے بھی قابل دسترس

ہے اس مقام تک پہنچنے کا دروازہ بھی کھلا ہوا ہے اور بعض اس تک پہنچے بھی ہیں۔ یہ جاننے کے لئے کہ ابھی ہم راستے کے آغاز میں ہیں اور یہ گمان دور کرنے کے لئے کہ مقام احسان انتہائے سفر نہیں ہے ہمیں اس نکتے کی طرف توجہ کرنی چاہئے کہ ہم سب پر مقام عدالت حاصل کرنا واجب ہے لیکن جتنا بھی عدالت میں آگے بڑھیں ذمہ داری اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

ہر انسان کو عادل ہونا چاہئے۔ لیکن جتنی بھی انسان کی نگاہ میں وسعت ہو گی اتنی ہی عدالت اسے نصیب ہو گی۔ اگر اس کی نگاہ محدود ہو تو عدالت صغریٰ ملے گی اگر نگاہ متوسط ہو تو عدالت وسطیٰ عطا ہو گی اور اگر نگاہ بلند ہو تو عدالت کبریٰ نصیب ہو گی۔ پس ہم جتنا بھی آگے بڑھیں پہلے سے زیادہ اہم فریضہ ہم پر عائد ہو جائے گا۔ یوں نہیں ہے کہ عادل بن کر ہم نے تمام فرائض کو انجام دے دیا ہو اور تمام کمالات بھی حاصل کر لئے ہوں بلکہ کم از کم فریضہ یہ بنتا ہے کہ ہمیں عادل ہونا چاہئے۔ عادل ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہم پر واجب ہے اسے انجام دیں اور جو چیز حرام ہے اسے ترک کر دیں اور یہ ہماری کم از کم ذمہ داری بنتی ہے۔

اس مرحلے سے گزرنے کے بعد عدالت وسطیٰ ہمیں عطا ہو گی یعنی اپنے تصورات و غرائز کو معتدل بنانا یا اپنے میلانات اور سمجھنے اور کام کرنے کی قوتوں مین اعتدال برقرار کرنا ۔لہذا جو شخص اپنے تمام واجبات ادا کرتا ہو ممکن ہے اس کے اندر سخاوت و بخشش کی روح موجود نہ ہو تو وہ فقط عدالت صغریٰ کا مالک ہے جو عدالت کا پہلا مرتبہ ہے۔ ایسا انسان عدالت متوسطہ سے محروم ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شخص تمام حرام چیزوں سے اجتناب کرتا ہو لیکن اس کے اندر قناعت کا مادہ موجود نہ ہو اور جتنا زیادہ ہو سکے مال حلال طلب کرتا ہو تو ایسا شخص بھی عدالت وسطی پر فائز نہیں ہو سکتا۔

البتہ جو شخص اس نیت سے مال کماتا ہے تاکہ معاشرے میں لوگوں کی اقتصادی مشکلات کو حل کرے تو اس کا یہ عمل عبادت شمار ہو گا لیکن اگر اپنے تمام واجب حقوق کو ادا کرنے

کے باوجود حلال کے راستے فقط اپنی ثروت و دولت کو بڑھانا چاہتا ہے تو ایسا انسان عدالت صغریٰ میں رکا ہوا ہے عدالت وسطیٰ اسے ہر گز نصیب نہیں ہو گی۔ اسی طرح اگر کوئی شخص غریزی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اپنے آپ کو حلال کی کم از کم مقدار پر اعتدال میں نہیں لاتا بلکہ حلال میں بھی افراط اور اضافہ کرتا ہے تو ایسا انسان یقیناً عدالت وسطیٰ کا مرتبہ نہیں پاسکتا۔ بزدل انسان بھی عدالت وسطی کی سطح کا عادل نہیں ہوتا گو کہ عدالت صغری کی حد تک عادل ہو سکتا ہے۔

کبھی انسان ان تمام مراحل کو طے کر جاتا ہے' اس کی قوت فکر میں اعتدال آجاتا ہے اور وہ ایک تیز فہم انسان بن جاتا ہے جس کی وجہ سے اس کی قوت جاذبہ Attraction Power اور قوت دافعہ Polarization Power میں بھی اعتدال آجاتا ہے جس کے نتیجے میں وہ اہل سخاوت ، قناعت اور صاحب عفت و حیاء اور اہل جود و بخشش ہو جاتا ہے اور تمام کمالات اس میں جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسا انسان عدالت وسطی کی حد تک عادل ہوتا ہے اور حکمت عالیہ Supreme Philosophy کی رو سے مقام عدالت پر فائز ہے۔

ایک فیلسوف ایسے انسان کو عادل مانتا ہے جب کہ اول الذکر کو عادل نہیں مانتا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص بزدل ہے وہ علم فقہ کی نظر میں عادل ہو سکتا ہے لیکن علم فلسفہ میں عادل نہیں سمجھا جائے گا۔ اسی وجہ سے جو افراد اہل سخاوت نہیں ہیں ممکن ہے فقیہ انہیں عادل مانتا ہو لیکن حکیم و فیلسوف کے ہاں وہ عادل نہیں ہوں گے۔ کیونکہ حکمت و فلسفہ میں جس عدالت کا تذکرہ ہوتا ہے وہ فقط واجبات کو ادا کرنے اور محرمات سے اجتناب کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔ فلسفہ میں عدالت اپنے تمام اندرونی میلانات Internal Inclinations میں اعتدال قائم کرنے سے عبارت ہے۔ اسی وجہ سے حکیم کے نزدیک وہی لوگ عادل ہو سکتے ہیں جو اہل جود و سخاوت ہوں' عفیف و باحیا ہوں اور تیز فہم ہوں۔

لیکن ایسا انسان جو فیلسوف کے ہاں عادل سمجھا جاتا ہے ایک عارف کے نزدیک عادل

نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ عارف کی نگاہ فیلسوف کی نگاہ سے کہیں زیادہ وسیع ہوتی ہے اصولی طور پر ایک فیلسوف خاص قسم کے اسباب کے ذریعے سے اس کائنات پر نگاہ کرتا ہے جبکہ عارف اس جہان کو اس سے زیادہ وسیع نظر سے دیکھتا ہے۔ مثلاً" بشر کا انبیاء کی طرف نیاز مند ہونا اور انسانی معاشرے کا وحی کے بغیر باقی نہ رہ سکنا اسے عارف نے بھی چھیڑا ہے اور متکلم و حکیم نے بھی اس پر بحث کی ہے۔

حکیم کا کہنا ہے کہ ہمیں ایسے پیغمبروں کی ضرورت ہے جو انسانی معاشرے کی اصلاح کریں-جب کہ عارف کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں فقط پیامبر کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہمیں خلیفۃ اللہ چاہئے جو پورے جہان اور کائنات کی اصلاح کرے،جو ملائکہ کو تعلیم دے اور آسمان کا نظام چلا سکے بلکہ ہمیں تو ایسے شخص کی ضرورت ہے جو اسماء حسنیٰ الٰہی میں اعتدال پیدا کر سکے- چونکہ ہر اسم کی اپنی خاص حکومت ہے اور اسی وجہ سے اسماء کے درمیان تزاحم (ٹکراؤ) پیش آتا ہے لہذا ایک ایسے انسان کامل کی ضرورت ہے جو اسم اعظم کا مظہر ہو اور تمام اسماء الٰہی میں اعتدال پیدا کرے حتیٰ کہ فرشتوں میں بھی اعتدال برقرار کرے۔ عارف،انسان کامل کو خلیفۃ اللہ کے عنوان سے پہچانتا ہے جب کہ حکیم پیامبر اور رسول کے طور پر اور متکلم تو حکیم سے بہت نیچے آ کر انسان کامل کو ایک صاحب شریعت کی حد تک مانتا ہے جس کا کام انسانی معاشرے کی اصلاح کرنا ہے۔

چونکہ انسان کامل کے لئے جس ذمہ داری کا عارف قائل ہے وہ بہت ہی عظیم ذمہ داری ہے اور اس سے کہیں بڑھ کر ہے جس کے حکیم یا متکلم قائل ہیں اسی وجہ سے انسان کامل کے لئے جو شرائط و اوصاف عارف ذکر کرتا ہے وہ بھی ان شرائط و اوصاف سے بڑھ کر ہیں جو حکیم یا متکلم اس کے لئے بیان کرتے ہیں۔

حکیم کے نزدیک نبی وہ انسان ہوتا ہے جو عادل ہو اور اس کی فکری اور عملی قوتیں نقطہ اعتدال پر ہوں۔ چونکہ حکیم کے نزدیک عصمت عدالت کبریٰ کے ہم پلہ ہے۔ البتہ عدالت سے ذرا کامل تر درجہ پر ہے- لیکن عارف کے نزدیک جو شخص تمام اسماء الٰہی کی

معرفت حاصل کرلے اور ملائکہ کو بھی اپنے مخصوص اور مقدس فرائض پر منصوب کر سکے وہی شخص عدالت کے مرکزی نقطے پر فائز ہوتا ہے اور ایسا انسان ہی خلیفۃ اللہ بن سکتا ہے۔ پس عارف کی بات خلافت الہیہ کے بارے میں ہے نہ کہ فقط انسانی معاشرے کی اصلاح کے بارے میں اور چونکہ عارف کی نظر اتنی بلند ہے اس وجہ سے پیامبر کی صفات و شرائط بھی اس کے نزدیک ان اوصاف سے کہیں زیادہ اہم ہیں جو حکمت و فلسفہ میں ہیں چہ جائیکہ فقہ میں جو شرائط مذکور ہیں۔

خلافت انسان کامل ہی کا کام ہے۔ انسان اپنے پاس موجود امور میں خلیفہ حق ہو سکتا ہے اور اس کا بہترین نمونہ رہبری و قیادت کا مسئلہ ہے۔ انسانی معاشرے کی قیادت و رہبری ایک ایسا سکہ ہے جس کے دو چہرے ہیں اور ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ رہبری کے ان دو چہروں کو ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے کیسے بیان کیا ہے اور ان کی تعلیمات اور سیرت کی پیروی کرتے ہوئے امام خمینی نے اسے کس طرح بیان کیا ہے۔

قیادت کا ایک چہرہ نورانی رہبری اور خلافت الٰہیہ کی صورت میں ہے اور دوسرا چہرہ ظلمانی اور (ہڈیوں) بکری کی چھینک اور خنزیر کی ان انتڑیوں اور سور کی ہڈیوں کی مانند ہے جو کوڑھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوی ہوں -اگر حاکم ایک ستم گر انسان ہو تو اس کی حکومت کوڑھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خنزیر کی انتڑیوں کے مانند ہے- اور اگر رہبر برحق اور عادل ہو، ظلم و ستم کے خلاف ہو اور خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں خاضع ہو تو خلیفہ حق ہوگا اور یہ بہت عظیم فرق ہے-

وہ مطلب جو حدیث شریف میں بیان ہوا ہے کہ صراط مستقیم بال سے زیادہ باریک اور شمشیر سے زیادہ تیز ہے اور اس سے مراد بھی یہی ہے کہ وہ لوگ جو غور و خوض کرنے والے اور موشگاف ہوتے ہیں ان کے بارے میں کہا جاتا ہے۔ **شققوا الشعر** (انہوں نے بال کی کھال اتاری) شعور ایک صفت ہے کہ جس کے ذریعے باریک اور دقیق مطلب میں موشگافی کی جاتی ہے اور اس کی مدد سے اسے درک کیا جاتا ہے- پس معلوم ہوا کہ صراط

مستقیم کو درک کرنے کے لئے بھی ایک قوی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔اسے سمجھ لینے کے بعد اس پر عمل کرنا شمشیر کی تیز دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ لہذا صراط مستقیم چونکہ بال سے باریک ہے اس کا سمجھنا دشوار ہے اور چونکہ شمشیر سے زیادہ تیز ہے اس پر چلنا بھی مشکل ہے۔

ائمہ ھدیٰ علیہم السلام نہ فقط اس راہ پر چلنے والے راہی تھے بلکہ خود عین راہ ہو گئے یہ فقط باب اتحاد عاقل و معقول Union of The Intelligent and Intelligible ہی نہیں بلکہ سالک و مسلک کے اتحاد Union of Disciple and Path کے باب سے ہے چونکہ اس باب میں ایسا نہیں ہے کہ ایک راہی ہے جو راستہ طے کر رہا ہے بلکہ راہی عین راہ ہے اور یوں نہیں کہ عامل اپنا عمل کسی ترازو پر تولتا ہے بلکہ خود عین ترازو بن جاتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے بارے میں جو کہا جاتا ہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا مِیزَانَ الْأَعْمَالِ

تو اس سے مراد بھی یہی ہے۔ آپؑ نے اپنے اعمال کو اس قدر حق کی ترازو کے ساتھ پرکھا حتیٰ کہ خود عین ترازو بن گئے اور اس قدر صراط مستقیم پر چلے کہ خود عین صراط مستقیم بن گئے اسی وجہ سے علی علیہ السلام کی منزلت و مرتبہ کو سمجھنا کوئی آسان کام نہیں ہے یہی چیز سبب بنی ہے کہ بعض لوگ علی علیہ السلام کے بارے میں ایسی گمراہی میں جا پڑے کہ معاذاللہ آپ کی تکفیر کر دی اور دوسری طرف ایک گروہ آپ کی الوہیت کا عقیدہ بنا کر تباہ ہو گیا۔ یہ نکتہ سمجھ لینا کہ علیؑ خلیفۃ اللہ اور انسان کامل ہیں، نہ خدا ہیں اور نہ ہی اوثان کی عبادت کرنے والے، بہت دشوار کام ہے۔ ایسے ہی یہ تشخیص دینا بھی بہت مشکل بات ہے کہ جو مقام انسان کو نصیب ہوا ہے یہ سکے کا کونسا چہرہ ہے آیا خلافۃ اللہی والا چہرہ ہے یا کوڑھی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی خنزیر کی ہڈیوں والا چہرہ ہے۔

رہبری اور خلافت کا سب سے اعلیٰ مرتبہ وہی ہے جو ائمہ ھدیٰ علیہم السلام کو حاصل تھا

اور ان کی پیروی اور جانشینی میں قیادت کا ادنیٰ مرتبہ امام خمینی رضوان اللہ علیہ کو نصیب ہوا اور اس سے بھی نچلے مرتبے وہ ہیں جو سربراہوں کو یا ہم سب کو حاصل ہیں چونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ

كُلّكُمْ رَاعٍ وَ كُلّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيّتِهِ (14)

تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

پس ہم میں سے بھی ہر ایک کی ایک ذمہ داری بنتی ہے اور اگر اسے صحیح طور پر پہچان لیں اور اس پر پورا اتریں تو اس سکے کا وہ اشرف و اعلی چہرہ ہمارا نصیب ہو سکتا ہے لیکن اگر اس مقام کو نہ پہچان سکے اور اپنی ذمہ داری بھی صحیح طور پر نہ نبھا سکے تو پھر اس سکے کا وہ پست و حقیر چہرہ ہمیں اپنے دام میں پھنسا لے گا اور چونکہ یہ کام بہت ہی سخت اور دشوار ہے اس لئے اس کی شرائط بھی زیادہ سخت ہیں۔

امام خمینی مرجعیت کی شرائط ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ مرجع کے لئے عصمت کے قریب قریب کی عدالت شرط ہے۔ ایسی عدالت جو معصومین کے کم از کم درجہ عدالت کے قریب تر ہو، نہ کہ ان کے سب سے اعلی مرتبہ عدالت کے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرجعیت ایک نہایت ہی دشوار کام ہے جس کی بناء پر اس کی شرائط بھی زیادہ سخت ہیں چونکہ اس کے ایک طرف بہشت اور دوسری طرف جہنم ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام چونکہ میدان شجاعت و عرفان کے پیشوا ہیں اور دونوں کو آپس میں ہم آہنگ کرنے والے ہیں اس لئے دعائے عرفہ میں بھی اللہ تعالیٰ سے یہی طلب کرتے ہیں کہ خدایا مجھے اس طرح سے تربیت فرما کہ فقط تجھ سے ڈروں اور تیرے علاوہ کسی سے نہ ڈروں اور تیری ذات سے بھی احسان کی حد تک خوف ہو کہ گویا تجھے دیکھ رہا ہوں۔اگر انسان خدا کو دیکھ کر ڈرے تو یہ شاہدانہ خوف ہے اور اگر ہماری طرح خدا کو دیکھے بغیر ڈرا جائے تو یہ خوف غائبانہ ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خدا سے اس کے جہنم کی وجہ سے ڈرتے ہیں

نہ کہ خود اس کی ذات سے لہذا اگر خدا ہمیں جہنم میں نہ ڈالے تو شاید ہم ڈریں بھی نہیں پس یہ خوف خدا غائبانہ طور پر ہے۔

عظیم الشان فیلسوف اور حکیم الٰہی جناب بو علی سینا نے جو کہا ہے کہ جو لوگ خدا کو واسطہ سمجھتے ہیں گو کہ انہیں اللہ کی رحمت و عنایت نصیب ہو جاتی ہے لیکن وہ صحیح راستے سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ ایسے افراد فقط ناقص لذت سے آشنا ہیں اور لذت کامل سے غافل ہیں لہذا القاء اللہ ان کا مطمع نظر نہیں ہوتا بلکہ خدا سے غیر خدا کو طلب کرتے ہیں۔ ہم لوگ خدا کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ مبادا وہ ہمیں جہنم میں نہ ڈال دے ورنہ اگر خدا ہمیں دوزخ میں نہ ڈالے تو شاید اس کی عبادت بھی نہ کریں۔ یا پھر خدا کی عبادت اس لئے کرتے ہیں کہ ہمیں جنت عطا کر دے اور اگر ہمیں بہشت میں نہ بھیجے تو شاید اس کی عبادت بھی نہ کریں اس قسم کی عبادت کا کوئی فائدہ نہیں ہے چونکہ یہ غائب سے ڈرنا ہے لیکن اگر ہم خدا کو دیکھ لیں کہ وہ ذات سراسر جمال و لطف ہے تو پھر فقط اسی کو طلب کریں گے اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ ہمیں جہنم سے بھی بچا لے گا اور بہشت بھی عطا کر دے گا چونکہ یہ غیر ممکن ہے کہ کوئی اس کی عبادت کرے اور وہ اسے جہنم میں ڈال دے یا بہشت عطا نہ کرے تو کیا بہتر کہ ہم اسی کو طلب کریں نہ بہشت کو اور خود اس سے ڈریں عقلانی خوف کے طور پر نہ کہ جہنم سے نفسانی خوف کی بنا پر۔

خداوند تعالیٰ نے جب درمیانی درجے کے لوگوں سے خطاب کیا ہے تو یوں فرمایا ہے:

فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِيْنَ (15)

اس آگ سے بچو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں اور جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

لیکن جب نرم دل والوں سے خطاب کیا تو فرمایا:

وَ اِیَّایَ فَارْهَبُونَ (16) اور مجھ سے ڈرو۔

یعنی جہنم سے کیوں ڈرتے ہو اگر ڈرنا ہی ہے تو مجھ سے ڈرو نہ کہ جہنم سے۔ اگر راہب بننا ہی ہے تو میرے راہب بنو نہ کہ میری جہنم کے۔ کلمہ ''ایای'' کو پہلے ذکر کرنا حصر کا

فائدہ دیتا ہے یعنی یہ بہتر ہے کہ تم راہب ہو اور رہبانیت اختیار کرو لیکن یہ رہبانیت میدان حماسہ و جنگ میں اختیار کرو۔ امام حسین علیہ السلام بھی میدان جنگ میں یہی بات بیان فرما رہے ہیں:

وَاجْعَلْنِیْ اَخْشَاکَ کَاَنِّی اَرَاکَ

خداوندا مجھے اپنی ذات سے اس طرح خائف قرار دے کہ گویا میں تجھے دیکھ رہا ہوں۔

کانّ اور گویا کا لفظ اس وقت تک رہا جب تک حضرت گھوڑے کی زین سے زمین پر تشریف نہیں لے آئے لیکن جب زمین پر تشریف لائے تو پھر **کانَّ** کے بجائے **اِنَّ** اور تشبیہ کے بجائے تحقیق کی بات ہونے لگی اور فرمایا۔

اِلٰہِی رِضاً بِقَضَائِکَ تَسْلِیْماً لِاَمْرِکَ، لَا مَعْبُوْدَ سِوٰیکَ (17)

خدایا تیری قضاء پر راضی اور تیرے امر کے سامنے تسلیم ہوں تیرے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

یعنی اے خدا میں فقط تجھ سے ڈرتا ہوں میں نے اپنے تمام امور فقط تجھے سونپ دیئے ہیں۔ اور جب آپؑ وقت آخر اپنے عزیزوں سے وداع ہو رہے تھے تو اس وقت بھی یہی فرمایا کہ آپ سب کو اللہ کے سپرد کر کے جا رہا ہوں یوں نہیں کہا کہ گویا اللہ کے سپرد کر رہا ہوں۔

جناب ہاجرہ نے جب اس بے آب و گیاہ صحرا میں اپنے شیر خوار بچے کے ہمراہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام سے کہا:

یَا اِبْرَاھِیْمُ لِمَ تَدَعُنَافِیْ مَوْضِعٍ لَیْسَ بِہِ اَنِیْسُ وَلَا مَاءٌ وَلَا زَرْعٌ (18)

اے ابرہیم ہمیں ایسی جگہ پر کیوں چھوڑے جا رہے ہو جہاں پر کوئی مونس ہے نہ پانی اور نہ ہی کوئی زراعت ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

اَللّٰهُ الَّذِیْ اَمَرَنِیْ اَنْ اَضَعَکُمْ فِیْ هٰذَا الْمَکَانِ حَاضِرٌ عَلَیْکُمْ

مجھے اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ تم کو اس مکان میں لا چھوڑوں اور وہ تمہارے اوپر حاضر ہے۔

آپؑ نے بھی یہ نہیں فرمایا کہ گویا تم کو یہاں اللہ کے سپرد کر کے جارہا ہوں۔

یہ ساری باتیں وہ حضرات بہتر طور پر سمجھتے ہیں جنہیں باطل کے خلاف حق کے محاذ جنگ پر خصوصاً" اگلے مورچوں میں جانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے چونکہ وہاں پر حماسہ و شجاعت عرفان کے ساتھ ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امام خمینی کے سیاسی والٰہی وصیت نامے میں جہاں پر ہمیں شرق و غرب کی بڑی طاقتوں کے خلاف قیام کرنے کی ترغیب دی گئی ہے وہاں پر جابجا اصرار کر رہے ہیں کہ دعاء عرفہ کو مت بھولئے۔ اس وصیت نامے کا آغاز بھی مناجات سے ہوتا ہے اس کے درمیان میں بھی مناجات اور اس کا اختتام بھی مناجات پر ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب تک دل کو یاد حق سے مزین نہ کیا جائے وہ ظالم کے خلاف قیام نہیں کر سکتا۔ امام خمینی ہمیشہ ظلم کے خلاف آواز اٹھاتے اور ہمیشہ اہل ستم کو للکارتے تھے۔ اور آخر کار ایک آرام و مطمئن قلب کے ساتھ سوئے حق روانہ ہو گئے۔

خداوند تعالیٰ نے بھی قرآن مجید میں ظالموں اور مجرموں کو ڈانٹا ہے لہذا خدا کے مخلص بندے بھی جو خدا کے علاوہ کسی سے امید نہیں رکھتے اور خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے، ہمیشہ دشمنوں کو للکارتے ہیں۔

البتہ خداوند تعالیٰ جب کسی پر اپنی گرفت ڈالے تو یہ نہیں فرماتا کہ میں نے انہیں پکڑ لیا ہے، مارا ہے، باندھ دیا ہے وغیرہ بلکہ فقط اتنا فرما دیتا ہے میں نے ان پر ایک سخت آوازہ لگایا ہے۔

إِن كَانَت إِلاَّ صَيحَةً وَاحِدَةً فَإِذَا هُم خَامِدُونَ (19)

وہ فقط ایک کڑک تھی جس کے بعد وہ ڈھیر ہو گئے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے فقط فرمان آتا ہے۔ پکڑنا اور باندھنا فرشتوں کا کام ہے۔ سورہ یٰس میں ہے کہ ہم فقط آواز پیدا کریں گے جس سے ساری بساط الٹ جائے گی۔ یہ صدائے الٰہی کائنات کو دگرگوں کر دے گی اور اسی سے بساط عالم کو لپیٹ لیا جائے گا۔ ایسے نہیں ہے کہ خداوند تعالیٰ بھی معاذاللہ انسانوں کی طرح پکڑ دھکڑ کرے گا بلکہ ایک نفخہ (صور) سے پورا عالم بجھ جائیگا اور دوسرے نفخہ (صور) سے دوبارہ سارا جہان زندہ ہو جائے گا۔

یہ خصوصیت خلفاء الٰہی میں بھی موجود ہوتی ہے۔ انسان اس صفت میں بھی خلیفہ حق بن سکتا ہے بلکہ انسان جتنا بھی آگے بڑھے گا اس کی خلافت کی قلمرو میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ البتہ یہ یاد رہے کہ نبوت تشریعی اور رسالت تمام ہو چکی ہے اب کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا لیکن خلافت وولایت کا باب ابھی تک کھلا ہوا ہے۔ انسان ایسے مقام تک پہنچ سکتا ہے جہاں پر حق تعالیٰ اس کے کام کو اپنی طرف منسوب کرلے۔ چنانچہ میدان جنگ میں مصروف پیکار جنگجوؤں سے فرمایا جو کچھ تم نے کیا ہے وہ دراصل میں نے کیا ہے۔ یوں نہیں فرمایا:

فَلَم تَقتُلُوهُم إِذ قَتَلتُمُوهُم وَلَكِن اللهُ قَتَلَهُم

یعنی جب تم نے مارا تو یہ تم نہیں مارا بلکہ اللہ نے مارا ہے..... بلکہ فرمایا:

فَلَم تَقتُلُوهُم وَلَكِنَّ اللهَ قَتَلَهُم (20)

یعنی انہیں تم نے نہیں بلکہ اللہ نے مارا ہے۔

یہ چیز شجاعت وعرفان کی روح ہے اور اس حماسی وعرفانی روح کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیں دعائے عرفہ اور صحیفہ سجادیہ سے مدد لینی چاہئے۔ آخر یہ کیسے ہو سکتا کہ ایک انسان سینکڑوں فرسخ تک طوق وزنجیر کا بوجھ اٹھائے ہوئے جب شام کے بازار میں پہنچتا ہے تو ایسے خطبہ دیتا ہے جیسے علیؑ کوفہ میں خطبہ دے رہے ہوں۔ کسی کی پرواہ نہیں کرتا اور کسی سے

ہراساں بھی نہیں ہے- کربلا سے دارالامارۃ تک اسارت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اور جب کوفہ میں قتل کی دھمکی دی جاتی ہے تو فوراً پکار اٹھتا ہے کہ کیا تم مجھے قتل سے ڈراتے ؟ ہو شہادت تو ہمارا شرف ہے-

امام سجاد علیہ السلام نے کوفہ میں اپنے والد گرامی حضرت امام حسین علیہ السلام کا کلام دہرایا جو انہوں نے کربلا میں بیان فرمایا تھا- البتہ فرق یہ ہے کہ امام سجاد علیہ السلام اس وقت زنجیرں میں جکڑے ہوئے تھے- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسان جو طوق و زنجیر میں اسیر ہے اس شیر کی مانند ہے جسے زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہو اور عار ناید شیر را از سلسلہ

شیر کو بھلا زنجیر سے کیا ننگ

زاغ و زغن اور کوؤں کے لئے پنجرہ نہیں بنایا جاتا بلکہ طوطی ، قمری اور بلبل کی اتنی اہمیت ہوتی ہے کہ ان کے لئے قفس بنایا جائے ورنہ زاغ و کوا ہمیشہ آزاد رہتے ہیں- امام سجاد علیہ السلام نے کوفہ میں دارالامارۃ کے اندر فرمایا کہ شہادت اور موت ہمارے لئے فخر ہے -اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسارت اور زنجیروں میں جکڑا جانا بدن کے لئے ہوتا ہے ،عارف کی روح میں شجاعت ہوتی ہے اس کی روح ہمیشہ زندہ ہوتی ہے اور جب حضرت زینب کبری سلام اللہ علیہا کی باری آتی ہے تو آپؑ بھی شجاعت و عرفان سے سرشار خطبات بیان فرماتی ہیں- یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اہل معرفت خواہ مرد ہوں خواہ عورتیں ہمیشہ اہل حماسہ و شجاعت ہوتے ہیں-

جب امیر المومنین علیہ السلام کو سر برہنہ حالت میں گھر سے باہر لایا گیا تو حضرت زہرا نے شجاعت دکھاتے ہوئے آواز اٹھائی اور حکومت وقت پر اعتراض کیا- اس پر امیر المومنین علیہ السلام نے جناب سلمان سے فرمایا کہ رحمتہ اللعالمین ؐ کی بیٹی سے کہو کہ

اَریٰ جَنبَتَیِ الْمَدِیْنَتِہِ تَکفِئَان (21)

میں شہر مدینہ کے دونوں پہلو لرزتے ہوئے دیکھ رہا ہوں-

اس سے مراد فقط مسجد مدینہ کی دیواروں کا لرزنا نہیں تھا بلکہ فرمایا کہ پورا خطہ زمین لرز رہا

ہے گویا علیؑ فرما رہے ہیں کہ اگر آپ نے ارادہ کر لیا اور بد دعا کر دی تو پورے مدینے کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔ اور یہ صاحب صحیفہ فاطمیہ کی دعا کا اثر ہے کہ امام خمینی نے اپنے وصیت نامے میں صحیفہ فاطمیہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اس بلند مقام پر فائز انسان کی حماسی رُوح جب جوش میں آجاتی ہے تو علیؑ کو یہ فرمانا پڑ جاتا ہے کہ مدینے کے دونوں طرف سے عذاب کی نشانیاں نظر آنے لگی ہیں اور ان کے فرزند حضرت امام حسین علیہ السلام بھی فرماتے ہیں کہ خدایا مجھے اپنی ذات سے اس طرح خوفزدہ کر دے کہ گویا تجھے دیکھ رہا ہوں اور دوسری طرف فرماتے ہیں اگر دنیا میں میرے لئے کوئی ملجاء و ماوی اور پناہ گاہ نہ رہے تو بھی یزید بن معاویہ کی بیعت نہیں کروں گا۔

چوتھی فصل

فضیلتوں میں ہم آہنگی

کوئی فضیلت بھی دوسری فضیلت کو رد نہیں کرتی لیکن برائیاں ایک دوسرے کے ساتھ سازگار نہیں ہیں۔ جیسا کہ برے افراد بھی ایک دوسرے کے ساتھ سازگار نہیں ہوتے جب کہ خوبیاں آپس میں ہم آہنگ ہیں جیسا کہ اچھے اور خوب افراد بھی باہم سازگار ہوتے ہیں۔

عرفان انسان کے فضائل عالیہ میں سے ہے۔ حماسہ وشجاعت اور ظلم کے خلاف جنگ وستیز بھی انسان کے فضائل عالیہ میں سے ہے۔ لہذا ممکن نہیں ہے کہ ایک حقیقی عارف بزدل ہو جیسا کہ یہ بھی غیر ممکن ہے کہ ایک حقیقی شجاع انسان عارف نہ ہو۔ لہذا اگر کسی جگہ کوئی عارف ظلم وستم کو قبول کرلے اور ظالموں کی ستم گری کو صحیح قرار دے تو یقیناً "اس کا عرفان کاذب ہوگا ایسے ہی اگر کوئی شجاع آدمی معرفت کے بغیر نظر آیا تو یقیناً وہ متہور ہوگا نہ شجاع۔

عرفان وشجاعت آپس میں کیسے سازگار ہیں اور امام خمینی نے اپنے وصیت نامے میں لوگوں کو عرفان کی دعوت کیوں دی ہے۔ ایک طرف دعائے عرفہ 'مناجات شعبانیہ صحیفہ اور فاطمیہ کی طرف ترغیب دلائی ہے اور دوسری طرف اسی وصیت نامے میں لوگوں کو ستم گروں کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے پر بھی اکسایا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عرفان کا نتیجہ دنیا سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے نہ کہ خلق خدا سے - عارف وہ ہوتا ہے جو دنیا کو ترک کردے نہ کہ لوگوں کو اور خدمت خلق کو- شجاع بھی اسے کہتے ہیں جو اسی عظیم مقصد کے لئے اپنی طاقت استعمال کرے-

جناب بو علی سینا عرفان اور عارف کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اَلعَارِفُ شُجَاعٌ وَکَیفَ لاَوَھُوَ بِمَعْزَلٍ عَنْ تَقِیہ الْمَوت (1)

عارف ہمیشہ شجاع ہوتا ہے اور ایسے کیوں نہ ہو جب کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا-

پس عرفان شجاعت و حماسہ کے ساتھ سازگار ہے کوئی عارف بزدل نہیں ہو سکتا کیونکہ عارف موت سے نہیں ڈرتا جو موت سے نہ ڈرتا ہو وہ لامحالہ شجاع ہوتا ہے لہذا جو موت سے ڈرتا ہے وہ عارف نہیں ہو سکتا-

دنیا کو ترک کر دینا عرفان بھی ہے اور فضیلت بھی ہے لیکن خلق خدا سے دوری اختیار کرنا اور معاشرت چھوڑ دینا نہ فضیلت ہے اور نہ ہی عرفان-

علی علیہ السلام ایک طرف سے دنیا کے بارے میں یوں فرماتے ہیں-

یَادُنیَاغُرّیِ غَیرِیِ قَدطَلّقتُكِ ثَلاَثاًلاَرَجعَةَ لِی فِیكِ (2)

اے دنیا میرے علاوہ کسی اور کو جاکر دھوکہ دے میں نے تجھے تین طلاقیں دے دی ہیں جن میں رجوع کی کوئی گنجائش بھی نہیں ہے-

علیؑ نے دنیا کو اس طرح اپنے آپ سے دور کیا کہ اب حرم علوی میں دنیا کے آنے کا امکان ہی ختم ہو گیا ہے اور دوسری طرف سے رہبری اور امامت کے لئے کوشش کرتے ہیں جس کا بہترین شاہد خطبہ شقشقیہ ہے-

آپ کے وہ سارے احتجاج اور تمام مناظرات اسی باب سے ہیں کبھی دوسروں کو فرماتے ہیں کہ رہبری میرا حق ہے اور قیادت کی چکی کا قطب میں ہوں-

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امت اسلامی کی رہبری کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ آخرت

سے ہے چونکہ جو شخصیت دنیا کو طلاق دے چکی ہے وہی رہبری کے لئے کوشاں بھی ہے۔ اور جب لوگوں نے ساتھ دیا اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی تو اپنے آپ کو ذمہ دار بھی سمجھنے لگے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک عارف احساس ذمہ داری نہ رکھتا ہو جب کہ اللہ تعالی نے حقیقی علماء سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ ناداروں کے فقرو فاقہ پر خاموش نہ رہیں اور ثروت مندوں کے مال جمع کرنے پر ساکت نہ بیٹھیں۔ اس بارے میں تمام انسانوں کی ذمہ داری ہے لیکن قومی اور اجتماعی رہبر زیادہ ذمہ دار ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے علماء سے ان دو باتوں پر عہد لیا ہے۔ اگرچہ سبھی جوابدہ ہیں لیکن اصلی ذمہ دار علماء ہیں۔

چنانچہ حضرت علی علیہ السلام اس بارے میں فرماتے ہیں۔

اَمَاوَالّذِیِ خَلَقَ الحبّۃَ وَبرَءَ النسمۃَ لَولاً حُضُورُالحاَضِرِ وَ قَیاَمُ الُحُجّۃَ بُوجُودِالنّاصِرِ وَماَ اَخَذَ اللّٰہ عَلَی العُلَماَء اَنْ لاَ تَقارّواعَلٰی کِظّۃَ ظَالِمٍ وَ لاَسغَبَ مَظلُومٍ لاَلُقَیتُ حَبلَھَاعَلٰی غاَرِبھاَ وَسَقَیتُ آخِرھَاَبِکاَسِ اَوّلِھَاوَلالقیتم دُنُیاَکُمْ ھٰذِہِ اَزھَدُعِندِیٗ مِنْ عُفطَۃَ عَنْزٍ (3)

اس ذات کی قسم جس نے دانے کو شگافتہ کیا اور ذی روح چیزیں پیدا کیں اگر بیعت کرنے والوں کی موجودگی اور مدد کرنے والوں کے وجود سے مجھ پر حجت تمام نہ ہو گئی ہوتی اور وہ عہد نہ ہوتا جو اللہ نے علماء سے لے رکھا ہے کہ وہ ظالم کی شکم پری اور مظلوم کی گرسنگی پر سکون و قرار سے نہ بیٹھیں تو میں خلافت کی باگ ڈور اسی کے کندھے پر ڈال دیتا اور اس کے آخر کو بھی اسی پیالے سے سیراب کرتا جس سے اس کے اول کو سیراب کیا ہے اور تم اپنی دنیا کو بکری کی چھینک سے بھی زیادہ میری نظروں میں ناقابل اعتنا پاتے۔

حضرت علی علیہ السلام اس خطبے میں فرمارہے ہیں:

کہ میں علماء میں سے ہوں اور اللہ نے علماء سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ برہنہ پا لوگوں کے فقر

وفاقہ اور ثروتمندوں کی شکم پری پر خاموش نہ بیٹھیں۔ پس میں عالم ہوں اور عالم سے اللہ نے عہد لیا ہے اس لئے یہ منصب قبول کر رہا ہوں۔

یہیں سے مذہبی رہنماؤں کا فریضہ بھی واضح ہوتا ہے چونکہ امیر المومنین علیہ السلام یہ فرما رہے ہیں کہ خدا نے علماء سے یہ عہد لیا ہے کہ فقر کی تائید نہ کریں اور طاقت فرسا طبقاتی فاصلوں کی توجیہ نہ کریں اور میں نے اسی غرض سے یہ منصب قبول کیا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ عرفان دنیا سے گریز کا نام ہے نہ کہ خلق خدا اور خدمت خلق سے۔ اگر عرفان کے یہ معنی ہوں تو پھر عارف اپنے اندر احساس ذمہ داری پاتا ہے اپنی اس ذمہ داری کو نبھانے کے لئے اسے لامحالہ فداکاری کرنا پڑتی ہے۔ ایثار گری اور جانثاری کرنا پڑتی ہے اور بعض اوقات تو ممکن ہے اس راہ میں اسے سر بھی دینا پڑ جائے۔ چونکہ طاقت ثروتمندوں اور زر اندوزوں کے پاس ہوتی ہے۔ اگر انہیں کوئی نہتا کرنا چاہے تو اسے بہت کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ سب سے پہلا سرمایہ جو لگانا پڑے گا وہ ایک پاک اور مقدس خون ہے۔ اس طرح سے عارف اہل شجاعت بھی ہو جاتا ہے۔

لہذا امام حسین علیہ السلام ایک طرف دعائے عرفہ پڑھتے ہیں اور دوسری طرف فرماتے ہیں کہ میں اپنے جد اور والد گرامی کی راہ پر چلنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی حکمران موجود تھے لیکن میں اپنے جد اور والد کی سیرت پر چلنا چاہتا ہوں۔ اس ایک چوتھائی صدی میں لوگ دوسروں کی سیرت سے بھی مانوس ہو گئے ہیں لیکن میں فقط پیامبر گرامی اور امام معصوم کی سیرت اختیار کرتے ہوئے قیام کروں گا۔ اسی وجہ سے آپ کی مناجات میں بھی شجاعت کی جھلک موجود ہے۔

عرفان و شجاعت جس طرح سے حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت میں موجود ہیں ایسے ہی حضرت امیر المومنین علیہ السلام کے کردار و گفتار میں بھی نمایاں ہیں۔ عرفان کا بہترین مظہر دعاء ہے جب بندہ اپنے رب کے ساتھ راز دل بیان کرتا ہے چونکہ اس حالت میں کوئی بھی عبد و مولا کے مابین حائل نہیں ہوتا خدا نے ہر ایک سے زیادہ خود کو

ہمارے نزدیک کہا ہے اس سے پہلے کہ ہم یہ سمجھیں کہ کیا کہنا چاہتے ہیں خدا کو علم ہو جاتا ہے ہمارے زبان کھولنے سے پہلے خدا کو علم ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ ذات الصدور کا علم رکھنے والا ہے۔

در حقیقت دعا مولا اور عبد کے درمیان رابطے کے استحکام کا نام ہے جس میں کسی غیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ایک عارف انسان بھی دعا مانگتا ہے اور ایک غیر عارف انسان بھی دعا مانگتا ہے لیکن عارف کی دعا یہ ہوتی ہے کہ خدایا اپنے سوا ہر چیز مجھ سے لے لے لیکن غیر عارف آدمی کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اپنے علاوہ سب کچھ مجھے عطا کر۔ عارف خدا سے کہتا ہے خدایا اپنے دین کی راہ میں میری جان میری عزت و آبرو اور مال و دولت سب کچھ لے لے اور مجھے خرید لے چنانچہ قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے :

اِنّ اللّٰهَ اشتَریٰ مِنَ المُؤمِنِینَ اَنفُسَهم بِاَنّ لَهُمُ الجَنّتہ یُقَاتِلُونَ فِی سَبِیلِ اللّٰهِ فَیَقتُلُونَ وَ یُقتَلُونَ وَعداً عَلَیهِ حَقّاً فِی التّوراۃِ وَ الاَنجِیلِ وَالقُرآنِ وَ مَن اَوفیٰ بِعَهدِہِ مِنَ اللّٰهِ فَاستَبشِرُوابِبیعکُمُ الذی بایعتمُ بِہِ وَ ذٰلِكَ هُوَ الفَوزُ العظِیمُ (4)

خدا نے مومنین سے ان کے نفوس اور اموال جنت کے بدلے خرید لئے ہیں یہ مومنین اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں پس قتل کرتے ہیں اور قتل ہو جاتے ہیں اللہ کی طرف سے یہ وعدہ ہے جو توراۃ وانجیل اور قرآن میں مذکور اور ثابت ہے اور جو بھی اپنا یہ عہد پورا کرے تو بشارت پاتا ہے اس تجارت کے بارے میں جو تم نے اللہ سے کی ہے اور یہی عظیم کامرانی وکامیابی ہے۔

عرفاء کی تمام دعاؤں کا مضمون یہی ہوتا ہے کہ خدایا میں لایا ہوں تو مجھ سے قبول کرلے جب کہ غیر عارف کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے اللہ! مال ، فرزند ، جنت ، عزت و

آبرو اور جاہ و جلال مجھے عطا کر۔ جس کا ہاتھ لینے والا ہے وہ گداصفت ہے نہ کہ عارف لامحالہ وہ اہل شجاعت بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ جو بخشش کرنے والا ہے عارف ہوتا ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام کی دعا یہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُكَ مَنَازِلَ الشُّھَدَاءِ (5)

خدایا ہمیں شہداء کے مقام و منزلت عطا فرما۔

یعنی میں نے اپنی جان تجھے دیدی ہے تو مجھے شہید قرار دے اپنی عزت تیری راہ میں دی ہے مجھے شہید عزت قرار دے مال بھی تیری راہ میں دے رہا ہو۔

اور یہ جو ہم دعا میں پڑھتے ہیں

وَقَتْلاً فِیْ سَبِیْلِكَ فَوَفِّقْ لَنَا (6)

اپنی راہ میں قتل ہونے کی توفیق عطا فرما۔

تو یہ درس معرفت ہے یعنی اے خدا میری جان مجھ سے لے لے۔ مجھے زرد چہرے کے ساتھ بستر بیماری پر کسی مرض کے اثر میں نہ مارنا چونکہ ایسی موت قابل فخر نہیں ہے۔ خدایا مجھے ایسی توفیق عطا فرما تاکہ سرخ چہرے کے ساتھ میدان جنگ میں تیری راہ میں جان دے دوں۔

چونکہ روزہ دار انسان کی دعا قبول ہوتی ہے اس لئے ہمیں یہ دستور دیا گیا ہے کہ ماہ رمضان میں دن کو روزہ رکھو اور رات کو خدا کی بارگاہ سے مانگو کہ اے خدا ہمیں اپنی بارگاہ میں قبول فرما۔ آپ کو خدا سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت نہیں ہے وہ خود عطا کرتا ہے آپ کو فقط ایک دعا مانگنی چاہئے کہ خدایا مجھے اتنی توفیق دے تاکہ میرے جان و مال سے اور میری قدرت و توانائی سے تیرے دین کی مدد ہو سکے۔

وَتَجْعَلَنِیْ مِمَّنْ تَنْتَصِرُ بِهٖ لِدِیْنِكَ وَلَاتَسْتَبْدِلْ بِیْ غَیْرِیْ (7)

مجھے اپنے دین کی مدد کرنے والوں میں سے قرار دے اور میری جگہ کسی اور کو انتخاب نہ کر۔

یعنی میرے مال و دولت اور جان اور خون اور میری عزت و آبروسے تیرے دین کی حفاظت ہو۔ یہ جو میں ہر توہین اور تہمت کو برداشت کر رہا ہوں تو اپنی عزت دے رہا ہوں۔ آبرو دینا خون دینے سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ خون تو فقط ایک بار دیا جاتا ہے اس کے بعد انسان آسودہ ہو جاتا ہے لیکن آبرو دیکر انسان زندگی بھر اس کا رنج برداشت کرتا ہے۔ امیر المومنین علیہ السلام نے خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں جو عرض کیا ہے کہ اے خدا ہمیں مقام و منزلت شہداء عطا فرما تو اگرچہ بظاہر کچھ مانگ رہے ہیں لیکن حقیقت میں کچھ دے رہے ہیں اس کا مضمون بخشش کرنا ہے نہ کہ درخواست کرنا اور یہ اقتضاء ہے۔ Requirement نہ کہ تقاضا Demand۔

عارف اور غیر عارف کی دعاء میں بہت فرق ہوتا ہے۔ عارف پکارتا بھی ہے اور دعاء بھی کرتا ہے لیکن مانگتا بہت کم ہے۔ فقط اس صورت میں مانگتا ہے جب اسے اجازت مل جائے۔ حضرت ایوب علیہ السلام نے ان تمام طاقت فرسا مشکلات کو برداشت کیا لیکن کچھ بھی نہیں مانگا۔ اس وقت طلب کیا جب مانگنے کی اجازت ملی اور بارگاہ خدا میں یوں عرض کی:

اِنّیِ مَسّنِیَ الضّرّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّاحِمِیْنَ (8)

یعنی مجھے ضرر نے مس کیا ہے تو ارحم الراحمین ہے۔

اولیاء خدا کو جب تک اجازت نہ مل جائے کوئی چیز طلب نہیں کرتے اگر مانگتے بھی ہیں تو وہ ہمیں تعلیم دینے کی غرض سے کہ اپنی ضرورتیں کس طرح سے اللہ کے سامنے پیش کریں۔

عارف کی دعاء درحقیقت دعوت ہوتی ہے اور کچھ دینے سے عبارت ہوتی ہے لہذا جب حضرت زینب علیہا السلام نے دعاء کی تو یوں عرض کیا۔

رَبّنَا تَقَبّلْ مِنّا هٰذَا الْقُرْبَانَ

اے پروردگار ہم سے یہ قربانی قبول فرما۔

یعنی خدایا ہماری طرف سے اس خاک و خون میں لت پت کو قبول فرما۔

دیگر شہداء بھی جب میدان جنگ کی طرف روانہ ہوتے تھے تو اہل حرم کی یہی دعاء ہوتی کہ خدایا اس قربانی کو ہماری طرف سے قبول فرما:

جہاں ایک عابد اور زاہد کی دعاء یہ ہوتی ہے کہ خدایا ہمیں کچھ عطا کر وہاں عارف کی کوشش ہوتی ہے کہ خداوند تعالٰی کے اسمائے حسنیٰ میں سے سخی ،باسط اور واہب جیسے اسمائے حسنیٰ کے مظہر بنے جب کہ زاہد و عابد یہ کوشش کرتے ہیں کہ آخذ و قابض جیسے اسمائے حسنیٰ کے مظہر بنیں۔

چونکہ عرفان کچھ دینے کی غرض سے ایک مخصوص قسم کی دعاء کا نام ہے اس لئے عرفان حماسہ و شجاعت کا مخالف نہیں بلکہ ان کے عین موافق ہے۔

عرفان کے بغیر زہد و عبادت اگرچہ بجائے خود فضیلت ہیں لیکن ان میں جو کمی رہ جاتی ہے وہ رذیلت ہے اور یہ رذیلت ہی ہے جو شجاعت کے ساتھ سازگار نہیں ہے ورنہ کوئی فضیلت کبھی دوسری فضیلت کے ساتھ تضاد نہیں رکھتی۔

انسان کامل تمام فضلیتوں کا مجموعہ ہوتا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاؤں کی طرف اگر رجوع کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ آنخضرتؐ کی دعائیں بھی ایسے ہی تھیں کہ خداوند تعالٰی سے کچھ دینے کی دعا کرتے تھے نہ کہ کچھ لینے کی۔ آپؐ خدا کی بارگاہ میں یوں عرض کرتے ”اے خدا مجھے قبول کرلے اور جو کچھ تیری راہ میں دے رہا ہوں اسے قبول فرما “۔یوں نہ فرماتے تھے کہ خدایا مجھے ایک باغ یا گلستان عطا کر بلکہ عرض کرتے ”جو کچھ میرے پاس ہے اس کو لیکر انسانی معاشرے کے لئے خرچ کردے۔“

اگر کوئی شخص دنیا سے دوری کو خلق خدا سے دوری کے ساتھ مخلوط کردے تو وہ عارف نہیں ہوسکتا۔ بلکہ عارف کی کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ دنیا طلبی کا دھبہ اس کے دامن پر نہ لگے۔وہ لوگوں کے اندر رہ کر معاشرے کا بوجھ بھی اپنے کندھوں پر اٹھاتا ہے اور لوگوں کی مشکل گرہیں بھی کھولتا ہے۔

علی علیہ السلام انبیاء علیہم السلام کی رسالت کا اصل مقصود دو چیزوں کو بتاتے ہیں ایک

علمی اور عقل نظری Scntiments سے مربوط مسائل دوسرے عقل عملی -Practi cal سے متعلقہ مسائل جیسے ارادہ' اخلاص نیت' عبادت وغیرہ ، چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں-

فَبَعَثَ فِیهِمْ رُسُلَهُ وَ وَاتَرَ اِلَیْهِمْ اَنْبِیَائَهُ لِیَسْتَادُوْهُمْ مِیْثَاقَ فِطْرَتِهِ وَ یُذَکِّرُوهُمْ مَنْسِییُ نِعْمَتِهِ وَ یَحْتَجُوا عَلَیْهِمْ بِالتَّبْلِیْغِ وَ یُثِیْرُوَا لَهُمْ دَفَائِنَ الْعُقُولِ (10)

اللہ نے ان میں اپنے رسول مبعوث کئے اور لگاتار انبیاء بھیجے تاکہ ان سے فطرت کے عہدو پیمان پورے کرائیں' اس کی بھولی ہوئی نعمتیں یاد دلائیں' پیغام ربانی پہنچا کر حجت تمام کریں' عقل کے دفینوں کو ابھاریں-

پس انبیاء اس لئے آئے ہیں تاکہ لوگوں کو بتوں کی بندگی سے آزاد کرائیں لہذا اگر کسی شخص کو یہ توفیق مل جاتی ہے کہ وہ لوگوں کو خواہشات کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں لے آئے تو اس نے انبیاء کا کام کیا ہے اور ممکن ہے بعض اوقات اس مقصود تک پہنچنے کے لئے جنگ کی ضرورت پڑ جائے-

کوئی اہل معرفت بھی اس کائنات میں انبیاء کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا اور انبیاء سے بڑھ کر کوئی انسان بھی سیاسی و عسکری جنگوں سے دوچار نہیں ہوا چنانچہ قرآن کریم میں سلسلہ انبیاء کے بارے میں یوں فرمایا گیا ہے:

وَ کَاَیِّنْ مِنْ نَبِیٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّیُّونَ کَثِیْرٌ فَمَا وَ هَنُوا لِمَا اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَاضَعُفُوا وَ مَااسْتَکَانُوا وَاللّٰهُ یُحِبُّ الصَّابِرِیْنَ (11)

اور کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کی رکاب میں پروردگار کو ماننے والوں نے (دشمنوں کے ساتھ) کئی جنگیں لڑی ہیں۔ اللہ کی راہ میں پیش آنے والی مصیبتوں سے وہ سست نہیں ہوئے نہ ہی کمزور وضعیف ہوئے اور نہ ہی کوئی تھکاوٹ محسوس کی بے شک خدا صبر کرنے

والوں کو پسند کرتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تمام انبیاء نے جہاد کیا ہے اس راہ میں شہید بھی ہوئے ہیں اور دوسروں کو قتل بھی کیا ہے یہ بہت کم اتفاق ہوا ہے کہ کچھ نبی جنگ میں مبتلا نہ ہوئے ہوں۔ چونکہ معاشرے کی اصلاح کا تقاضا یہ ہے کہ اختیار طاقتوروں اور ثروتمندوں سے لے کر اہل افراد کے سپرد کیا جائے اور یہ کام نصیحت سے انجام نہیں پاتا بلکہ اس کے لئے جنگ کرنا پڑتی ہے۔ واضح رہے کہ اہل جنگ وہ ہوتا ہے جو اہل معرفت ہو اور اہل معرفت وہ ہوتا ہے جو موت سے نہ ڈرے بلکہ موت کو ایک نئی زندگی شمار کرے۔

موت سے دل لگانے کے لئے انسان کو مجبورا" موت کے بعد والے مرحلے کو صحیح طور پر سمجھنا پڑے گا۔ اسے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ موت سے انسان کیا بن جاتا ہے ؟

کیا ایک درخت کی مانند خشک اور پژمردہ ہو جاتا ہے کہ جس کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہتا ؟ یا انسان ایک پرندے کی مانند ہے جس پر پنجرے کا دروازہ کھلتا ہے اور وہ آزاد ہو جاتا ہے ؟ اس کے بعد ہمیشہ کے لئے پرواز کی دل فریب فضاؤں میں موجود رہتا ہے ؟ (12) پس موت کبوتر روح کی آزادی کا نام ہے چونکہ نہ فکر و اندیشہ کو موت آتی ہے نہ ہی روح کو موت آتی ہے تصورات کبھی نہیں مرتے۔ انسانی فضائل کو ہرگز موت نہیں آتی۔ یہ امور موت اور مرنے والوں کی قلمرو سے باہر ہیں۔

اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ امام خمینی نے کس طرح مناجات کو اس مجاہدانہ شجاعت و حماسہ کے ساتھ یکجا کر دیا ایک طرف سے حق تعالی کی بارگاہ میں اپنے خضوع و بندگی کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف بڑی طاقتوں کے مقابلے میں اپنے مضبوط اقتدار کی بات کرتے ہیں اور ہمیں بھی ان دونوں راستوں کی جانب دعوت دیتے ہیں۔

علی علیہ السلام کا فرمان ہے کہ خداوند تعالیٰ سے دعا مانگو کہ تمہیں شہداء کے مقام و منزلت پر پہنچا دے (13)۔ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ شہداء کون لوگ ہیں ؟

شہداء وہ لوگ ہیں جو اپنے بعد زندہ رہ جانے والوں کے لئے مسرت کا پیغام دیتے ہیں۔

ان کا کہنا یہ ہے کہ تم نہیں جانتے خدا نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟

يَا لَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَ جَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ (14)

اے کاش میری قوم کو معلوم ہوتا کہ خدا نے مجھے مغفرت عطا کی ہے اور کس طرح مجھے اہل کرامت میں سے قرار دیا ہے۔ شہید کے لئے کوئی پریشانی نہیں ہوتی اسی وجہ سے دین نے ہمیں یہ درس دیا ہے کہ بے صبری کے ساتھ شہادت کے منتظر رہو اور شہداء سے ہمیشہ یہی خطاب کرو کہ اے کاش ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے۔

يَالَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوزَ مَعَكُمْ فِي الْجِنَانِ مَعَ الشُّهَدَاءِ وَ الصَّالِحِيْنَ وَ حَسُنَ أُولٰئِكَ رَفِيقًا (15)

اے کاش میں آپ کے ساتھ ہوتا اور آپ کے ہمراہ جنت میں شہداء اور صالحین کے ساتھ ہوتا جو بہت ہی اچھے ساتھی ہیں۔

شہداء بھی جواب میں یہی کہتے ہیں کہ اے کاش آپ بھی ہمارے ساتھ ہوتے اور یہ سب کچھ دیکھتے۔

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کہ عبادت اور دعاء کے کئی درجات ہیں ایمان سے لے کر احسان تک اور احسان سے لیکر ایقان تک انسان کبھی دور سے غیب کے اسرار سے آگاہ ہوتا ہے اور غیب پر ایمان لے آتا ہے یہ مومن بالغیب ہے اس نے نہ کسی چیز کو تحقیقاً دیکھا ہے اور نہ ہی کانّ (تشبیھاً) دیکھا۔

ایمان سے اوپر مرحلہ احسان ہے جس میں انسان اس طرح سے خدا کی عبادت کرتا ہے کہ گویا اسے دیکھ رہا ہے اور یہ گویا اور کانّ جب اپنے کمال کو جا پہنچتا ہے تو تحقیق میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زید بن حارث گویا کہ مرحلے میں ہیں اور کہتے ہیں کہ گویا میں عرش خدا کو دیکھ رہا ہوں۔ بہشت و جہنم اور اہل ثواب و عقاب کو دیکھ رہا ہوں جب کہ اس

سے بالاتر مرتبے میں بھی کچھ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اسی آن سب کچھ دیکھ رہے ہیں نہ یہ کہ گویا دیکھ رہے ہیں(16)- یہ وہ راہ ہے جو قرآن مجید نے ہمیں بتائی اور اس کا وعدہ بھی دیا ہے-

كَلاّلَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ" لَتَرَوُنّ الْجَحِيْمَ" ثُمّ لَتَرَوُنّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ثُمّ لَتُسْئَلُنّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النّعِيْمِ (17)

اگر علم یقین پیدا کر لو تو جہنم کو دیکھ لو گے اور پھر تم عین الیقین کی حد تک جہنم کو دیکھ لو گے اور اس وقت تم سے نعمتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا یہ وہ عظیم مقام ہے جسے اہل معرفت میں سے عظیم لوگ طلب کرتے ہیں-

حضرت امام حسین علیہ السلام بھی دعائے عرفہ میں خداوند تعالی سے طلب کرتے کہ اے پروردگار مجھے اتنی توفیق دے تاکہ تجھ سے ڈر سکوں اور یہ دعاء کچھ دینے کے لئے ہے جو کہے خدایا مجھ کو بخش دے وہ عارف نہیں ہے- چونکہ عارف کہتا ہے خدایا مجھے اتنا ڈرا دے کہ گناہ نہ کروں ابتداء میں نفسانی خوف Fear of sou اور آخر میں عقلانی خوف Intellectual Fear مانگتا ہے نبی اکرمؐ کی دعاء بھی ایسے ہی تھی-

اَللّٰهُمّ اقْسِمَ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا يَحُوْلُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعْصِيَتِكَ (18)

خدایا اپنا خوف ہمیں عطا کر تاکہ وہ ہمارے اور تیری بارگاہ میں معصیت کرنے کے درمیان حائل ہو جائے-

یوں نہیں فرمایا کہ خدایا اگر میں نے معاذ اللہ کوئی غلطی کی تو مجھے معاف کر دینا بلکہ فرمایا خدایا مجھے اتنا خوف عطا کر کہ کوئی غلطی کروں ہی نہیں۔ ایسے ہو ہی کیوں کہ پہلے میں گناہ کروں اور پھر اللہ سے چاہوں کہ مجھے جہنم میں نہ ڈالے-

ان دونوں دعاؤں میں بہت فرق ہے چونکہ ایک عارفانہ دعا ہے جس میں اللہ کو کچھ

پیش کیا جاتا ہے اس میں عارف اللہ سے یہ دعا مانگتا ہے کہ اے خدا یہ سکون میرے دل سے لے لے اور اس کے بدلے اپنی یاد کی تڑپ میرے دل میں پیدا کر دے جب کہ زاہد اللہ سے سکون دل کی دعا مانگتا ہے۔ پس ایک اللہ سے دل کا سکون مانگتا ہے دوسرا اللہ سے دل کی بے قراری طلب کرتا ہے۔ ان ساری دعاؤں میں عارف کا ہاتھ دینے والا ہے اور زاہد کا ہاتھ لینے والا ہے۔ لینے والا ہاتھ اللہ سے دعا مانگتا ہے کہ خدایا ہمیں جنگ میں مبتلا نہ کرنا امن و سکون عطا فرما جب کہ عارف اللہ سے شہادت مانگتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرت مبارکہ یہ تھی کہ ہر روز صبح طلوع فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان مسجد میں بیٹھ کر لوگوں کے مسائل سنتے اور جواب دیتے۔ ایک دن صبح سویرے ایک جوان پر آنحضرتؐ کی نگاہ پڑی جو لگتا تھا بظاہر کئی دنوں سے نہیں سویا تھا چہرے کا رنگ زرد اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ حضرتؐ نے اس جوان کی احوال پرسی کی اور فرمایا **کیف اصبحت یا فلان۔**

اے جوان کس حالت میں صبح کی ہے؟ جوان نے جواب دیا۔

اَصبَحتُ مُوقِناً یَا رَسُولَ اللّٰہِ

اے رسول خداؐ میں نے یقین کی حالت میں صبح کی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے اس سے حال نہیں بلکہ اس کی حالت پوچھی تھی کہ کس حالت میں ہو یعنی دینی حالات میں کس حالت و مقام میں ہو۔ اسی وجہ سے اس نے جواب دیا کہ حالت یقین میں ہوں۔ ورنہ اگر حال پوچھا ہوتا تو وہ کہہ دیتا کہ رات کو کم سویا ہوں۔ شاگرد کو چاہئے اپنا حال استاد کو بتائے اور مریض کو چاہئے اپنا حال طبیب کو بتائے۔

اہل راز سے اپنے اسرار چھپانا ادب کے خلاف ہے جیسا کہ نااہل کے سامنے اسرار بیان کرنا خلاف شرع ہے۔ چونکہ ہر بات ہر ایک کے سامنے کرنا روا نہیں ہوتا۔ خدا رحمت کرے ہمارے استاد محترم جناب محی الدین مہدی الٰہی قمشہ ای مرحوم کو جو اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

گفت آن یار کز او گشت سردار بلند
جرمش آن بود که اسرار ہویدا می کرد

اس نے کہا کہ وہ دوست جس کو سولی پر لٹکا دیا گیا اس کا جرم فقط یہ تھا کہ اسرار فاش کر دیا کرتا تھا۔اور کبھی یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

جرمش آن بود که در آئینه عکس توندید
ورنه بر بوالبشری ترك سجود این همه نیست (19)

اس کا جرم یہ تھا کہ اس نے آئینے میں تیری تصویر نہیں دیکھی ورنہ ابو البشر کو اس قدر سجدہ ترک کرنا روانہ تھا اور کبھی جناب سید حیدر عاملی کا یہ جملہ دہراتے تھے:

نااہل کے سامنے راز فاش کرنا خلاف شرع ہے اور اہل راز کے نزدیک راز چھپانا خلاف ادب ہے۔(20)

رسول اللہؐ نے جب اس روشن ضمیر جوان سے پوچھا کہ کس حالت میں ہو تو اس نے عرض کی "حالت یقین" پر۔ حضرتؐ نے فرمایا کہ ہر حقیقت کی ایک نشانی اور علامت ہوتی ہے تیرے یقین کی کیا علامت ہے؟ تو عرض کرنے لگا "یا رسولؐ اللہ عرش کو گویا روشن اور نمایاں دیکھ رہا ہوں جنت اور جنتیوں کو اور جہنم اور جہنمیوں کو بھی گویا دیکھ رہا ہوں۔" جب اس نے اپنے باطن کی خبر دی تو رسولؐ اللہ نے اس کی تصدیق فرما دی اور اس کا راز بھی بتا دیا فرمایا:

عَبْدٌ نَوَّرَ اللّٰهُ قَلْبَهُ لِلْإِيْمَانِ

یہ وہ بندہ ہے جس کا دل اللہ نے ایمان سے روشن کر دیا ہے۔ چونکہ بندۂ حق ہے ہوس اور خواہشات کی قید سے آزاد ہے خدا نے اسے منور القلب بنا دیا ہے۔ انسان دو جگہوں پر غلام نہیں بن سکتا۔

مَا جَعَلَ اللّٰهُ لِرَجُلٍ مِنْ قَلْبَيْنِ فِيْ جَوْفِهِ

خدا نے کسی انسان کے اندر دو دل قرار نہیں دیئے۔ جو ایک مرتبہ دنیا کا اسیر ہو جائے

وہ بندۂ حق نہیں ہو سکتا۔ چونکہ ایک شخص دو جگہ زندان میں نہیں ڈالا جا سکتا یا دنیا میں یا رحمت حق کے سائے میں۔ آنحضرتؐ نے بھی اس جوان سے فرمایا۔

فَاثْبِتْ اس پر ثابت قدم رہو۔

یعنی اس راہ کو جاری رکھو اور یوں رسولؐ اللہ نے اس جوان کے عرفان کی تصدیق کر دی اور اسے سند دیدی کہ تم حقیقی عارف ہو۔

اس کے بر خلاف ایک دوسرے واقعہ میں روایات میں ہے کہ نبی اکرمؐ ایک مرتبہ اپنے حجرے کی مرمت کر رہے تھے کہ صحابہ میں سے ایک شخص کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے آنحضرتؐ کو مشغول دیکھ کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ اگر آپ اجازت دیں تو یہ کام میں کر دوں؟ پیغمبر اکرمؐ نے اسے محروم نہیں رکھا اور مرمت کی اجازت دیدی۔

اسی دوران حضرتؐ نے اس شخص سے فرمایا کہ اگر کوئی چیز مانگنا چاہتے ہو تو مانگ لو۔

اب چونکہ یہ شخص عرفان کے اعلیٰ مراتب پر فائز نہیں تھا اور اس کا ہاتھ لینے والا تھا لہٰذا عرض کرنے لگا کہ میری آرزو یہ ہے کہ قیامت میں بہشت میں چلا جاؤں۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا یہ ایک ممکن بات ہے لیکن اس کے لئے تجھے بہت طولانی سجدے کرنے پڑیں گے۔

لیکن وہ جوان جس کے بارے میں حضرتؐ نے فرمایا کہ اس کا دل اللہ نے ایمان سے روشن کر دیا ہے جب اس نے حضرتؐ سے دعا کی خواہش ظاہر کی تو حضرتؐ نے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ عرض کرنے لگا "شہید ہونا چاہتا ہوں میں بیمار ہو کر زرد چہرے کے ساتھ بستر مرض پر مرنا نہیں چاہتا۔ یہ بدن ایک ذخیرہ ہے اسے بستر بیماری پر کیوں ضائع کر دوں بلکہ بہتر یہ ہے کہ اسے بھی حق کے راستے میں قربان کر دوں۔" یہ عارف کی دعا ہے۔ یہ عرفان و حماسہ کے درمیان ہم آہنگی ہے۔ یہ تعریف و تحمیس کی سازگاری ہے۔ یہاں معرفت اور ستم ستیزی ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ یہاں عارف کی للکار ہے اور للکارنے والے مجاہد کی معرفت ہے۔ ہاں تو رسولؐ اللہ نے اس جوان کے لئے دعا کی اور اس نے جام شہادت نوش کیا۔

بیان مذکور سے امام خمینی کے وصیت نامے کے کئی ایک مضامین بھی روشن ہو جاتے ہیں۔ دعائے عرفہ اور صدائے کربلا میں ہم آہنگی کا راز بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ علیؑ کی مناجات اور علیؑ کے رجز کا راز بھی منکشف ہو جاتا ہے اور اس جوان کے ایمان سے منور دل کی عارفانہ دعا اور شہادت کی آرزو کی کلید بھی ہاتھ آجاتی ہے۔ چونکہ یہ تمام نمونے شجاعت و عرفان کی سازگاری اور ہم آہنگی کو بیان کر رہے ہیں۔

اس جوان نے نبی اکرمؐ سے یہ درخواست کی کہ آپؐ کی ذات مستجاب الدعوۃ ہے لہذا میرے لئے دعا فرمائیں کہ شہید ہو جاؤں نہ کہ مردار ہو کر اپنی حیات کو ضائع کر دوں۔

حضرت علی علیہ السلام کا فرمان ہے۔

صَارَ جِيفَةً بَيْنَ اَهْلِهِ وَ اَسْلَمُوهُ اِلىٰ عَمَلِهِ (21)

انسان پر ایسا وقت بھی آتا ہے جب وہ مر کر ایک بدبودار مردار بن جاتا ہے اس کے عزیز و اقارب کی کوشش ہوتی ہے کہ اسے جتنا جلدی ہو سکے زمین میں دفن کر دیں تاکہ اسکی بدبو اور تعفن فضا کو آلودہ نہ کر دے۔ ایسے عالم میں مردار کو اپنے عمل کے حوالے کر دیتے ہیں۔

چونکہ انسان کے اس دنیا میں جس قسم کے تصورات' اخلاق ،اعتقادات ،اور اعمال ہوں ان میں سے ذرہ برابر بھی ضائع نہیں ہوتا۔

ظاہراً انسان کو قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں انسان اپنے اعمال کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ پس معمولی لوگ معمول کی موت کے بعد مردار ہو جاتے ہیں لیکن الٰہی انسان مردار نہیں ہوتے بلکہ طیّب و طاہر پاکیزہ و معطر ہوتے ہیں۔ لہذا جب جوان موصوف نے آنحضرتؐ سے شہادت کی التجا کی تو حضرتؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ ابھی تم جوان ہو بلکہ جب یہ دیکھا کہ اس کے اندر شہادت کی صلاحیت موجود ہے تو اس کے لئے دعا فرمادی۔ آنحضرتؐ کا اس طرح کی دعا کرنا بجائے خود شجاعت و عرفان کے مابین ہم آہنگی کی سند ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے جناب بو علی سینا کے مطابق عارف شجاع ہوتا ہے بزدل

نہیں ہو سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ موت سے نہیں ڈرتا-(22) شیخ رئیس کا یہی بیان باعث بنا کہ جناب خواجہ نصیر الدین طوسی نے شرح اشارات کے آغاز میں ابن سینا کے بارے میں کہا کہ ان کی باتیں روایات کی طرح بہت ہی پختہ ہوتی ہیں۔ چونکہ انہوں نے جو کچھ کہا ہے اسی مکتب سے سیکھا ہے۔ یہی نہیں بلکہ حکماء الٰہی نے جو کچھ کہا ہے مکتب قرآن و روایت سے ہی لیا ہے۔

چنانچہ نبی اکرم ؐ کی دعا کے بعد فورا" ہی ایک جنگ چھڑ گئی جس میں کئی افراد نے جام شہادت نوش کیا جن میں یہ جوان مذکور بھی تھا۔ اس واقعہ سے ہم یہی استفادہ کرتے ہیں کہ ملکوتی نگاہ کے مالک ہونے اور جنگ کا شوق رکھنے میں کوئی تضاد و ناسازگاری نہیں ہے۔ چونکہ انسان ملکوتی ہوتا ہی اس وقت ہے جب جان کا نذرانہ پیش کرے۔ اسی وجہ سے معصوم علیہ السلام کا فرمانا ہے:

مَا مِنّا اِلاّ مَقْتُولٌ اَوْ مَسْمُومٌ (23)

ہم میں سے ہر ایک یا زہر سے یا قتل سے شہید ہوا ہے۔

ایسے ہی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ کَاَیِّنْ مِنْ نَبِیٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّیُّونَ کَثِیْرٌ

کتنے ہی ایسے نبی تھے جن کی رکاب میں بہت سے رب کو ماننے والے بھی جہاد و قتال میں شریک ہوئے تھے۔

ماہ مبارک رمضان کی دعائیں ہوں یا دعائے عرفہ، صدائے کربلا ہو یا امام خمینی کا وصیت نامہ، سب کے سب آپس میں ہم آہنگ ہیں۔ شہید کے لئے آنسو گرانا انسان کے اندر شہادت کا شوق پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ آنسو پر اسی کا رنگ چڑھا ہوتا ہے جس کے لئے یہ آنسو ٹپکتا ہے۔ جو شہید کے لئے آنسو بہاتا ہے اس کے لئے شہادت کا ذائقہ بہت ہی خوشگوار ہوتا ہے جو غیر شہید کے لئے روتا ہے تو اس کے لئے موت کا مزہ نہایت تلخ ہوتا ہے۔

اگر انسان چاہے کہ موت سے نہ گھبرائے تو اس کا بہترین راستہ توحید اور معرفت خدا ہے کہ جس کا ارمغان محبت جیسا سرمایہ ہوتا ہے۔ شہداء کربلا میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ دوسروں سے پہلے شہید ہو جائے۔ شب عاشور جب ان سے جانے کو کہا گیا تو ایک بھی نہیں گیا۔ مقتل میں جانے کے لئے بھی ایک دوسرے پر سبقت لیتے تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ انہوں نے اپنا مقام دیکھ لیا تھا چونکہ وہ ایسے مرتبے پر جا پہنچے تھے جہاں سے قیامت میں اپنا مقام اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے لہذا بہت ہی بیتابی کے ساتھ مقتل کو جاتے تھے۔ صرف کربلا میں ہی منحصر نہیں بلکہ صدر اسلام میں بعض پاکباز صحابہ بھی ایسے ہی تھے۔ بعض جنگوں میں ایسے بھی ہوا ہے کہ فقط ایک کھجور سب چوستے اور یوں کہتے کہ ہمارے اور بہشت کے درمیان اب ایک تیر کا فاصلہ رہ گیا ہے۔ جو بھی اپنا مقام دیکھ لے وہ جنگ میں دوسروں سے پہل کرے گا اور اپنا مقام دیکھنے کے لئے چشم باطن کی ضرورت ہے۔ جس کے اندر ایسی معرفت پیدا ہو جائے وہ سب سے زیادہ شجاع ہے (24)۔

اس مقام پر پہنچے کے لئے حقیقی عبادت کی ضرورت ہے درج ذیل آیت کریمہ کے ضمن میں اہل معرفت نے ایک باریک نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ خداوند تعالی کا ارشاد ہے:

وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَ الْاِنْجِيْلَ وَ مَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَبِّهِمْ لَاَكَلُوا مِنْ فَوْقِهِمْ وَ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ

اگر اہل کتاب تورات، انجیل اور خدا کی طرف سے نازل کردہ احکام پر عمل کرتے تو وہ اوپر سے اور نیچے سے روزی تناول کرتے۔

یہ آیت کریمہ جس طرح رزق ظاہری کو شامل ہے باطنی رزق کو بھی بیان کر رہی ہے البتہ باطنی روزی کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ الہامات الٰہی ۲۔ وہ علم جو سیر و سلوک سے انسان کو نصیب ہوتا ہے۔ وہ علم جو انسان

مدرسے سے حاصل کرتا ہے ہرگز باطنی رزق میں داخل نہیں ہے بلکہ مادی رزق کا حصہ ہے۔ یعنی جس طرح ایک شخص یونیورسٹی میں داخلہ لیتا ہے پڑھ لکھ کر کچھ معلومات حاصل کرتا ہے اور پھر ان کے سہارے مال و دولت کماتا ہے۔ ایسے ہی جو شخص حوزہ علمیہ میں یا دانشگاہ میں علم حاصل کرتا ہے اور معلومات اکٹھی کرتا ہے اور وہ علوم جن کی وجہ سے انسان ،انسان کا دشمن ہو جاتا ہے مادی اور دنیوی علوم میں شمار ہوتے ہیں نہ کہ معنوی علوم میں-لہذا علم مدرسہ کو اہل معرفت خاطر میں ہی نہیں لاتے۔

علوم معنوی کی دو قسمیں بیان کی جاتی ہیں۔ایک قسم ان علوم معنویہ کی وہ ہے جو کسی رنج و زحمت کے بغیر ہاتھ آجاتے ہیں جنہیں الہامات کہا جاتا ہے۔ جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ

دولت آنست که بی خون دل آید بکنار

ورنه باسعی عمل باغ جنان این همه نیست

دولت وہ ہے جو خون دل پیئے بغیر ہاتھ آجائے ورنہ یہ سب باغ جنان سعی و عمل سے حاصل نہیں ہو سکتے۔

دوسری قسم ان علوم کی ہے جو سیر و سلوک ،جہاد بالنفس، مستحبی روزے رکھنے ،راتوں کو جاگنے ،کم باتیں کرنے ،غذا کم کھانے ،کسی کے ساتھ بد سلوکی نہ کرنے، کسی کی غیبت نہ کرنے ،مختصر کلام کرنے ،نماز شب پڑھنے وغیرہ جیسے سینکڑوں دوسرے راستوں سے حاصل ہوتے ہیں جنہیں علوم ذوقی کہا جاتا ہے۔

بعض طلاب ایسے مقام پر جا پہنچتے ہیں کہ تحصیل علم کے آغاز سے ہی جناب شیخ بہائی کے اشعار زیر لب پڑھتے رہتے ہیں۔

چونکہ علوم رائج فقط قیل و قال ہیں اور یہی مضامین جو جناب شیخ بہائی کے اشعار میں ہیں اور اہل دل طلاب کی گنگناہٹ ہیں امام خمینی کی معروف غزل میں بھی موجود ہیں جس میں امام کہتے ہیں کہ میں علم مدرسہ سے تھک گیا ہوں اور علم مدرسہ دنیاوی علوم کا حصہ ہے۔

چونکہ ممکن ہے کہ ایک شخص دس بیس سال کی محنت و مشقت کے بعد پڑھ لکھ کر

ایک ماہر طبیب یا زراعت کا ماہر بن جائے۔ ایسے ہی ممکن ہے ایک آدمی دس بیس سال کی زحمت سے حوزہ علمیہ یا دانش گاہ میں ایک عالم یا دانشور بن جائے۔ کیونکہ جو علم انسان کو خاکسار نہ بنائے' دنیا کی محبت اس کے دل سے نہ نکالے' انسان کو اہل معنی نہ بنائے' عالم غیب کی طرف انسان کی آنکھ نہ کھولے' ایسا علم کھیتی باڑی اور مویشی پالنے کے متعلق علوم کی طرح ہی ہے جو آخر عمر میں انسان بھلا بیٹھے گا۔ تمام فتنہ و فساد اسی علم کی وجہ سے ہے۔ امام خمینیؒ اپنی مذکورہ غزل میں اسی قسم کے علم مدرسہ کا رونا رو رہے ہیں ورنہ وہ علم جو سیر و سلوک سے انسان کو نصیب ہوتا ہے وہ تو ہر انسان کی آرزو ہے۔

پانچویں فصل

امام خمینیؒ نے اپنے وصیت نامے میں امت مسلمہ کو ادعیہ اور مناجات کے عالیشان مضامین و معارف کی طرف توجہ دلائی ہے اور دوسری طرف بڑی عالمی طاقتوں کے خلاف ایک مسلسل جہاد کی بھی دعوت دی ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ایک فرد یا ایک امت عارف بھی ہو اور جنگجو بھی ہو یعنی جو لوگ عرفانی خو رکھتے ہیں اور اہل مناجات ہیں آیا اہل نبرد و رزم بھی ہو سکتے ہیں یا نہیں ؟اس سلسلے میں امام خمینی کے وصیت نامے سے استفادہ ہوتا ہے کہ نہ فقط عرفان و جہاد کے مابین یکجہتی کا امکان ہے بلکہ ان کو ایک ساتھ رکھنا ضروری ہے۔ آپ کی علمی اور عملی سیرت سے بھی یہی استفادہ ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی میں یہ دونوں فضیلتیں موجود تھیں۔

انقلاب اسلامی کی جڑیں انبیاء و اولیاء الٰہی خصوصاً حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت حسنہ سے جاملتی ہیں۔

گزشتہ فصول میں بیان ہوا ہے کہ امام حسین علیہ السلام کی شجاعانہ روح کا راز آپ کی دعائے عرفہ ہے۔ چونکہ یہ وہی نرم و لطیف روح ہے جو ایک طرف دعائے عرفہ جیسی عظیم مناجات کرتی ہے اور دوسری طرف سے کربلا کا عظیم حماسہ بھی خلق کرتی ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ عواطف احساسات Sentiments غضب کے مقابلے میں ہیں لیکن دین اسلام دین احساسات نہیں بلکہ دین عقل Intellect ہے۔ عواطف اور غضب دونوں عقل کی حکومت میں عمل کرتے ہیں۔ عقل کبھی قساوت و سختی کا حکم دیتی ہے

اور کبھی نرمی کا۔لہذا یہ عین ممکن ہے کہ ایک امت بارگاہ حق میں اہل مناجات اور اہل گریہ و نالہ ہو لیکن ظالموں کے مقابلے میں استقامت نہ دکھائے۔ یہ جو کبھی نرم خوئی اور جنگ کے مابین تضاد نظر آتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جن دو سر چشموں سے ہر دو صفات جنم لیتی ہے ان میں تضاد آجاتا ہے۔ لیکن اگر وہ دونوں عقل کی طرف سے ہدایت پائیں اور ہر ایک اپنے مقام پر قرار پا جائے تو اس صورت میں نہ فقط ان میں اختلاف نہیں ہوگا بلکہ مکمل طور پر ایک دوسرے کے ساتھ ساز گار بھی ہوں گی۔ قرآن کریم نے عفوو درگزر اور جنگ اور مقدس سختی کو حقوقی مسائل میں ذکر کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

تعَاوُنُوا عَلٰی البرّ والتَّقوىٰ ولا تعَاوُنُوا اعلیٰ الاِثم والعُدوَان (1)

نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو لیکن گناہ اور عداوت میں آپس میں تعاون نہ کرو۔

قرآن کریم کا فرمان ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور ایک دوسرے سے درگزر کرو آپس کی خطاؤں کو خاطر میں نہ لاؤ۔

اسی طرح قرآن مجید نے خاندانی اور داخلی زندگی میں مودت اور رحمت کا حکم دیا ہے:

وَجَعَل بَینَکمُ مُوَّدَةً وَ رَحمته (2)

خدا نے تمہارے درمیان مودت ور حمت مقرر کی ہے۔

خاندانی زندگی کا آغاز زوج وزوجہ کے مابین مودت ور حمت سے ہوتا ہے تاکہ اولاد محبت ورحمت کے زیر سایہ تربیت پا سکے۔ ایسی طرح معاشرے کے بارے میں بھی قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اِنمُا المُئومِنُونَ اِخوُةُ‘ فَاصَلِحُوا بین اَخویکُمُ (3)

مومنین آپس میں بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان اصلاح کرو۔ لیکن جب احکام الٰہیہ کی بات ہوتی ہے تو وہاں پر سخت لہجے میں فرمایا کہ اگر بعض لوگ وعظ و نصیحت کے ذریعے ٹھیک نہ ہوں اور عفت عمومی کو نقصان پہنچائیں تو نظام عدالت الٰہی میں ان کی سزا کوڑے ہیں۔ ایسے افراد پر حد جاری کرتے وقت کچھ لوگ موقع پر حاضر ہو کر حکم الٰہی کا اجراء ہونا اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور ساتھ ہی فرمایا:

وَلَاتَاْخُذ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِى دِينِ اللّٰه (4)

اور دین خدا کے معاملے میں ان پر تمہیں رحم نہیں آنا چاہیے۔ یعنی حد جاری کرتے وقت تمہارا وہاں حاضر ہونا بھی ضروری ہے اور جن پر حد جاری ہو رہی ہے ان پر عدالت الٰہی کے مقابلے میں رحمدلی کا اظہار مت کرو چونکہ یہ ایک کاذب رقت ہے اور جھوٹی محبت اور غلط دوستی ہے۔ بنابریں وہی دین جو آپس میں محبت و مودت کا درس دیتا ہے وہی' حدود الہیہ کے اجراء میں عفوو درگزر سے منع کرتا ہے۔

ہتک حرمت اور عفت عمومی کی خلاف ورزی کی مانند دیگر مواقع پر بھی حکم یہی ہے مثلاً اگر کوئی شخص اقتصاد' سیاست یا امن عامہ میں خلل ایجاد کرے ایسا مجرم جب سزا پانے لگے تو تمہیں اس کے ساتھ اظہار ہمدردی نہیں کرنا چاہئے چونکہ یہ دین عقل ہے نہ کہ دین احساسات۔ اسی وجہ سے دین میں کبھی ہمدردی و عطوفت کا حکم ہے اور کبھی بے مہری اور قساوت کا۔ قرآن مجید کی اس آیہ میں نہی کی گئی ہے کہ:

وَلاَ تَاْخُذ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِى دِيْنِ اللّٰهِ (5)

آپ کو حق نہیں پہنچتا کہ ایسے مواقع میں ہمدردی کا اظہار کریں یا سفارش کریں اور واسطہ بنیں۔ عالم اسلام کے نامدار عارف جناب محی الدین ابن عربی نے کہا ہے کہ ذکر خدا جنگ سے بالاتر ہے۔ (6)

عارف موصوف کی یہ بات قابل توجیہ ہے چونکہ جنگ کے دو چہرے ہیں ایک کی بازگشت شہادت کیطرف ہوتی ہے اور دوسرا چہرہ نسل انسانی کی ہلاکت کا باعث ہے۔ ان کی

مراد یہ نہیں ہے کہ ذکر خدا شہادت سے بالاتر ہے چونکہ جہاد و شہادت و دفاع اور حدود کی حفاظت خود یاد خدا کا مصداق ہیں لہذا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ذکر خدا راہ خدا میں جہاد سے بالاتر ہے اور اگر ان کی مراد یہی ہو کہ ذکر خدا جہاد سے افضل ہے تو یہ ایک نادرست کلام ہے چونکہ خود دفاع یاد حق ہے اور دعوت خدا کی اجابت ہے۔ اس لئے کہ خود اللہ تعالیٰ نے ہمیں دشمنان دین کے خلاف جہاد کی دعوت دی ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ اس پر لبیک کہو پس اس دعوت حق پر لبیک کہنا بھی یاد خدا ہے۔ سورۃ مبارکہ انفال میں جنگ و دفاع کا قانون بیان کرنے کے بعد یوں فرمایا ہے:

یَا اَیُّھَا الَّذِینَ اٰمَنُوا اِستَجِیبُوالِلّٰہِ وَلِلرَّسُولِ اِذَا دُعَاکُم لِمَا یُحیِیکُم (7)

اے ایمان والو! اللہ اور رسول کی اس دعوت پر لبیک کہو جو تمہاری زندگی اور حیات کی خاطر ہے۔

یہ آیہ کریمہ جنگ و جہاد کے سیاق و سباق میں بیان ہوئی ہے یوں تو تمام احکام اسلامی حیات بخش ہیں۔ نماز، روزہ اور حج سب انسان کو زندگی عطا کرتے ہیں لیکن مذکورہ حکم نماز، روزہ یا حج وغیرہ کے بارے میں نہیں ہے بلکہ سورہ انفال میں جنگ و قتال کے تذکرے کے بعد بیان ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ تمہارے لئے حیات بخش ہے۔ تم عزت کے خواہاں ہو تو یاد رکھو کہ عزت حکومت الٰہی کے زیر سایہ ہی نصیب ہو سکتی ہے چونکہ اگر کوئی اجنبی دشمن تم پر حاکم بن گیا تو وہ پھر بنی اسرائیل کی مانند تمہاری عورتوں کو زندہ رکھنا اور تمہارے بچوں کو ذبح کرنا شروع کر دے گا۔

یُذَبِّحُونَ اَبنَآئَکُم وَیَستَحیُونَ نِسَآئَکُم (8)

بہت ہی افسوس کی بات ہے کہ جب ایران کی اسلامی تاریخ ہجری سے بدل کر منحوس شہنشاہی تاریخ مقرر کی جا رہی تھی تو پیغمبر اکرمؐ کا نام گرامی طاق نسیاں کے سپرد ہو رہا تھا۔ ان لوگوں نے صاف کہنا شروع کر دیا تھا کہ نبی کریمؐ کا نام نہ لو بلکہ دعوت ناموں کے اندر

کلمہ آغاز شاہ کا نام ہونا چاہئے۔ جس طرح ہم موحدین کا اعتقاد ہے کہ ہر عبادت اللہ کے نام سے شروع ہونی چاہئے لیکن ان گمراہوں اور خود فروش افراد نے اپنی عزت اس فرعون کے سامنے سر تسلیم ختم میں سمجھی۔

البتہ جو بھی زندہ رہنا چاہتا ہے اور عزت چاہتا ہے اسے چاہئے کہ راہ خدا میں دفاع کرے اور جہاد کرے۔

چونکہ یہ دین عقل ہے نہ کہ دین احساسات لہذا عقل کامل نے بارگاہِ حق میں گریہ و نالہ کا حکم بھی دیا ہے اور باطل کے مقابلے میں بے مہری اور سختی برتنے کا فرمان بھی دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب الٰہی انسانوں کی ستائش و تحسین کی ہے تو یوں فرمایا ہے:

يُجَاهِدُوْنَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَلاَ يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لاَئِمٍ

یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈرتے۔

دوسری طرف فرمایا کہ دین خدا کے معاملے میں ہمدردی و عطوفت کا اظہار مت کرو جو لوگ اس دستور پر عمل کرتے ہیں اللہ نے ان کی بھی ستائش کی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو فرمان خدا کے اجراء میں کسی کے ساتھ جھوٹی ہمدردی نہیں کرتے۔ جب ایک نظام عقل کے تحت قائم ہو جائے تو عقل تمام غرائز میں اعتدال قائم کر دیتی ہے اور خود عقل پر رنگ عشق چڑھ جاتا ہے انسان تمایلات کے حوالے سے امید رکھتا ہے اور گریز کے حوالے سے خوف رکھتا ہے۔ یہ خوف و رجاء ہر انسان میں موجود ہے لیکن ایک موحد شخص کے امید و خوف توحید کی اساس پر استوار ہوتے ہیں۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان کو خدا سے جتنی محبت ہو اتنا ہی اسکا خوف ہونا چاہئے اور محبّ کے خوف و رجاء میں اعتدال ہونا چاہئے۔

وَاِنِ اسْتَطَعْتُم اَنْ يَشْتَدّ خَوفُكُمْ مِنَ اللّٰهِ وَ اَنْ

يَحۡسُنَ ظَنّكُمۡ بِاللّٰهِ فَاَجۡمِعُوا بَيۡنَهُمَا (9)

شدت کے ساتھ خوف خدا پیدا کرو اور اس کی ذات کے بارے میں اچھا گمان رکھو۔ اگر ہو سکے تو ان دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کرلو۔

چونکہ جس کی امید خدا سے زیادہ ہوتی ہے اسکا خوف بھی خدا سے زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی خوف وامید دونوں کا ملجا فقط ذات خدا ہو نہ کوئی اور۔ جو فقط خدا سے ڈرتا ہے وہ کسی غیر کی پرواہ بھی نہیں کرتا فقط دین خدا کی حفاظت کے لئے کوشش کرتا ہے جو شخص دین کی خاطر کوشش نہیں کرتا بلکہ سکوت اور لاتعلقی اختیار کرلیتا ہے وہ ہرگز خوف میں موحد نہیں ہو سکتا۔

جو مفسرین اس طرح کا انداز فکر رکھتے ہیں وہ آیات الٰہی سے بھی ایسے ہی استفادہ کرتے ہیں وہ قرآن پر کوئی چیز ٹھونسنے سے پہلے خود قرآن سے کچھ حاصل کرتے ہیں۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

يَا اَيُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوا عَلَيۡكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ لَايَضُرُّكُمۡ مَنۡ ضَلَّ اِذَا اهۡتَدَيۡتُمۡ (10)

اے ایمان والو! تم اپنے نفوس کی اصلاح کرو اور اگر بعض لوگ گمراہ ہو جائیں تو ان کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاتی یعنی اگر تم اہل ہدایت بنو تو گمراہوں کی گمراہی تمہارے لئے نقصان دہ نہیں ہے۔

جو مفسرین خوف میں موحد نہیں ہیں انہوں نے اس آیت سے یہ استفادہ کیا ہے کہ ہر شخص اپنی فکر کرے اور اسے دوسروں کی کیا پڑی ہے۔ مفسرین کے اس طبقے نے اسی آیت کو سند قرار دیکھ دے کر مسئلہ امر بالمعروف اور نہی از منکر کو زمانہ مستقبل اور حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور کے ساتھ مخصوص قرار دیا ہے ان کے مطابق جب حضرت حجتؑ ظہور فرمائیں گے تو خود ہی امر بالمعروف اور نہی از منکر کریں گے۔ یہ جو بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ ہر آدمی اپنی قبر میں جائے گا اس کی وضاحت کی ضرورت ہے باوجودیکہ ہر

انسان ایک جدا دین و مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ آیا امر بالمعروف اور نہی از منکر اسلام کے بنیادی احکام میں سے ہے یا نہیں اور یہ کہ جہاد اور دفاع قرآن مجید کے قطعی اور یقینی فرامین میں سے ہیں یا نہیں اور جب ثابت ہو جائے کہ یہ اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہیں تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان اصولوں پر عمل کئے بغیر کوئی شخص ہدایت پا ہی نہیں سکتا تاکہ یہ کہا جائے اب اسے گمراہ لوگوں کی گمراہی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ یعنی جب تک انسان امر بالمعروف نہ کرے دفاع اور جہاد نہ کرے یا پھر قسط و عدالت کے قیام کے لئے کوشش نہ کرے وہ نہ صرف ہدایت یافتہ نہیں بلکہ بجائے خود گمراہوں میں سے ہے۔

لیکن جو مفسرین مقام خوف میں موحد ہیں وہ آیہ کریمہ سے توحیدی استفادہ کرتے ہیں نہ کہ ان لوگوں کی طرح جو خوف کے معاملے میں یا وثنی ہیں یا پھر ثنوی یعنی خدا اور غیر خدا دونوں سے ڈرتے ہیں۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ سے امید وہ شخص رکھ سکتا ہے جو اپنی امید کی حد تک خوفِ خدا بھی رکھتا ہو۔ علی علیہ السلام اہل تقویٰ انسانوں کے اوصاف شمار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وَلَا یَرَوْنَ مَرْجُوّاً فَوْقَ مَا یَرْجُوْنَ وَ لَا مَخُوفاً فَوْقَ مَا یَخَافُوْنَ (11)

اہل تقویٰ خدا سے ہٹ کر کسی سے امید نہیں رکھتے اور خدا سے بڑھ کر کسی سے ڈرتے بھی نہیں ہیں۔

انسان سے آگے اگر فرشتوں پر ایک نگاہ ڈالی جائے تو وہ بھی خوف و رجاء کے درمیان ہی نظر آئیں گے یعنی ملائکہ امیدوار بھی ہیں اور ہراساں بھی ہیں۔ اگرچہ فرشتہ کے اندر بہت زیادہ اچھائی کے پہلو ہیں لیکن وہ انہیں بڑا شمار نہیں کرتا چونکہ اگر اپنے خیر کے ان پہلوؤں کو بڑا شمار کرنا شروع کر دے تو اس کے اندر امید زیادہ ہو جائے گی اور جب امید کا پلہ

بھاری ہو جائے تو خوف کا پہلو کم ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے ذات خدا سے جو خوف ہونا چاہئے وہ ختم ہو جاتا ہے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَمْ يَسْتَعْظِمُوا مَامَضىٰ مِنْ اَعْمَالِهِمْ وَلَوِ اسْتَعْظَمُوا ذٰلِكَ لَنَسَخَ ذٰلِكَ الرَّجاءُ شَفَقَاتَ وَجَلِهِمْ (12)

ملائکہ کبھی بھی اپنے اعمال کو بڑا نہیں سمجھتے اور اگر ایسا کریں تو یہ امید ورجاء ان کے خوف کو ختم کر دے گی۔

امیر المومنین علیہ السلام کے کلام مبارک میں تین مطالب بیان ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک یہ ہے کہ امید اور خوف کے درمیان حتی المقدور بطور کامل ہم آہنگی پیدا کی جائے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوف وامید کا یکجا ہونا ممکن ہے۔

۲۔ علی علیہ السلام نے ان لوگوں کو نمونے کے طور پر متعارف کروایا ہے جن میں خوف ورجاء کے درمیان سازگاری کی فضیلت موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ اہل تقویٰ وہ لوگ ہیں جن کی امید کا ماویٰ فقط ذات خداوند ہے اور اس کے علاوہ کسی سے کوئی امید نہیں رکھتے۔ ان کے خوف کا ملجا بھی خداوند تعالیٰ کی ذات ہے اس کے علاوہ کسی سے ہراساں نہیں ہوتے۔

۳۔ تیسرا مطلب یہ ہے کہ علی علیہ السلام اپنے کلام میں انسان سے ایک قدم آگے بڑھ کر ملائکہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر ملائکہ کی امید خدا سے زیادہ ہو جائے تو انکا خوف کم ہو جائے گا۔ یعنی مخلوق کو مخلوق ہونے کے ناطے خدا سے جتنی امید رکھنی چاہئے اتنا ہی خدا سے خوف بھی ہونا چاہئے اور یہی شجاعت وعرفان کے درمیان ہم آہنگی بھی ہے پس جناب محی الدین ابن عربی نے جو کہا تھا کہ یاد خدا جنگ وجہاد سے بالاتر ہے قابل توجیہ ہے۔ چنانچہ خود ان کے کلام میں بھی اس توجیہ کے فراواں شواہد موجود ہیں۔ چونکہ حق تعالیٰ کے نام اور یاد حق تعالیٰ میں فرق ہے دل میں یاد حق اور لب پر نام حق رکھنا ہمارا فریضہ ہے۔ لہذا مجاہدین جب محاذ یا میدان قتال پر روانہ ہوتے تو روانگی کے وقت بسم اللہ وفی سبیل اللہ جیسے

کلمات اپنی زبان پر جاری کرتے یعنی رزم کے لئے اسلحہ اٹھاتے اور دل میں یاد حق میں مشغول رہتے تھے حضرت علی علیہ السلام نے آیہ کریمہ

وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ (13)

کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ لباس تقویٰ سے مراد زرہ، شمشیر، سپر اور نیزہ و تیر ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْجِهَادَ بَابٌ مِنْ اَبوَابِ الْجنتّه فَتَحَهُ اللّٰهُ لِغَاصتّه اَوْلِيَائِهِ وَ هُوَلبَاس التّقوٰى دِرعُ اللّٰهِ الْحَصِينَةَ وَجُنّتُهُ الْوثِيقته (14)

جہاد جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے جسے اللہ نے اپنے خاص اولیاء کے لئے کھولا ہے اور یہ جہاد ہی لباس تقویٰ ہے، یہی خدا کی زرہ ہے اور قابل اعتماد سپر ہے۔ جناب زید بن زین العابدینؑ نے بھی اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ (15)

ایک شجاع جنگجو اور حق کا دفاع کرنے والا شخص قرآن مجید سے ہمیشہ عرفان کے ساتھ ساتھ حماسہ و شجاعت کا استفادہ کرتا ہے۔

دوسروں کے نزدیک لباس تقویٰ اس تسبیح کو کہتے ہیں جس میں کوئی زحمت نہ کرنی پڑے لیکن جو اہل حماسہ و جنگ ہو اس کے نزدیک لباس تقویٰ راہ خدا میں زرہ پہننے سے عبارت ہے۔ علی علیہ السلام اور حضرت امام حسین علیہ السلام اس کا واضح نمونہ ہیں اور انہی معصومین کی اتباع اور ان کی تعلیمات کے سائے میں امام خمینی بھی ایسے ہی تھے۔ مذکورہ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مناجات اور جہاد میں کسی قسم کا اختلاف و نزاع نہیں ہے مستحب اعمال اور دفاع ایک دوسرے کو دفع نہیں کرتے بلکہ بنیادی طور پر قرآن کریم تو دفاع و جہاد کو عرفانی مراکز کی حفاظت کے لئے ضروری قرار دیتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ اگر جہاد نہ ہو تو گوشہ نشین راہب کا دیر ویران ہو جائے گا۔ جو لوگ اہل جنگ و جہاد نہیں ہیں بلکہ ان کے نزدیک ترک دنیا اور ترک خلق خدا آپس میں مخلوط ہو گئے ہیں جو ایسے لوگ اس نقطے

سے بے خبر ہیں کہ معاشرے کے اندر رہ کر لوگوں کے لئے دل سوزی سے کام کرنا دنیا داری نہیں بلکہ آخرت ہے۔ ان سب کو قرآن مجید نے خبردار کیا ہے کہ تم لوگ اہل جنگ نہیں بلکہ اہل تسبیح ہو لیکن یاد رکھو کہ جن کے ہاتھ میں نیزہ و شمشیر ہے اگر یہ لوگ نہ ہوں تو تمہارے ہاتھ میں تسبیح بھی نہیں رہے گی۔ چنانچہ اسٹالن اور لینن کے تباہ کن نظریے نے نہ صرف مساجد بلکہ کلیسا و صومعہ و دیر کو بھی ویران کر دیا تھا۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَ صَلَوَاتٌ وَ مَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ (16)

اگر خدا بعض لوگوں کے ذریعے دوسرے بعض لوگوں کو دفع نہ کرے تو کلیسا و کنیسہ، نمازیں اور مساجد جن میں اللہ کا نام لیا جاتا ہے، سب ویران ہو جائیں گے۔ یعنی اگر دفاع میں اگلی صفوں میں لڑنے والے اہل دفاع نہ ہوں تو نہ کوئی مسجد بچے گی نہ ہی کلیسا، نہ ہی دیر بچے گا نہ ہی کنیسہ۔ چونکہ مادہ پرستوں کے نزدیک جو چیز یادِ خدا کا موجب بنے وہ افیون ہے۔ ممکن ہے کسی شخص میں جنگ و جہاد کی خصلت موجود نہ ہو اسے چاہئے کہ مجاہدین کے لئے دعا کرے جس انسان کے اندر خوف و رجاء کے مابین اعتدال برقرار نہ ہو وہ خدا سے بھی ڈرتا ہے اور غیر خدا سے بھی۔

لہذا جب اس کے سامنے جنگ و جہاد سے مربوط آیات کی تلاوت کی جائے تو جواباً کہتا ہے کہ یہ آیات حضرت حجت (عج) کے زمانہ ظہور سے تعلق رکھتی ہیں جبکہ حضرت حجت سابقہ بیان کی روشنی میں ایسے لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو ان کی راہ میں جہاد کریں۔ حضرت امام صادق علیہ السلام سے مروی ہے کہ اگر تم حضرت ولی عصر (عج) کے ظہور کے منتظر ہو تو تیر اندازی سیکھو چونکہ ایک مسلح انسان ہی منتظر ہو سکتا ہے جس نے اپنے آپ کو تیر اندازی یا (فائرنگ) کے لئے تیار نہیں کیا اس کا انتظار جھوٹا ہے حقیقی نہیں ہو سکتا۔ امام صادق علیہ السلام کا فرمان ہے:

لِيُعِدّ اَحَدُ كُمُ لِخُرُوجِ الْقَائِمِ وَلَوْسَهماً (17)

تم میں سے ہر ایک اپنے آپ کو قائم آل محمدؐ کے خروج کے لئے آمادہ کرے اگرچہ ایک تیر ہی کی حد تک سہی۔ حضرت حجت (عج) جب ظہور فرمائیں گے تو سب سے پہلے جنگ کریں گے ورنہ اگر اہل جنگ نہ ہوں تو انہیں شہید کیوں کیا جائے گا۔ بنابریں عرفان و جنگ ایک دوسرے کے ہرگز مخالف نہیں ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے اٹلی میں عارف نامور جناب محی الدین ابن عربی کے سات سو پچاسویں یوم وفات کی مناسبت سے ایک سیمینار منعقد کیا گیا۔ اگرچہ معمول یہ ہے کہ اس قسم کے خراج تحسین کے یادگاری اجتماعات صدی کے اختتام پر منعقد کئے جاتے ہیں لیکن استثنائی طور پر یہ سیمینار سات سو پچاسویں یوم وفات پر اس لئے منعقد کیا گیا کہ ابن عربی کو ایک ایسے عارف کے طور پر پیش کریں کہ جن کا حماسہ و شجاعت سے کوئی تعلق نہیں تھا اس بنا پر کہ عرفان کا شجاعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن ان کی یہ کوشش بالکل غلط تھی ان کے گمان میں عرفان کا حماسہ و جنگ سے کوئی تعلق نہیں نیز یہ کہ عرفان صلح کل کا نام ہے۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ عرفان صلح کل کا نام ہے لیکن ایسی صلح کل جس کے یہاں جنگ بھی صلح ہے۔ عرفان کے اندر زندان ایک اچھی چیز ہے جنگ بھی ایک اچھی چیز ہے جیسا کہ عارف جنہم کو بھی خیر کہتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ جہنم نہ ہو یا زندان نہ ہو کیونکہ اگر جہنم نہ ہوتی تو بہت سارے لوگ فساد میں مبتلا ہو جاتے جو کہ آج جہنم کے خوف سے اچھے انسان بنے ہوئے ہیں۔ (18)

اٹلی کے مذکورہ سیمینار میں ان دو مطالب کو مخلوط کر کے پیش کیا گیا ہے اسی وجہ سے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ عارف اہل صلح ہے نہ کہ اہل جنگ۔ حالانکہ شرکاء سیمینار اس نکتے سے غافل تھے کہ عارف صلح کل کو مانتا ہے لیکن جنگ کو بھی صلح کہتا ہے اور جہنم و زندان کو بھی صلح کہتا ہے چونکہ اس کی نگاہ بہت وسیع ہوتی ہے۔

گزشتہ فصول میں بیان میں ہوا ہے کہ متکلم اور فیلسوف جب انسان کامل کے متعلق گفتگو کرتے ہیں تو فقط نبوت اور رسالت کی قلمرو میں بحث کرتے ہیں ان کا استدلال یہ ہے

کہ بشر کو نبی اور پیغمبر کی ضرورت ہے یا معاشرے کو رسول کی ضرورت اس لئے ہے چونکہ بشر کو قانون کی ضرورت ہے اور اگر کوئی انسان قانون بنائے تو لامحالہ اپنے فائدے کا قانون بنائے گا لہذا قانون خداوند تعالیٰ کی ذات مقدس بنائے پھر اسے انبیاء کے ذریعے انسانی معاشرے تک پہنچائے۔ فی زمانہ جو قوانین اقوام متحدہ میں بنائے گئے ہیں اور ان پر عمل ہو رہا ہے بڑی طاقتیں انہیں اسی وجہ سے پسند کرتی ہیں۔ ایران میں بھی شاہی دور میں چونکہ سرمایہ دار نمونہ ہوتا تھا لہذا ایسے قوانین بنائے جاتے تھے جو معاشرے کو سرمایہ داری نظام کی طرف لے جاسکیں۔ پس ہر قانون ساز ایسا قانون بناتا ہے جو اس کے نفع میں ہو لہذا سود خور انسان ہمیشہ یک طرفہ قانون ہی بنائے گا جبکہ قانون اس طرح کا بنانا چاہئے جس میں تمام افراد کا فائدہ ملحوظ رکھا جائے۔ علم کلام اور فلسفہ میں اس قسم کے مطالب نبوت کی ضرورت پر دلیل کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں لیکن جب عارف انسان کامل کے متعلق بحث کرتا ہے تو فقط معاشرے کی اصلاح کے درپے نہیں ہوتا بلکہ اس کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ ہمیں خلیفۃ اللہ کی ضرورت ہے اور ایسے انسان کامل کی ضرورت ہے جو انسانی معاشرے کو بھی چلا سکے اور انسان کے علاوہ دیگر موجودات کو بھی سنبھال سکے یہی نہیں بلکہ ملائکہ کو بھی تعلیم دے سکے۔ پس عارف انسان کامل کا خواہاں ہے جو فرشتوں کو بھی ان کے علوم سے آشنا کرے۔ فیلسوف انسان کامل کو **وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَتَه** (19) کی حد تک قرار دیتا ہے لیکن عارف اسے **وَعَلَّمَ آدَمَ الأَسْمَاءَ كُلَّهَا** (20) کے مرتبے میں سمجھتا ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ عارف کی نگاہ بہت وسیع ہے وہ کائنات کو اپنی اسی وسیع نگاہ کے ساتھ صلح کل کے طور پر دیکھتا ہے اس کے نزدیک جو کچھ موجود ہے وہ خیر ہے اس کے نزدیک جہنم بھی اچھی جگہ ہے باوجودیکہ توصیف جہنم میں آیا ہے کہ **دَارٌ لَيْسَ فِيهَا رَحْمَةٌ وَلَا تُسْتَمَعُ فِيهَا دَعْوَةٌ** (21)

جہنم ایسا گھر جس میں نہ رحمت ہے نہ کسی کی فریاد سنی جائے گی لیکن اگر جہنم نہ ہوتی تو بہت سے ایسے لوگ جو اس کے خوف کی وجہ سے گناہ نہیں کرتے گمراہ ہو جاتے بلکہ اہل

بہشت بھی جہنم کو دیکھ کر قدردانی کریں گے کہ تو نہ ہوتی تو شاید ہم بھی تباہ ہو جاتے۔ وہ لوگ جو زندان کے خوف سے گناہ نہیں کرتے انہیں زندان کی قدردانی کرنی چاہئے اگرچہ زندان کو ایک اسکول کے مقابلے میں دیکھا جائے تو بہت بری جگہ ہے لیکن پورے ملک کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بہت ہی مناسب جگہ ہے تو جیسے کوئی ملک زندان کے بغیر نہیں ہو سکتا چونکہ تمام لوگ پارسا نہیں ہوتے اسی طرح یہ کائنات بھی جہنم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ چونکہ تمام انسان پرہیزگار نہیں ہوتے پس جہنم کا ہونا ضروری ہے۔ اسی وجہ سے عارف جہنم کو جمال کے عنوان سے ایک اور رخ سے دیکھتا ہے۔ (22) قرآن کریم نے سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ کی تمام نعمتیں شمار کی ہیں بلکہ یہ مکمل سورہ فقط نعمتیں بیان کرنے کے لئے ہی ہے اسی وجہ سے اس کا آغاز بھی اسم مبارک الرحمان سے ہو رہا ہے نہ کہ القہار سے یہ بتانے کے لئے کہ اس سورہ میں فقط رحمانیت خدا کا پہلو ہے۔ چنانچہ خدائے رحمان کی اولین رحمت قرآن کریم ہے اور خود ذات خداوند تعالیٰ معلم قرآن ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

اَلرَّحمٰنُ عَلَّم القُرآنَ خَلَقَ الاِنسَانَ عَلَّمَهُ البَیَانَ

رحمان جس نے قرآن سکھایا انسان کو خلق کیا اور اسے بیان کی تعلیم دی۔

یعنی جو بھی قرآن پڑھ لے وہ انسان ہوتا ہے اور جب انسان بن جائے تو اسکا کلام بیان ہوتا ہے۔ چنانچہ جو قرآن نہ جانتا ہو وہ انسان نہیں ہے اور جو انسان نہ ہو اس کا کلام مبہم ہوتا ہے جیسے بہائم ہیں چونکہ ان کی بات واضح نہیں ہوتی۔

اس کے بعد آسمانی اور زمینی نعمتوں کو شمار کرنا شروع کیا حتی کہ جہنم کو بھی انہی نعمتوں کے زمرے میں شمار کیا اس سورہ مبارکہ کا ترجیح بند یہ ہے۔

فَبِاَیِّ آلاَءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبَانِ

یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں تم دونوں اسکی کونسی نعمت کا انکار کرو گے؟

لہٰذا بہشت کا تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ خدا کی نعمت ہے اور تم اس کی کونسی نعمتوں کا انکار کرو گے ایسے ہی جنت کے اندر موجود پھلوں کا ذکر کیا اور بعد میں جب جہنم اور اس کی

پگھلی ہوئی دھاتوں کا ذکر کیا تو بھی یہی فرمایا۔

وَیُرسَلُ عَلَیکُمُ شُوَاظٌ مِنُ نَارٍ وَ نُحَاسٌ فَلاَ تَنتَصِرَانِ فَبِاَیّ الاَءِ رَبّکُمَا تُکَذّبَانِ

تمہارے اوپر آگ کے شعلے اور پگھلا ہوا پیتل ڈالا جائے گا اور تمہاری کوئی مدد بھی نہیں کی جائے گی۔ پس تم اللہ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے۔

یعنی جب یہ پگھلا ہوا پیتل تمہارے سروں پر ڈالا جائے گا تو کتنا ہی اچھا ہوگا پس یہ عذاب بہت ہی اچھا ہے اور یہ نعمت ہے جو بہت عالیشان ہے۔

قرآن میں خداوند تعالیٰ نے جو آیات نازل کی ہیں وہ عرفاء کے لئے بھی ہیں حکماء و متکلمین کے لئے بھی ہیں اور عام لوگوں کے لئے بھی ہیں چونکہ قرآن ھدی للناس ہے۔(23) قرآن مجید میں کوئی ایسا مطلب نہیں ہے جسے کوئی نہ سمجھ سکے باوجود اس کے کہ اس آسمانی کتاب میں کتنی ہی ایسی عمیق و دقیق آیات ہیں جنہیں عام لوگ سمجھنے سے قاصر ہیں۔ لیکن یہی عمیق مطالب قرآن کریم کے اندر کسی دوسرے مقام پر بہت ہی سادہ مثال کی صورت میں بھی بیان ہوئے ہیں جنہیں آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سادہ لوگ عمیق مطالب کو مثال کے قالب میں ہی سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں۔

البتہ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں ان کے درمیان فرق کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

ایک یہ کہ قرآن کریم میں ایسی آیات بھی ہیں جنہیں خواص کے علاوہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

دوسرے یہ کہ قرآن کریم میں ایسا کوئی مطلب نہیں ہے جسے عام افراد نہ سمجھ سکتے ہوں یعنی خداوند تعالیٰ نے ان عمیق آیات کے مطالب کو عام لوگوں کے لئے سادہ مثالوں کی شکل میں بیان کر کے قابل فہم بنا دیا ہے اور

وَعَلّمَ آدَمَ الأَسمَاءَ کُلّهَا

کو عرفاء اپنے لئے محور بحث قرار دیتے ہیں اسی طرح دیگر آیات کریمہ کو دوسرے علوم

سے تعلق رکھنے والے افراد پڑھتے ہیں۔ لیکن قرآن نے ان سب کو ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔

عارف یہ نہیں کہتا کہ شیطان نہ ہو بلکہ اس کا کہنا یہ ہے کہ شیطان کا ہونا خیر ہے چونکہ ہر انسان شیطان کے ساتھ جنگ و نبرد کے بعد ہی کسی مقام تک پہنچ سکتا۔ ہے اگر شیطان نہ ہوتا تو شیطان کا وسوسہ بھی نہ ہوتا اور اگر شیطانی وسوسہ نہ ہوتا تو انسان کے اندر کوئی جنگ نہ ہوتی جس کی وجہ سے کوئی شخص بھی کسی بہتر مقام تک نہ پہنچ سکتا۔ اگرچہ ہمیں یہ حکم ہے کہ شیطان پر لعنت کریں اور اسے دھتکاریں' شیطان اور اس کے پیروکاروں کا اہل جہنم میں سے شمار کریں اور اس سے خدا کی پناہ مانگیں لیکن یہی شیطان مظہر اضلال حق ہے۔ یعنی خدا جب بھی کسی کو پکڑنا چاہے تو اس تعلیم دیدہ سدھائے ہوئے کتے کے ذریعے ہی پکڑتا ہے۔

شیطان نظام خلقت میں ایک سدھایا ہوا کتا ہے لہٰذا ہر ایک پر نہیں بھونکتا اور ہر ایک کو کاٹتا بھی نہیں ہے پس کُل کائنات کے نظام میں شیطان کا ہونا بھی ایک رحمت ہے۔ چونکہ اگر کسی شخص کے پاس تربیت یافتہ کتا ہو تو باوجودیکہ وہ ایک کتا ہے جو نجس العین اور حرام ہے لیکن اس کے باوجود اس کی خدمات بھی ہیں' شیطان عام لوگوں پر بھونکتا ہے لیکن انبیاء لوگوں کو بتاتے ہیں کہ اسکے بھونکنے کی طرف توجہ نہ کرو اولیاء بتاتے ہیں کہ اس کے خلاف جنگ کرو اور اس کا مقابلہ کرو لہٰذا اگر کوئی شخص اس کی طرف توجہ نہ کرے اور ہادیان الٰہی کے بتائے ہوئے راستے پر چلتا رہے تو یہ اس پر بھونکنا بھی چھوڑ دیتا ہے بلکہ عقب پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ چونکہ یہ خناس ہے لہٰذا اس کا طریقہ کار یہ ہے کہ ایک پاؤں آگے بڑھاتا ہے اور ایک پاؤں پیچھے رکھتا ہے تاکہ فرار ہو سکے۔

علی علیہ السلام شیطان کی تصویر پیش کرتے ہوئے بیان فرماتے ہیں کہ شیطان ایک بزدل چور کی مانند ہے جسکے دونوں پاؤں ایک ساتھ نہیں ہوتے بلکہ ایک پاؤں آگے اور دوسرا پاؤں فرار کے لئے پیچھے ہوتا ہے۔ (24)

پس اگر تم اس کی طرف سے ہوشیار رہو اور اس پر نگاہ کرو تو وہ فرار کر جائے گا اگر بلند آواز نکالو تو بھی بھاگ جائے گا اور اگر اعوذ باللہ کہہ دو تو بھی الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہو گا چونکہ وہ ہمیشہ فرار کے لئے تیار رہتا ہے۔

جب وہ بھونک رہا ہوتا ہے تو آپ اس سے اللہ کی پناہ مانگ لیں وہ ایک کونے میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے۔ پہلے وسوسے کرتا تھا اب خناسی کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ایک کونے میں

دبک کر بیٹھ جاتے ہیں یہ ان کی خصلت خناسی کی وجہ سے ہے۔ شیطان جب سامنے آتا ہے تو

اَلَّذِی یُوَسْوِسُ فِی صُدُوْرِ النَّاسِ

کا مصداق ہوتا ہے اور جب انسان اس کے ہاتھوں اللہ سے پناہ مانگتا ہے اور اسے دھتکارتا ہے تو وہ ایک کونے میں دبک کر چھپ جاتا ہے لہٰذا اس وقت اسے اسیر کرنا آسان ہوتا ہے۔ شیطان کو اسیر کرنے کے بعد انسان سکون محسوس کرتا ہے۔

لہٰذا انبیاء شیطان کو اسیر بنا لیتے تھے۔ اس کے مقابلے میں شیطان کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو اسیر بنالے۔ اندرونی اور بیرونی جنگ میں یہی فرق ہے کہ بیرونی جنگ میں دشمن کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو مار دے یا اسیر بنالے لیکن اندرونی جنگ میں شیطان انسان کو ختم نہیں کرنا چاہتا چونکہ اس کام سے اسے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ انسان کو اپنا اسیر بنالے اسے اپنے کاموں کے لئے آلہ کار بنالے۔ لہٰذا پوری کوشش کرتا ہے کہ انسان زندہ اسکے ہاتھوں اسیر بن جائے اور معصومؑ کے اس فرمان کے معنی بھی یہی ہیں کہ:

کَمْ مِنْ عَقْلٍ اَسِیْرٍ تَحْتَ هَوًی اَمِیْرٍ (25)

کتنی ہی ایسی عقلیں ہیں؟ جو خواہشات کی اسیر ہیں۔ بنابریں انبیاء کی کوشش ہے شیطان اسیر بن جائے لہٰذا رسول اکرمؐ نے فرمایا:

اِنَّ شَیْطَانِیْ اَسْلَمَ عَلٰی یَدِیْ (26)

میں نے شیطان کو اسیر بنالیا ہے وہ میرے ہاتھ پر تسلیم ہو گیا ہے۔

حاصل یہ کہ اگر انسان دید معرفت پیدا کرلے تو وہ بدترین مقام یعنی جہنم کو بھی کُل کائنات کے نظام میں خیر سمجھتا ہے۔ وہ جہنم اور شیطان کے ہونے کو اصل کائنات کے نظام میں ضروری قرار دیتا ہے۔

اٹلی اور یورپ کی غلطی یہی ہے کہ انہوں نے سمجھا شاید عرفان جنگ کی نفی کرتا ہے جبکہ وہ اس نکتے سے غافل ہیں کہ عارف کے نزدیک جنگ و دفاع خیر ہیں۔ عارف ہرگز جنگ و جہاد کی نفی نہیں کرتا۔

چھٹی فصل

خالص عرفان نہ فقط جہاد و جنگ کے ساتھ سازگار ہے بلکہ عرفان ہمیشہ دفاع کے ہمراہ ہوتا ہے۔ عارف اس شخص کو کہتے ہیں جو کائنات کے اندر وقوع پذیر ہونے والے ہر حادثے کو جمال و حسن کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو دینی احکام سے دفاع کرنے کو زیبائی کے عنوان سے نگاہ کرتا ہے اور جس کے نزدیک جنگ ایک مقدس امر ہوتا ہے۔ انسان اگر اہل جنگ و دفاع نہ ہو تو لا محالہ گوشہ نشین ہوگا لیکن یہ گوشہ نشینی علم و معرفت سے ہے نہ کہ دنیا سے اور کبھی انسان جنگ کو دین کے دفاع کے لئے ایک زیبا و حسین چیز قرار دیتا ہے۔کائنات میں ویسے تو کوئی چیز بھی بری اور بد نما نہیں ہوتی ہے۔ خصوصاً دینی حدود سے دفاع کرنا تو نہ صرف برا نہیں ہے بلکہ بہت ہی خوبصورت بھی ہے عارف چونکہ اہل صلح کل ہے لہذا جنگ کو بھی صلح ہی سمجھتا ہے چنانچہ جہنم کو ضروری قرار دیتا ہے۔ دوزخ کے بارے میں ہر گز ناروا کلمات استعمال نہیں کرتا۔ عارف تو شیطان کو بھی نظام کائنات کی تکمیل کے لئے ضروری گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں کوئی چیز بالذات نسبی شر نہیں ہے اگر کہیں شر نظر بھی آتا ہے تو وہ نسبی ہے (یعنی کوئی چیز اپنی ذات میں شر نہیں ہے بلکہ بعض چیزیں دوسری بعض چیزوں کی نسبت شر ہیں)۔

عارف اور غیر عارف میں یہی فرق ہے کہ غیر عارف انسان میں رحمت و غضب یا تو ہم پلہ ہوتے ہیں یا پھر غضب رحمت سے آگے اور اس کا امام ہوتا ہے لیکن عارف کے اندر اس کی رحمت آگے اور اس کے غضب کی امام ہوتی ہے۔ اس فرق کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

اگر انسان کے اندر موجود خواہشات میں اعتدال نہ ہو تو ایسی حالت میں انسان کا

غضب دیگر غرائز کا امام اور حاکم بن جاتا ہے۔ لہذا جیسا بھی غضب کا فرمان ہو انسان ویسا ہی عمل کرتا ہے اور جہاں اس کا کوئی فرمان نہ ہو انسان خاموش اور ساکن رہتا ہے۔ جب غضب کسی پر غالب آجائے تو ایسا انسان مکمل درندہ بن جاتا ہے جو غضب اور درندہ خوئی کی اساس پر کام کرتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کے اندر غضب اور رحمت ہم پلہ ہوں تو دونوں میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے لئے حاکم اور سلطان نہیں ہوتا کبھی غضب کا حکم چلتا ہے اور کبھی رحمت کا فرمان چلتا ہے۔ ایسا انسان دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے اور ایسے شخص کی مانند ہے جس نے اپنے لئے کوئی راستہ منتخب نہیں کیا ہے۔

تیسری حالت ان الٰہی انسانوں کی ہوتی ہے جن کی رحمت ان کے غضب کی رہنما اور اس پر حاکم ہوتی ہے یہ لوگ

یَامَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُهٗ غَضَبَهٗ (1)

(اے وہ ذات جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے) کے مظہر ہوتے ہیں۔ایسے لوگ جن کے غضب کی رہبری ور ہنمائی رحمت کے ہاتھوں میں ہوتی ہے ان کا کام ہمیشہ دوسروں کے ساتھ مہر و محبت اور وفاداری کرنا ہے۔ دوسروں پر مہربانی کرنے کا ایک فرعی اور ثانوی تقاضا یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے راستے سے کانٹوں کو ہٹایا جائے اور کسی کے راستے سے کانٹے ہٹانا رحمت کہلاتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ذات میں بھی رحمت غضب کی امام ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی رحمت غضب سے زیادہ ہے چونکہ خداوند تعالیٰ کی ذات اقدس میں دو رحمتیں ہیں۔

۱۔ ایک رحمت خاصہ ہے جو غضب کے مقابلے میں ہے۔

۲۔ ایک رحمت عامہ ہے جو مطلقہ ہے اور اس کا کوئی مقابل نہیں ہے۔

رحمت مطلقہ ہدایت مطلقہ کی مانند ہے اس کے مقابلے میں کوئی ثابت اور موجود چیز واقع نہیں ہوتی بلکہ اگر کوئی مقابل فرض بھی کیا جائے تو وہ عدم اور نیستی ہے خداوند تعالیٰ جب

اپنی رحمت مطلقہ کی اساس پر کائنات میں رحمت نازل کرے تو کبھی غضب کی صورت میں نازل کرتا ہے اور کبھی رحمت خاصہ کے طور پر۔ یہ رحمت کے تقاضے پر موقوف ہے کہ کس شکل میں رحمت نازل ہوتی ہے۔ چونکہ کبھی رحمت کا تقاضا مہربانی، وفاداری اور نرمی ہے جبکہ کبھی اسی رحمت کا تقاضا بے مہری، جنگ اور دفاع ہے۔ اسی وجہ سے قرآن مجید نے خداوند تعالیٰ کے حکم جلال یعنی قصاص کو جمال کی شکل میں پیش کیا ہے چونکہ جمال خداوند ہی جلال کا رہنما و امام ہے جس طرح خداوند کی رحمت اس کے غضب کی امام ہے۔ قرآن مجید کا فرمان ہے کہ اگر تم نے قصاص کے حکم پر عمل کیا تو اس سے معاشرے اور اجتماع کی حیات محفوظ ہو جائے گی۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (2)

اے صاحبان عقل! قصاص کے اندر تمہاری حیات ہے۔

قصاص خداوند تعالیٰ کا قہر آمیز حکم ہے اور ایسے احکام کو احکام جلالیہ کہتے ہیں لیکن چونکہ جلال حق جمال حق کے ساتھ مخلوط ہے لہذا یہ حکم بیان فرمایا کہ قصاص میں تمہاری حیات ہے یعنی قاتل کو سزائے موت دینا غضب الٰہی نہیں بلکہ خدا کا مہر ہے۔ دفاع اور جہاد کے بارے میں یہی حکم ہے چنانچہ قرآن مجید نے جہاد کو بھی عامل حیات قرار دیا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيكُمْ (3)

اے ایمان والو! اللہ اور اس کے رسولؐ کی آواز پر لبیک کہو جب وہ تمہیں بلائیں (کیونکہ) اسی میں تمہاری حیات ہے۔

اگر خداوند تعالیٰ تمہیں جہاد و دفاع کی طرف بلائے تو یہ قانون جلال و غضب کے تحت ہے لیکن اس میں جمال کا پہلو بھی ہے اور وہ تمہاری حیات ہے۔ انفرادی مسائل ہوں یا اجتماعی مسائل جلال الٰہی ہمیشہ جمال الٰہی کے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے لہذا رحمت حق ہمیشہ

غضب حق سے پہلے اور مقدم ہے۔ صدر اسلام میں کئی خونریز جنگیں لڑے جانے کے باوجود خداوند تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کو رحمت اللعالمین کے طور پر متعارف کروایا چنانچہ فرمایا:

وَمَا اَرسَلنَاكَ اِلاَّ رَحمَةَ لِلعَالَمِينَ

ہم نے تمہیں عالمین کے لئے فقط رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

ذات خداوندی کے مظاہر یعنی اولیاء و انبیائے الٰہی بھی اس صفت میں ذات خدا کی مثل ہیں اور ان میں بھی رحمت کا غضب پر غلبہ ہوتا ہے۔ (4) انبیاء اور اولیاء عظام کے مخلص شاگردان یعنی عرفاء میں بھی رحمت کا غضب پر غلبہ ہوتا ہے۔ لامحالہ عرفان بھی جنگ و دفاع کے ساتھ سازگار ہو جاتا ہے چونکہ عارف کا غضب اس کی رحمت کا غماز ہوتا ہے۔

رحمت کے غضب سے پہلے اور اس کے امام ہونے کی علامت یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے عارف اسلحہ نہیں اٹھاتا اور اگر اسلحہ اٹھا بھی لے تو جہاں تک ہو قتل نہیں کرتا اگر بعض کو قتل بھی کر دے تو باقی افراد کو معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اگر جنگ کی زمام غضب کی اختیار میں ہو اور غضب رحمت کا امام بن جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غضبناک حکمران جہاں تک ہو سکے اسلحہ سے کام لیتے ہیں جتنا ممکن ہو قتل کرتے ہیں اور غلبہ پانے کی صورت میں ممکنہ حد تک دوسروں کو قیدی بنا لیتے ہیں۔

موجودہ دنیا میں غضب رحمت پر غالب ہے جس کا نتیجہ یہ ماڈرن درندگی ہے جو محتاج تشریح نہیں ہے لیکن سیرت انبیاء و اولیاء میں اس کے برعکس غضب پر رحمت کی حکومت ہوتی ہے۔

قرآن کریم نے یہ دونوں نمونے ذکر کئے ہیں ایک انبیاء و اولیاء کا اور دوسرا ظالم سلاطین کا۔ انبیاء کے بارے میں فرمایا ہے کہ اگر انہیں اقتدار اور قدرت نصیب ہو تو یہ رحمت کا رویہ اپناتے ہیں اور دوسروں کو معاف کر دیتے ہیں جبکہ وہ سلاطین جن پر غضب کی حکومت ہے ،ان کے بارے میں فرمایا:

اِنّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً اَفْسَدُوهَا وجَعَلُوا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلّة (5)

سلاطین اور بادشاہوں کی سیرت ہے کہ جب بھی کسی آبادی یا سرزمین میں داخل ہوتے ہیں تو فساد برپا کرتے ہیں اور اس کے باسیوں میں سے جو عزت دار ہوں انہیں ذلیل بنا دیتے ہیں۔

یعنی جو بھی ان کے ہاتھ چڑھتا ہے گردن اڑا دیتے ہیں۔ اس آیت کریمہ کا ابتدائی حصہ قول خداوند نہیں ہے لیکن بعد کا حصہ بظاہر قول حق تعالیٰ ہے۔ اگر بہ فرض یہ بھی قول خدا نہ ہو تو بھی قرآن نے اسے نقل کیا ہے اور نقل کرنے کے بعد اسے رد نہیں کیا اور باطل بھی قرار نہیں دیا بلکہ نقل کر کے قرآن ساکت ہے تو اس سکوت سے گویا اس کے صحیح ہونے کی تصدیق کر دی ہے۔ لیکن قرآن کریم جب انبیاء اور اولیاء الٰہی کی سیرت بیان کرتا ہے تو یوں فرماتا ہے کہ یہ لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں چنانچہ سیرۃ مبارکہ نبوی ص میں نقل ہوا ہے کہ جب رسول اللہؐ فتح مکہ کے موقع پر شکست خوردہ اور مغلوب لوگوں سے مخاطب ہوئے تو یوں فرمایا۔

اِذْهَبُوا اَنْتُمُ الطُّلَقَاءُ (6)

جاؤ تم سب آزاد ہو۔

بعض جنگوں میں اگرچہ نبی اکرم ص کو کافی تکلیف بھی پہنچی اور لوگوں نے بددعا کرنے کو کہا تو ان کے جواب میں آپ نے فرمایا:

لَمْ اُبعثْ لَعّاناً بَلْ بُعِثْتُ داعِياً وَ رَحْمَةً اَللّهُمّ اهْدِ قَوْمِي فَاِنّهُمْ لاَيَعْلَمُوْن(7)

میں لعنت کرنے والے کے طور پر مبعوث نہیں ہوا بلکہ داعی اور رحمت کے عنوان سے مبعوث ہوا ہوں خدایا میری قوم کو ہدایت فرمایا چونکہ یہ علم نہیں رکھتے۔ دوسرا نمونہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے دنیا میں آپ نبی رحمت و پیغمبر صلح کے نام سے جانے جاتے

ہیں اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ اہل جنگ و جہاد نہیں تھے یا حکومت اور سیاست سے آپ کو کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ یہ اس وجہ سے ہے کہ آپ کی رحمت آپ کے غضب کی امام و رہبر تھی اور آپ کے غضب پر رحمت کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ اصولی طور پر یہ تو ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک انسان پیامبر خدا ہو اور حکومت تشکیل نہ دے۔ چونکہ معاشرہ انبیاء کا محتاج ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ معاشرے کو قانون کی ضرورت ہے نبوت کی ضرورت پر عقلی دلیل بھی یہی ہے کہ انسانی معاشرے کو قانون کی ضرورت ہے اور یہ خود مفاد پرست انسان نہیں بنا سکتا لہذا ذات خداوندی قانون بنائے۔

چنانچہ امام صادق علیہ السلام سے جب پوچھا گیا کہ انسان کو نبوت کی ضرورت کیوں ہے۔ تو آپؑ نے جوابؑ میں فرمایا لوگوں کی تدبیر خدا کے ہاتھ میں ہے جبکہ تمام افراد کی خدا تک دسترس نہیں ہے لہذا خدا اور خلق کے درمیان ایک رابطے کی ضرورت ہے اور وہ پیامبر ہے۔

یہ وہی برہان ہے جو متکلمین اور فلاسفہ نبوت کی ضرورت پر پیش کرتے ہیں معلوم ہوا یہ برہان انہوں نے اہل البیت علیہم السلام سے حاصل کی ہے جسے امام صادق علیہ السلام نے حکمت الہٰیہ کی وساطت سے تدوین اور بیان فرمایا ہے۔

اس بیان کی روشنی میں انسانی معاشرے کو انبیاء کی ضرورت قانون اور اس کے نفاذ کی خاطر ہے اور اسی کو حکومت کہتے ہیں چونکہ اگر قانون نافذ نہ ہو تو ہرج و مرج پیش آجاتا ہے۔ وھم فی امر مریج (8) اگر قانون نافذ کیا جائے تو اس کے لئے حکومت کی ضرورت ہے بلکہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ بغیر حکومت کے قانون نافذ کیا جا سکے۔ چونکہ حدود، قصاص، حبس، تعزیرات وغیرہ جیسے قوانین کے لئے سیاست اور قدرت کی ضرورت ہے۔ لہذا حکومت کے بغیر پیامبری ممکن نہیں ہے بلکہ ہر پیامبر کا بنیادی پیغام ہی حکومت ہوتا ہے البتہ بعض پیامبر ایک مختصر مدت میں حکومت تشکیل دے لیتے ہیں اور بعض ایک طویل مدت کے بعد اس میں کامیاب ہوتے ہیں ورنہ ایسا نبی جو فقط وعظ و نصیحت

کرنے پر اکتفا کرے ایسے پیامبر کی ضرورت پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ ہی کوئی شرعی دلیل ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک نبی جو حکومت کی تشکیل پر مامور ہو اس کے زمانے میں اس کے تابع ایک اور نبی بھی ہوں جس کی ذمہ داری حکومت بنانا نہ ہو اور اس نے جدا حکومت نہ بنائی ہو۔ بہر حال انبیاء چونکہ غضب پر رحمت کی سبقت کا سب سے اعلی نمونہ ہیں لہذا ہمیشہ ان کی سیرت میں عفوو رحمت قہر و غضب پر مقدم ہیں اسی امر کو بنیاد قرار دے کر بعض لوگ کہنے لگتے ہیں کہ انبیاء اہل صلح تھے نہ کہ اہل جنگ۔

ان باتوں کا ایک بڑا حصہ محض پروپیگنڈا ہے اور اس غلط اصول کی تبلیغ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ دین سیاست سے جدا ہے۔ ایسے ہی وہ نعرہ بھی ہے جس میں دعوای کیا گیا ہے کہ مسیحیت کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کلیسا حکومت کے درپے نہیں ہے۔ یہ سب غلط تبلیغات ہیں۔ حقیقی مسیحیت کے لئے انجیل اور حضرت عیسیٰ کے پیغام کو دیکھنا چاہئے لیکن یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ ہمیں سیرت انبیاء سے آشنائی کے لئے استعماری مراکز کی طرف رجوع نہیں کرنا چاہئے۔ حضرت مسیحؑ کا پیغام سننے کے لئے ہر گز اس کلیسا کی طرف رجوع نہ کیا جائے جو دنیا پر قابض قوتوں کے کنٹرول میں ہے۔

انقلاب اسلامی کے قابل فخر دور میں ساری دنیا نے دیکھا کہ استعمار نے ایک دن مسیحیت کے رہبروں میں سے ایک شخص کو امام خمینی کے پاس بھیجا تا کہ آپ شاہ کو معاف کر دیں اور دوسری مرتبہ اسی عیسائی اسقف کو لبنان روانہ کیا گیا تا کہ وہاں سے یرغمالی آزاد کروائے۔ اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ کلیسا امریکا کے اختیار میں ہے۔ ہمیں مسیحیت ،انجیل اور حضرت عیسیٰؑ کی پہچان کے لئے وٹیکن جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح انجیل محرف کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ احبار اور علماء سوء کھل کر مغرب کی شوم سیاست کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں ،جن کا کام یہ ہے کہ اپنے آقاؤں کے لئے جاسوسی کریں۔ یہ جو اپنے کام کا معاوضہ امریکا سے لیتے ہیں ہر گز حضرت عیسیٰ کے وارث نہیں ہو سکتے۔ اگر ہم انجیل کو سمجھنا چاہتے ہیں ،حضرت مسیح کا پیغام سننا

چاہتے ہیں ،دین مسیحیت کو درک کرنا چاہتے ہیں تو اس کا بہترین اور واحد منبع قرآن مجید ہے۔ تحریف شدہ انجیل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو ہمیں مطمئن کر سکے۔ اس کتاب میں انبیاء عظام کی طرف معاذاللہ بہت سے گناہ منسوب کیئے گئے ہیں۔ یہ لوگ انبیاء کی معرفت سے عاجز ہیں۔

معرفت انبیاء کا راستہ فقط قرآن کریم ہے بلکہ اگر قرآن نہ ہوتا تو نہ مسیحیت باقی ہوتی نہ یہودیت چونکہ وہ مسیحیت و یہودیت یا تحریف شدہ انجیل و تورات جو آج روئے زمین پر موجود ہیں۔ ان میں ایسا دین نہیں پیش کیا گیا جسے عقل قبول کرلے اور علم جس کی تصدیق کر سکے۔ ایسا دین جو انبیاء کی طرف گناہ منسوب کرتا ہے اور معاذاللہ خدا کے ساتھ یعقوبؑ کی کشتی لڑاتا ہے وہ باقی رہنے کے قابل نہیں ہے۔ قرآن نے آکر مسیحیت کو زندہ کیا ہے اور انجیل کو آبرو دی ہے' یہودیت کو زندہ کیا اور تورات کو عزت عطا کی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے سلسلہ جلیلہ کو عصمت کے ساتھ متصف کیا اور انہیں پاک و منزہ انسان کے طور پر متعارف کروایا بلکہ تمام آسمانی ادیان کو قرآن نے زندہ کیا ہے لہذا اگر قرآن نہ ہوتا تو روئے زمین پر کوئی دین بھی موجود نہ ہوتا اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مسیحیت اور انجیل کی شناخت کے لئے ہمیں یہ ملاحظہ کرنا چاہئے کہ قرآن کریم نے ان کے بارے میں کیا فرمایا ہے۔

قرآن مجید نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ نے حضرت موسیٰؑ اور دیگر تمام انبیاء کی تصدیق کی ہے۔

مُصَدِّقاً لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (9)

حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں نمایاں ترین عنصر حکومت کی تشکیل اور ایک طویل مدت تک آل فرعون کے ساتھ نبرد وجنگ کرنا ہے جب حضرت عیسیٰؑ نے جناب کلیمؑ کی سنت وسیرت کی تصدیق کی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آل فرعون کے ساتھ جنگ کرنا حق ہے اور طویل جنگ کی سختیاں جھیلنا بھی حق ہے۔

اس سے بھی بڑھ کر قرآن کریم میں ایک سورہ مبارکہ ہے جس کا نام سورہ صف ہے حقیقت میں یہ سورۂ جنگ ہے چونکہ اس کے آغاز وانجام میں جنگ کا ذکر ہے اور اس کے وسط میں بھی جنگ کی ترغیب ہے اس کا آغاز یوں ہوتا ہے:

اِنّ اللّٰهَ يُحِبّ الّذِيْنَ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِه صَفّاً كَاَنّهُمْ بُنْيَانٌ مَرصُوصٌ (10)

وہ لوگ جو خدا کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر جہاد کرتے ہیں خدا انہیں پسند کرتا ہے۔

اسی سورہ کے اواخر میں ہے:

يَا اَيّهاَ الّذِيْنَ آمَنُوا كُوْنُوْا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَماَ قَالَ عِيْسَى بْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّينَ مَن اَنْصَارِيْ اِلَى اللّٰهِ قَال الْحَوَارِيّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَآمَنَتْ طَائِفَةٌ مِنْ بَنِى اِسْرَائِيْلَ وَ كَفَرَتْ طَائِفَةٌ فَاَيّدْنَا الّذِيْنَ آمَنُوا عَلىٰ عَدُوّهِمْ فَاَصْبَحُوا ظَاهِرِيْنَ (11)

اے ایمان والو! خدا کے مددگار ہو جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے اپنے حواریوں سے کہا کہ کون ہے جو اللہ کی خاطر میرا مددگار ہو۔ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں پس بنی اسرائیل کا ایک گروہ تو ایمان لے آیا جبکہ دوسرا گروہ کافر ہو گیا جس کے بعد ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی سو وہ غالب ہو گئے۔

چنانچہ اس آیہ کریمہ میں خداوند تعالیٰ نے ہمیں بھی یہ حکم دیا کہ عیسیٰ کے شاگردوں اور حواریوں کی مانند ہو۔

حواری حضرت عیسیٰ کے وہ مخصوص اصحاب تھے جو حضرت عیسیٰ کے تربیت یافتہ عرفاء تھے۔ جب حضرت عیسیٰؑ نے محسوس کیا کہ کفر علنی اور محسوس ہونے لگا ہے تو

فرمایا کون ہے جو اللہ کی خاطر میری مدد کرے۔اس پر حواریوں یا آپ کے تربیت یافتہ عرفاء نے کہا ہم آپ کے حقیقی ساتھی اور مددگار ہیں۔ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس دوران کچھ مسلمان اور کچھ کافر ہو گئے اور ان کے درمیان جنگ چھڑ گئی چنانچہ حواری اور انصار جو ایمان لائے تھے وہ خدا کی مدد سے اپنے دشمنوں پر غالب آ گئے۔ قرآن کریم میں ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے:

فَلَمّا اَحَسّ عِیسٰی مِنھُمُ الْکُفرَ قَالَ مَنْ اَنصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ قَالَ الْحَوَارِیّوْنَ نَحْنُ اَنصَارُ اللّٰہِ آمَنّا بِاللّٰہِ (12)

جب عیسیٰؑ نے ان کی طرف سے کفر کا احساس کیا تو کہا اللہ کی خاطر میرا مددگار کون ہے اس پر حواریوں نے جواب دیا ہم خدا کے مددگار ہیں' ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں ہم مسلمان اور تسلیم ہونے والے ہیں۔

یعنی حضرت عیسیٰ نے جب ان لوگوں کی طرف سے کفر کا احساس کیا تو اپنے حواریوں کی مدد سے ان کے خلاف جنگ کے لئے تیار ہو گئے۔ سورہ صف کے وسط میں بھی تجارت الٰہی کے بارے میں بیان آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

یَااَیّھَا الّذِیْنَ آمَنُوا ھَل اَدُلّکُمْ عَلیٰ تِجَارَۃٍ تُنْجِیْکُمْ مِنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ تُؤ مِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ تُجَاھِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنفُسِکُمْ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَکُمْ اِن کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (13)

اے ایمان والو کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں ایک ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کروں جو تمہیں عذاب الٰہی سے بچالے ؟ وہ یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و نفس کے ذریعے جہاد کرو اگر تمہیں آگاہی ہو تو یہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے۔

اس آیت میں خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا سب سے زیادہ سود مند تجارت ہے:۔

اس سورۃ مبارکہ سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جھکنے والے نہیں تھے لیکن یہی میسحیت جو حضرت کلیم اللہ کے انتھک جہاد کی تصدیق و تائید کرتی ہے اور خود بھی اہل نبرد ہے جب محرفین انجیل کے ہاتھ چڑھتی ہے تو اس میں دین و سیاست میں جدائی کا منحوس نغمہ الاپا جاتا ہے، کبھی کلیسا میں رہنے کے بہانے حکومت سے دوری کی بات کرتے ہیں اور کبھی دشمنوں کی پوشیدہ غلامی کرتے ہیں۔

پس میسحیت کی شناخت فقط قرآن کریم کے ذریعے ممکن ہے اور قرآن یہ تسلیم نہیں کرتا کہ حضرت مسیح کا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں تھا بلکہ مذکورہ برہان عقلی اور شاہد نقلی سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی اہل نبرد تھے۔

پس عارف کی رحمت کے اس کے غضب پر غالب ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عارف میں غضب نہیں ہوتا چونکہ جو شخص اہل غضب و قہر نہ ہو وہ ہرگز پیغام خدا لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دین سیاست سے جدا ہے یا عرفان و شجاعت یکجا جمع نہیں ہو سکتے یا اچھے انسانوں کو جنگ سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے انہوں نے فقط رحمت کے پہلو کو تھام رکھا ہے اور غضب کو اس رحمت کا پیروکار نہیں مانتے لہذا یہ کہا جاتا ہے کہ ذکر خدا قتال فی سبیل اللہ سے بہتر ہے ایسی باتوں کی اگر کوئی توجیہ ممکن ہو تو توجیہ کرنی چاہئے جیسا کہ عرفانی کتب میں ان باتوں کی تاویل کے فراوان شواہد موجود ہیں ورنہ ایسی باتیں ہرگز قابل قبول نہیں ہیں۔

امام حسین علیہ السلام کی دعائے عرفہ سراسر عرفان ہے۔ روز عاشور اور شب عاشورا کی دعائیں بھی محض عرفان ہیں۔ شب عاشورا کی مہلت نماز و دعا کے لئے لینا بھی عرفان ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور فرمایا: ان سے آج رات کی مہلت لے لو کہ ہم نماز پڑھنا اور دعا کرنا چاہتے ہیں۔

هو یعلم انی احب الصلاۃ و کثرۃ الدعا و الاستغفار (14)

خدا جانتا ہے کہ مجھے نماز پسند ہے اور کثرت سے دعا اور استغفار کرنا۔

عارف ہمیشہ نماز کا محبّ ہوتا ہے اس کی آنکھیں نماز، دعا اور ذکر و مناجات سے ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ امام حسین علیہ السلام اور آپ کے تمام باوفا ساتھی ایسے ہی تھے۔

لَھُمۡ دَوِیٌّ کَدَوِیِّ النَّحۡل (15)

ان کی مناجات کی آواز شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح تھی۔ رکوع و سجود ان کے خالص عرفان کی علامت اور رجز پڑھنا ان کے حماسہ و شجاعت کی دلیل ہے۔ عرفان و شجاعت کی سازگاری کا یہ ایک بہترین نمونہ ہے لہذا ہمیں دنیا سے کنارہ کشی اور خلق خدا سے دوری میں فرق کرنا چاہئے چونکہ وہ گوشہ نشینی جو مقدس ہے وہ دنیا سے ہے نہ کہ خلق خدا سے۔ امیر المومنین علیہ السلام کے لئے معاشرے کی امامت ور ہبری سے دور رہنا اسی بناء پر دشوار تھا چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

فَصَبَرۡتُ وَ فِی الۡعَیۡنِ قَذیً وَ فِی الۡحَلۡقِ شَجیً
اَریٰ تُراثِی نَھۡبا (16)

میں نے صبر کیا حالانکہ میری آنکھوں میں تنکا اور حلق میں ہڈی پھنسی ہوئی تھی اور میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھتا رہا۔

حضرت فرماتے ہیں کہ میں نے آنکھ میں اٹکے ہوئے تنکے اور حلق میں پھنسی ہوئی اس ہڈی کی دشواری اور سختی پر صبر کیا کیونکہ میرے لئے کوئی اور چارہ ہی نہ تھا۔ میرے لئے جنگ کرنا ممکن نہ تھا چونکہ میں دین کو زندہ رکھنا چاہتا تھا۔ صرف قتل ہو جانا کوئی کمال نہیں ہے۔ علی علیہ السلام کے بارے میں کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ آپ موت سے ڈرتے تھے۔ اس کے باوجود علیؑ فرماتے ہیں کہ مجھے ایسی حالت میں لا کھڑا کیا گیا کہ میرے ارد گرد فقط میرے اہل بیت اور نزدیک کے چند دوست رہ گئے تھے۔ چنانچہ میں نے ان کے قتل ہونے میں بخل سے کام لیا اور قتل نہیں ہونے دیا چونکہ اگر میں انہیں میدان میں اتارتا تو یہ

سب مار دیئے جاتے اور اس شہادت کا کوئی اثر بھی نہ ہوتا لہذا میں نے صبر کیا تا کہ ان کا خون اور زیادہ پھلے پھولے اور پھر راہ خدا میں بہایا جائے۔ (17)

یہ اس شخص کی باتیں ہیں جس کے نزدیک دنیا ہر چیز سے زیادہ پست ہے ، جس کے نزدیک دنیا بکری کی چھینک کی مانند ہے۔ حضرت گویا یہ فرما رہے ہیں کہ خون دینے کا کوئی موقع ہوتا ہے۔ دین زندہ کرنے اور لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے خون دیا جاتا ہے۔ ابھی اگر مدینے میں یہ لوگ ہمیں قتل کر دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا قاتل ہمیں قتل کر کے سیاہ لباس پہن لیں گے اور ہماری مجلس سوگ میں ماتم کرنے بھی بیٹھ جائیں گے اور اس طرح یہ خون پامال ہو جائے گا۔ اسی لئے میں نے اس موقع پر بخل کیا اور کہا کہ ابھی خون بہانے کا وقت نہیں آیا ہے۔

بعد میں جب وقت آیا اور حضرت امام حسین علیہ السلام کی باری آئی تو وہ بخل سخاوت میں تبدیل ہو گیا۔ اب جو بھی دامن میں تھا پیش کر کے دامن جھاڑ دیا چونکہ اب خون دینا موثر تھا۔

عارف انسان کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنا پیغام لوگوں تک پہنچائے اور لوگوں کو آگاہ و بیدار کرے یعنی خود بھی خدا کی طرف جائے اور دوسروں کو بھی لے جائے۔ عارف کا کام فقط جانا نہیں بلکہ لے جانا بھی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی یہی فرمایا من **انصاری الی الله** (18) یعنی میں خدا کی طرف جا رہا ہوں کون ہے جو میرے ہمراہ اللہ کی طرف جائے۔ اور یہ پہلے ہی بیان فرما دیا کہ مقصد اللہ ہے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے بھی یہی کام کیا ہے اور اس کا نتیجہ بھی نکلا۔ آپ کی اس قربانی کے نتیجے میں پورا عالم بیدار ہو گیا۔ کربلا کے ثمرات میں سے ایک نمونہ ایران کا اسلامی انقلاب ہے جو امام خمینی کی قیادت میں کامیاب ہوا۔

ساتویں فصل

عارف اور غیر عارف کے غضب میں فرق ہے۔

عارف کی روح نہ فقط شجاعت و نبرد کے ساتھ سازگار ہوتی ہے بلکہ حماسہ و شجاعت کو معرفت کا رنگ بھی عطا کرتی ہے۔ اہل معرفت کبھی بھی باطل کے سامنے جھکتے نہیں اور ہرگز ظلم و ستم کے مقابلے میں خاموش نہیں بیٹھتے۔ عرفان کا سب سے نمایاں مصداق انبیاء اولیاء الٰہی ہیں جیسا کہ حماسہ و شجاعت کا نمونہ بھی انہی ہستیوں کی سیرت ہے۔ گزشتہ فصل میں بیان ہوا ہے کہ عارف اور غیر عارف کے درمیان فرق ہے ، غیر عارف میں غضب رحمت کا امام ہوتا ہے جبکہ عارف میں رحمت غضب کی رہبر ہوتی ہے۔ یعنی عارف غضب کے بغیر نہیں ہوتا' دوم عارف اپنے غضب میں اعتدال برقرار رکھتا ہے' سوم غضب کو بجا استعمال کرتا ہے' جبکہ غیر عارف انسان میں بھی اگرچہ غضب ہوتا ہے لیکن اس میں اعتدال نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ اسے بے جا استعمال کرتا ہے غیر عارف انسان کا غضب ہمیشہ تہمت ، جھوٹ ، بہتان ، غیبت اور تکفیر وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ بزدل انسان میں بھی غضب ہوتا ہے لیکن اس کا یہ غضب ہمیشہ غیبت ، تہمت اور دوسروں کی تکفیر کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کسی انسان میں غضب نہ ہو لیکن بعض اوقات رحمت و عقل کی اقتداء نہ کرنے کی وجہ سے اپنے مقام سے بھٹک جاتا ہے۔

اہل معرفت کا غضب فقط دین خدا کو زندہ رکھنے کے لئے ہوتا ہے لہذا وہ کبھی بھی اپنے ذاتی مسائل کی خاطر غضبناک نہیں ہوتے۔ ذاتی مسائل میں درگزر کرتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں ہرگز تسلیم نہیں ہوتے اس کے برعکس جو اہل معرفت نہیں ہیں وہ اپنے

ذاتی مسائل کی خاطر غصے میں آجاتے ہیں۔ بعض اوقات یہ غضب ان کے اندر پنہاں رہتا ہے اور بہت ہی خفیہ شکلوں میں سامنے آتا ہے۔ یہ جو بعض مواقع پر دیکھنے میں آتا ہے کہ بعض بزدل انسان جو رجعت پسند ہیں مختلف لوگوں کو تکفیر کرنے ، فاسق و فاجر قرار دینے ، تہمت و افتراء بازی میں مشغول رہتے ہیں یہ در حقیقت ان کے غضب کا اظہار ہے جو ان شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس حالت میں ان افراد کا غضب مردانہ طور پر سامنے نہیں آتا بلکہ بزدلانہ انداز میں زیر لب اور بین السطور میں ظاہر ہوتا ہے۔ جبکہ اہل معرفت مردانہ انداز میں اپنا غضب میدان نبرد میں ظاہر کرتے ہیں وہ سارا غصہ دین کے دشمنوں پر نکالتے ہیں اور اپنے دل کے اندر ہرگز دوستوں کی بابت خفیہ غضب چھپا کر نہیں رکھتے۔

علی علیہ السلام غضب اور غصہ دکھانے کا صحیح طریقہ یوں بیان فرماتے ہیں:

اَیُّھَا الْمُومِنُوْنَ مَنْ رَاَیٰ عُدْوَاناً یُعْمَلُ بِهِ وَ مُنْکَراً یُدْعیٰ اِلَیْهِ فَاَنْکَرَهُ بِقَلْبِهِ فَقَدْ سَلِمَ وَ بَرِءَ وَ مَنْ اَنْکَرَهُ بِلِسَانِهِ فَقَدْ اُجِرَ هُوَ اَفْضَلُ مِنْ صَاحِبِهِ وَ مَنْ اَنْکَرَهُ بِالسَّیْفِ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا وَ کَلِمَةُ الظَّالِمِیْنَ هِیَ السُّفْلیٰ فَذٰلِكَ الَّذِیْ اَصَابَ سَبِیْلَ الْهُدیٰ وَ قَامَ عَلَی الطَّرِیْقِ وَ نَوَّرَ فِیْ قَلْبِهِ الْیَقِیْنَ(1)

اے ایمان والو! تم میں سے جو شخص ظلم و عدوان پر عمل ہوتا دیکھے اور برائی کی طرف دعوت کو سنے اور اس کے بعد اسے دل سے برا سمجھے تو یہ انسان خود بچ جائے گا اور نجات پائے گا لیکن جو اسے زبان سے برا اقرار دے ، اسے مزید اجر بھی ملے گا اور دل سے برا سمجھنے والے سے افضل بھی ہو گا لیکن جو شخص تلوار اٹھا کر اس برائی کے خلاف اس غرض سے اٹھ کھڑا ہوتا ہے کہ کلمۃ اللہ کا بول بالا اور کلمہ ظالمین کو نیچا دکھائے تو یہی وہ شخص ہے جس نے ہدایت کی راہ پالی ہے' سیدھے راستے پر قائم ہے اور یہی وہ انسان ہے جس کے دل کو یقین

بنے منور کر دیا ہے۔

وہ جوان جس نے کہا تھا کہ گویا میں عرش خدا کو دیکھ رہا ہوں، گویا بہشت و اہل بہشت ، جہنم اور اہل جہنم کو دیکھ رہا ہوں (2) خدا نے اس کے دل کو منور کر دیا تھا۔ یہاں پر امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو تلوار اٹھا کر ظلم کے مقابلے میں ڈٹ جائے یہ بھی وہ انسان ہے جس کے دل کو خدا نے منور کر دیا ہے۔ علی علیہ السلام جس انسان کے قلب کی نورانیت کی بات کر رہے ہیں وہ عارف انسان ہے چونکہ عارف کا دل منور ہوتا ہے اور اسی کے بارے میں قرآن مجید نے فرمایا ہے:

وَجَعَلْنَا لَهُ نُوْرًا يَمْشِيْ بِهِ فِيْ النَّاس (3)

ہم نے اس کے دل میں ایسا نور قرار دیا ہے جس کے سہارے وہ لوگوں میں چلتا پھرتا ہے۔

منور القلب عارف فقط دل میں ہی گناہ و ظلم سے بیزار نہیں ہوتا ، فقط نہی از منکر کے ذریعے ہی منکرات و فحشا اور برائیوں کو نہیں روکتا بلکہ تلوار کے ذریعے بھی برائی اور ستم کا راستہ روکتا ہے اور یہ اس کا حماسہ و شجاعت ہیں جو عرفان کے ساتھ آمیختہ ہو گئے ہیں۔ یہ تو روح کے تکامل اور عروج کے لئے تھا لیکن اگر کوئی امت سقوط کرنا چاہے تو اس کے بارے میں امیر المومنین کا ارشاد ہے:

اَوّلُ مَاتَغْلَبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْجِهَادِ ،اَلْجِهَادُ بِاَيْدِيْكِمْ ثُمّ بِاَلْسِنَتِكُمْ ثُمّ بِقُلُوْ بِكُمْ فَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ بِقَلْبِهِ مَعْرُوفاً وَ لَمْ يُنْكِرْ مُنْكَراً قُلِبَ فَجَعَلَ اَعْلاَهُ اسْفَلَهُ وَ اسْفَلَهُ اَعْلاَهُ (4)

جہاد میں سب سے پہلے تم جس چیز میں شکست کھاؤ گے وہ ہاتھ کا جہاد ہے اس کے بعد زبان کا جہاد اور آخر میں دل کا جہاد ہے۔ چنانچہ جس نے دل سے بھی بھلائی کو اچھا اور برائی کو برا نہ کہا تو اسے الٹا کر دیا جائے گا یعنی اس کا نچلا حصہ اوپر اور اوپر کا حصہ نیچے کر دیا جائے گا۔

یعنی علی علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ حماسہ و جہاد میں شکست کھا جاؤ۔ یاد رکھنا

کہ اس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ سب سے پہلے تمہارے ہاتھ سے شمشیر لے لی جائے گی جس کے بعد تم تلوار کا جہاد نہیں کر سکو گے اس کے بعد زبانی جہاد بھی تم سے چھین لیا جائے گا اور تم امر بالمعروف اور نہی از منکر کرنا چھوڑ دو گے اور آخر کار دل کا جہاد بھی تم سے لے لیا جائیگا کہ اس کے نتیجے میں تم برے کاموں سے نفرت بھی نہیں کرو گے۔

لہذا اگر کوئی شخص اپنی آنکھوں سے گناہ کا ارتکاب دیکھے اور اپنے اندر احساس ذمہ داری کا احساس نہ کرے تو اسے بہت شرمسار ہونا چاہئے کیونکہ جہاد کے سارے مرتبے ہاتھ سے دے بیٹھا ہے سب سے کمترین مرتبہ جہاد کا گناہ سے دلی نفرت ہے اس کے بعد زبان سے جہاد کا مرتبہ ہے اس کے بعد ہاتھ اور تلوار سے گناہ کو روکنے کا مرتبہ ہے۔

علی علیہ السلام ، جو عرفان کا سب سے اعلی نمونہ ہیں ، معرفت کو حماسہ کا رہنما مانتے ہیں لہذا جنگ و حماسہ کو ہمیشہ رحمت و معرفت کے سائے میں جائز سمجھتے ہیں- امام سجاد علیہ السلام بھی صف اول میں لڑنے والے مجاہدین کے لئے دعا کرتے ہیں البتہ یہ دعا نہیں کرتے کہ خدایا انہیں صحیح و سالم واپس پلٹا اگرچہ بجائے خود یہ دعا مانگنا بھی جائز ہے لیکن بعض تو لامحالہ جام شہادت نوش کریں گے لہذا امام سجاد علیہ السلام جو انہی مجاہدین کے پیشوا ہیں خداوند تعالیٰ سے یوں عرض کرتے ہیں:

اَیُّمَا غَازٍ غَزَاهُمْ مِنْ اَهْلِ مِلَّتِكَ اَوْ مُجَاهِدٌ جَاهَدَ هُمْ مِنِ اتِّبَاعِ سُنَّتِكَ لِيَكُوْنَ دِيْنُكَ الأَعْلٰى وَ حِزْبُكَ الأَقْوىٰ وَ حَظُّكَ الأَوْفٰى فَلَقِّهِ الْيُسْرَ (5)

بارالٰہا! تیرے دین و ملت والوں میں سے جو غازی دشمن سے جنگ کے لئے تیار ہویا تیرے راستے کی پیروی کرنے والوں میں سے جو مجاہد قصد جہاد کرے اس غرض سے کہ تیرا دین بلند، تیرا گروہ قوی اور تیرا حصہ و نصیب کامل تر ہو تو اس کے لئے آسانیاں پیدا کر-اسی دعا میں فرمایا:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ آلِ مُحَمَّدٍ وَ آنِسْهُمْ عِنْدَ لِقَائِهِمُ الْعَدُوَّ ذِكْرَ دُنْيَا هُمُ الْخَدَّاعَةِ الْغَرُوْرِ وَ امْحُ عَنْ قُلُوْبِهِمْ خَطَرَاتِ الْمَالِ الْفَتُوْنِ

اے اللہ محمدؐ اور ان کی آل پر رحمت نازل فرما اور دشمن سے مدمقابل ہوتے وقت غدار اور فریب کار دنیا کی محبت ان کے دلوں سے نکال دے اور گمراہ کرنے والے مال کے اندیشے ان کے ذہنوں سے مٹادے۔

یعنی خدایا یہ مجاہدین جو تیرے نام کو زندہ رکھنے کے لئے قرآن کے احیاء اور تیری حزب کی برتری کے لئے دشمنوں ، مشرکوں اور کافروں سے جنگ کررہے ہیں دشمن سے روبرو ہوتے وقت ان کے دلوں سے دنیا کی یاد کو نکال دے۔ ان کے دلوں سے مال کی محبت ختم کردے یعنی دنیاو مال کا شوق ان کے دلوں سے نکال دے۔ یہ ایک عارف کا حماسہ ہے جو خدا سے دعا مانگ رہا ہے کہ خدایا ان جنگجوؤں کے دلوں سے مال ، دولت ، اولاد، بیوی ، گھربار کی یاد کو نکال دے ، واپسی کی امید ان کے دلوں سے نکال دے۔

عارف جب جنگ کی تصویر کشی کرتا ہے تو اس کی دیگر عبادتوں کی طرح وہ بھی عارفانہ ہوتی ہے۔

وہی تین قسمیں جو امیر المومنین علیہ السلام سے عبادت کے بارے میں منقول ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بھی نقل کی گئی ہیں کہ بعض لوگوں کی عبادت سوداگرانہ بعض کی غلامانہ اور بعض کی آزادانہ عبادت ہوتی ہے۔ جو جہنم کے خوف سے عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت غلامانہ ہے جو بہشت کے شوق میں عبادت کرتے ہیں ان کی عبادت سوداگرانہ ہے -در حقیقت یہ دونوں غلام ہیں- ایک منفعت و سود کا غلام ہے دوسرا خوف اور ڈر کا غلام ہے جبکہ تیسرا گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ جہنم کے خوف سے اور نہ ہی بہشت کی لالچ میں خدا کی عبادت کرتے ہیں اور انہی کی عبادت آزادانہ ہے (6)

یہ قانون اور قاعدہ کلیہ ہر عبادت کے بارے میں ہے اور جنگ بہترین عبادات میں سے

ہے۔ جنگ کا باعث غضب ہے ،انسان اگر زاہد و عابد ہو تو اپنے غصہ و غضب کو حق کی راہ میں صرف کرتا ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران میں آٹھ سالہ دفاع کے دوران متعدد افراد ایسے تھے جو جنگ و نبرد کے مخالف تھے البتہ ان میں بھی غصہ و غضب موجود تھا لیکن اس غضب کو صدام کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے مختلف لوگوں کی تکفیر و تفسیق اور غیبت و تہمت میں صرف کرتے تھے۔چونکہ جو آدمی غیبت کرنے میں مشغول ہوتا ہے در حقیقت اپنا غضب و غصہ نکال رہا ہوتا ہے اسی طرح جو شخص کسی کی تکفیر کرتا ہے یا کسی کو فاسق و فاجر قرار دیتا ہے اس میں اتنا کمال تو نہیں ہوتا کہ صدام جیسوں کے خلاف میدان جنگ میں مردانہ طور پر غضب کا اظہار کرے اس کے بجائے پنہاں طریقے سے اپنے ہی لوگوں کے خلاف منافقانہ سکوت سے اسے ظاہر کرتا ہے۔

ایسا انسان خوف کا غلام ہوتا ہے اس میں غضب تو ہوتا ہے لیکن ڈر کی وجہ سے۔ دشمن کے بجائے اپنے ہی لوگوں کے اوپر تہمت و بہتان باندھتا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اپنے غضب کو کہاں ظاہر کرے۔ اگر یہ شخص جنگ بھی لڑے تو یا جہنم کے خوف سے لڑے گا یا بہشت کی لالچ میں لڑے گا لیکن وہ جوان مرد جو فقط شوق جنگ میں لڑتے ہیں ہرگز جلنے اور مرنے سے نہیں ڈرتے ورنہ جنگ کا استقبال نہ کرتے اور جنگ شروع ہی نہ کرتے۔ عارف اس لئے لڑتا ہے تاکہ آزاد رہے اور آزاد کرے جبکہ عابد اس لئے لڑتا ہے کہ جہنم میں نہ جلے یہی عارف اور غیر عارف کے حماسہ اور شجاعت کے درمیان فرق ہے۔

حضرت سجاد علیہ السلام نے کربلا سے شام تک کا فاصلہ اگرچہ خاموشی سے طے کیا ہے لیکن مسلسل یاد حق میں تھے سوائے اہل بیتؑ کے کسی سے بات نہ کرتے تھے لیکن جب شام کے اندر بولنا شروع کیا تو یوں فرمایا:

اگرچہ اس سال ہم منیٰ نہیں جاسکے ' سرزمین منیٰ پر بیتوتہ اور قربانی نہیں کرسکے لیکن منیٰ کا تعلق ہمارے ساتھ ہے فرمایا:

اَنَا ابنُ مَکّۃَ وَمِنیٰ وَ اَنَا ابنُ زَمزَمَ وَ صَفَا

میں فرزند مکہ و منٰی ہوں میں فرزند زمزم و صفا ہوں۔

یعنی ہم نے منٰی کو زندہ کیا ہے جو شخص منٰی میں گوسفند قربان کرتا ہے وہ منٰی کا مالک نہیں ہے بلکہ جو راہ خدا میں والد اور بھائی قربان کرتا ہے منٰی کا تعلق اس سے ہے اور یہی درس شہادت ہے۔ (7)

سرزمین مکہ میں جمعہ سیاہ کے خونریز واقعہ میں چار سو سے زیادہ ایرانی حاجیوں نے خون میں لت پت ہو کر جام شہادت نوش کیا وہ ہرگز منٰی تک نہ جا سکے اور وہاں قربانی کا گوسفند بھی ذبح نہ کر سکے لیکن منٰی انہی کے لئے ہے ، منٰی جو سرزمین شہادت ہے انہوں نے ہی زندہ کی ہے

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم نے والد ، چچا اور برادر شہید کروائے ہیں۔ اصحاب قتل کروائے ہیں۔ قید برداشت کی ہے زخمی اور مقتول ہوئے ہیں چونکہ منٰی ہمارے لئے ہے۔

میں منٰی و مکہ کا وارث ہوں میں صفا و مروہ اور زمزم و کعبہ کا وارث ہوں چونکہ کعبے کو ہم نے زندہ کیا ہے' مکہ کو ہم نے زندہ کیا ہے' ہم نے حج کو عزت دی ہے اور حج کی آبرو ہم نے محفوظ رکھی ہے۔ ورنہ بھیڑ بکرے ذبح کرنا تو بہت آسان ہے۔ منٰی میں جانور ذبح کرنے کی تاریخ بہت ہی طولانی ہے حتی کہ اسلام سے پہلے بھی یہ رواج تھا لیکن جو گائے ،بیل اونٹ اور بھیڑ بکرے وہاں پر ذبح کرتا ہے وہ منٰی کا مالک نہیں ہوتا بلکہ ہم نے چونکہ شہید پیش کئے ہیں اس لئے منٰی ہم سے متعلق ہے۔ شام کے لوگوں نے جب دیکھا کہ ایک اسیر ہے زنجیر و غل میں جکڑا ہوا لیکن بہت ہی بڑے دعوے کر رہا ہے انہیں بہت تعجب ہوا لہذا پوچھنے لگے یہ کون ہے ؟

اس پر حضرت سجاد علیہ السلام نے اپنا تعارف کروایا اور فرمایا "میں خاندان وحی سے تعلق رکھتا ہوں' وحی ہمارے ہی گھرانے میں اترتی تھی' قرآن ہمارے گھر میں اترا ہے۔ مفاخر اسلام وہ لوگ ہیں جو صدر اسلام میں شہید ہو چکے ہیں۔ تم لوگ جانتے ہو میں کس کا

بیٹا ہوں۔ میں فاطمہ زہراؑ کا فرزند ہوں" یہ ایک خاتون ہیں جن کا رتبہ اتنا بلند و عالی ہے کہ امام سجاد بھی ان پر فخر کرتے ہیں۔ بعد میں فرمایا۔ "جعفر طیار ہم میں سے ہیں 'صدر اسلام کے عظیم شہید سب ہمارے ہیں ہمارا تعلق خاندان شہادت سے ہے۔"

امام سجاد علیہ السلام نے اس قانون کو روشن اور واضح فرمادیا کہ عارف کا حماسہ یہ ہے کہ دین کی راہ میں مقدس ترین خون ہدیہ کردے۔ ویسے تو بہت سے لوگ شہید ہوئے ہیں لیکن کسی خون کا خون بہا خدا کی ذات نہیں۔ اگر کسی شہید کو بہت ہی بلند مرتبہ نصیب ہو تو زیادہ سے زیادہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جسے خداوند تعالیٰ نے اس طرح سے بیان فرمایا ہے:

اِنّ الْمُتّقِیْنَ فِیْ جَنّاتٍ وَ نَهَرٍ فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْكٍ مُقْتَدِرٍ (8)

متقین جنتوں اور نہروں میں ہیں ان کا مقام ، مقام صدق ہے مالک مقتدر کے نزدیک۔

لیکن وہ خون جو اتنا گراں بہا ہے کہ خداوند تعالی کی ذات کے علاوہ کوئی چیز اسکا معاوضہ اور خون بہا واقع نہیں ہو سکتی وہ علیؑ اور اولاد علیؑ کا مقدس خون ہے۔

زیارت نامے میں جو پڑھا جاتا ہے

اَلسّلَامُ عَلَیْكَ یَاثَارَ اللّٰهِ وَ ابْنَ ثَارِہٖ (9)

(سلام ہو آپ پر اے خون خدا اور اے خون خدا کے فرزند) تو اس سے مراد بھی یہی ہے کہ علی علیہ السلام کا خون اتنا بے بہا ہے کہ خدا کی ذات کے علاوہ کوئی چیز اس کا اجر واقع نہیں ہو سکتی۔ بہشت امیر المومنین علیہ السلام کی مشتاق ہے۔ امام حسین علیہ السلام بھی اس بلند مرتبے پر جا پہنچے کہ آپ کے خون کا اجر بھی فقط ذات خدا ہے۔ عارف اس دلیل سے اہل حماسہ ہوتا ہے کہ اس کا خون کلمتہ اللہ کے علو اور بلندی کے لئے بہایا جاتا ہے۔

لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیٰا (10)

سید الساجدین علیہ السلام فرماتے ہیں ہم نے ایسا خون پیش کیا ہے جس کی وجہ سے

تمام دینی مراکز ہمارے نام ہو گئے ہیں اور ہمارا ارث بن گئے ہیں لہذا اس کے بعد جو بھی مکہ جائے گا وہ ہمارے طفیل جائے گا۔ قیامت تک منٰی جا کر قربانی کرنے والے دراصل ہماری میراث سے استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم اسی میراث کو زندہ کر کے لوٹ رہے ہیں۔

ابراہیم بن طلحہ نے شام کے اندر حضرت امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا یا علی بن الحسین من غلب ؟ اے فرزند حسین اس جنگ میں کون غالب رہا۔ آپ نے جواب دیا:

اِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَعْلَمَ مَنْ غَلَبَ وَ دَخَلَ وَقْتُ الصَّلَاةِ فَاَذِّنْ وَ اَقِمْ

اگر چاہتے ہو کہ جانو کہ کون غالب رہا تو جب نماز کا وقت داخل ہو تو اذان و اقامت میں دیکھ لو کہ کس کا نام لیا جاتا ہے۔

یعنی ہم نے نبی اکرم ؐ کا نام زندہ رکھا ہے۔ چونکہ ان لوگوں کی کوشش تھی کہ انبیاء و اولیاء کی جگہ بنی امیہ کو متعارف کروائیں ہم نے خون کے ذریعے اس سازش کو ناکام بنا دیا ہے اور اس پر پریشان بھی نہیں ہیں۔ (11)

عارف جب جنگ کی بات کرتا ہے تو نہ جہنم کے خوف کی وجہ سے اور نہ ہی جنت کے شوق کی بناء پر کرتا ہے بلکہ فقط حب خدا کے لئے جنگ کرتا ہے۔ چنانچہ امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَ اجْعَلْ فِكْرَهُ وَ ذِكْرَهُ وَ ظَعْنَهُ وَ اِقَامَتَهُ فِيكَ وَ لَكَ (12)

بارالہا! یہ مجاہدین جو تیری راہ میں لڑ رہے ہیں نہ فقط دنیا ، مال اور اہل و عیال کی یاد ان کے دلوں سے نکال بلکہ ان کی فکر و ذکر ، حرکت و سکون ، اقامت اور کوچ کرنا ، خیمہ گاڑنا ، رکنا ، چلنا ، پھرنا اور اٹھنا ، بیٹھنا سب کا سب اپنے لئے قرار دے اور اپنے میں قرار دے۔

امام علیہ السلام نے یہ نہیں فرمایا "وفی سبیلک" یعنی اپنے راستے میں قرار دے بلکہ کسی چیز کو بھی محذوف رکھے بغیر فرمایا "وفیک" یعنی اپنی ذات کے اندر قرار دے۔ حضرت علی

علیہ السلام نے بھی اسی نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

آہ! مِنْ قِلّةِ الزّادِ وَ طُولِ السّفَرِ وَ بُعْدِ الطّرِيْقِ وَ عَظِيمِ الْمَوْرِدِ (13)

افسوس زادراہ تھوڑا راستہ طویل، سفر دراز اور منزل سخت ہے۔

یہ کونسا سفر ہے اور کونسی منزل ہے جس کے بارے میں امام علیہ السلام اس طرح سے آہ و نالہ کر رہے ہیں کہ زاد و توشہ بہت کم اور سفر بہت دور دراز کا ہے؟ آیا یہ سفر الی اللہ ہے؟ اسے تو علیؑ نے طے کر لیا ہے اور اس کے بارے میں فرمایا کہ

مَا کُنْتُ اَعْبُدُ رَبّاً لَمْ اَرَهُ (14)

میں ایسے رب کی عبادت نہیں کرتا جسے دیکھا نہ ہو (اور جس تک پہنچا نہ ہوں)

پس یقیناً" یہ کوئی اور سفر ہے چونکہ سفر الی اللہ میں اتنی آہ و افسوس کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ذات خدا میں سفر کرنا باعث آہ و فغاں ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں ہے یہ سفر من اللہ و الی اللہ ہے یعنی خدا سے خدا تک کا سفر لا محدود اور بے پایاں ہے۔ اس سفر میں جلال و جمال الٰہی کے اندر سیر و سلوک باعث آہ و فغاں ہے اور علیؑ اسی کے لئے زیادہ زاد و توشہ طلب کر رہے ہیں۔

اس راستے کے راہی جانتے ہیں کہ محبت خدا اس سفر میں سواری اور تقویٰ اس کا توشہ ہے اور سالک کبھی بھی سواری اور توشہ کے بغیر یہ سفر طے نہیں کر سکتا۔

چنانچہ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

تَزَوّدُوْا فَاِنّ خَيْرَ الزّادِ التّقْوىٰ (15)

زاد و توشہ جمع کرو اور بہترین توشہ تقویٰ ہے۔

اس راستے میں اگر کسی چیز سے مدد لی جا سکتی ہے تو وہ تقویٰ ہے محبت اس راہ میں سواری کا درجہ رکھتی ہے چونکہ جذبہ اور عقیدت ہی انسان کو اپنی طرف کھینچتی اور آگے بڑھاتی ہے اور محبت معرفت کے بغیر نہیں ہو سکتی اور عارف ہی ہمیشہ محبّ ہوتا ہے۔

چنانچہ اس عارف نامدار کا کہنا ہے کہ

الا یاایها الساقی ادر کاساً و ناولها که عشق
اول نمود آسان ولی افتاد مشکلها (16)

اے ساقی جام لاؤ اور مجھے پلادو کیونکہ عشق پہلے تو بہت آسان لگا لیکن بعد میں بڑی مشکلیں آپڑیں۔

بعض اوقات کسی موقع پر انسان کے اوپر ایک مخصوص حالت طاری ہوتی ہے اور اسی حالت میں انسان ناگہان کوئی فیصلہ کر بیٹھتا ہے چونکہ اس حالت میں فیصلہ کرنا آسان ہوتا ہے۔ یہ عشق کی حالت ہوتی ہے جو ہر قسم کے فیصلے اور عزم کو آسان بنادیتی ہے لیکن چونکہ یہ حالت زیادہ دیر باقی نہیں رہتی اور کچھ عرصے کے بعد ختم ہو جاتی ہے لہذا اس فیصلے پر چلنا اور باقی رہنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے لوگ مجذوب سالک ہوتے ہیں یعنی پہلے ایک جذبہ اور مجذوبیت کی حالت ان پر طاری ہوتی ہے جس میں فیصلہ کر کے ارادہ کر لیتے ہیں لیکن جب اس فیصلے اور ارادے کے مطابق سفر شروع کرتے ہیں تو مذکورہ حالت ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بغیر یہ راہ جاری رکھنا بہت دشوار لگتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ عشق آسان نمود اول ولی افتاد مشکلها یعنی پہلے تو عشق نے بہت آسان دکھایا لیکن بعد میں مشکلات آپڑیں۔ لیکن جو ہمیشہ مجذوب رہتے ہیں اور یہ حالت عشق و جذبہ کبھی بھی ان میں ختم نہیں ہوتی کسی قسم کی دشواری محسوس نہیں کرتے۔

لہذا امام سجاد علیہ السلام محاذ جنگ کے جنگجوؤں کے لئے یہ دعا مانگتے ہیں کہ بارالہا جو تیرے نام اور تیری یاد کے ساتھ لڑ رہا ہے اسے اپنی محبت عطا فرما تاکہ یہ راستہ وہ آسانی سے طے کر سکے ایسا نہ ہو کہ آدھے راستے میں آکر کہے کہ عشق اول نمود آسان ولی افتاد مشکلها

بلکہ فرمایا **فَلَقِّهِ الیسر** اسے سہولت و آسانی عطا فرما۔

چونکہ پہلے پہل عشق ہوتا ہے اس کے بعد کم ہو کر شوق بن جاتا ہے اور شوق ہمیشہ رنج و مشقت کے ہمراہ ہوتا ہے جب کہ عشق تمام مشکلات کو حل کر دیتا ہے خدا نہیں اپنا عاشق

بنادے تاکہ آسانی سے تیری راہ میں جنگ ورزم کر سکیں۔

امام صادق علیہ السلام حضرت پیغمبر اکرمؐ سے نقل فرماتے ہیں:

اَفۡضَلُ النّاسِ مَنۡ عَشِقَ الۡعِبادَةِ فَعَانَقَهَا (17)

سب سے بہترین انسان وہ ہے جو عبادت سے عشق کرے اسے گلے لگائے اور عبادت کی گردن میں بانہیں ڈال دے عبادت کو محبوب قرار دے کر اپنی آغوش میں لے لے۔ لیکن عبادت کے کئی درجات اور مراتب ہیں ان میں سب سے نمایاں مظہر جنگ ہے اور جنگجوؤں میں بھی سب سے افضل وہ ہیں جو محاذ جنگ سے عشق رکھتے ہیں۔ اسے عارف کا حماسہ یا عرفان حماسی کہتے ہیں۔اس کا کامل اور حقیقی مصداق ائمہ ہدی علیہم السلام ہیں اور ان ذوات مقدسہ کی اتباع میں موجودہ زمانہ میں امام خمینی کی شخصیت ہے۔

چنانچہ آپ نے بھی اپنے وصیت نامے میں مناجات شعبانیہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے ضمن میں کمال الانقطاع کی بحث کی ہے اور اسی وصیت نامے میں دعائے عرفہ کا بھی تذکرہ ہے۔

دعائے عرفہ کا درج ذیل اقتباس وصیت نامے میں ذکر کیا ہے۔

لَايَكُوۡنُ لِغَيۡرِكَ مِنَ الظُّهُوۡرِ مَالَيۡسَ لَكَ حَتّٰى يَكُوۡنَ هُوَالۡمُظۡهِرَ لَكَ مَتٰى غِبۡتَ حَتّٰى تَحۡتَاجَ اِلٰى دَلِيۡلٍ يَدُلّ عَلَيۡكَ وَ مَتٰى بَعُدۡتَ حَتّٰى تَكُوۡنَ الاٰ ثَارُ هِىَ الّتِى تُوۡصِلُ اِلَيۡكَ عَمِيَتۡ عَيۡنٌ لاَ تَرَاكَ عَلَيۡهَا رَقِيۡباً (18)

کیا تیرے علاوہ کسی چیز کا ایسا ظہور ہے جو تیری ذات میں نہ ہو اور وہ چیز آکر تجھے ظاہر کرے ؟ تو غائب ہی کب ہوا ہے کہ کسی رہنما کی ضرورت پڑے جو تیری ذات کی طرف رہنمائی کرے تو دور ہی کب ہوا ہے تاکہ تیرے آثار تیری ذات کے پہچاننے کا وسیلہ بنیں۔ وہ آنکھ اندھی ہے جو تجھے اپنے اوپر نگران نہ سمجھے۔

صحیفہ سجادیہ کے تذکرہ کے ضمن میں یہ بحث چھیڑی:

وَ اجْعَلْ فِكْرَهُ وَ ذِكْرَهُ وَ ظَعْنَهُ وَ اِقَامَتَهُ فِيْكَ وَ لَكَ

خداوند اس مجاہد جنگجو کے ذکر و فکر اس کے سفر و قیام کو اپنی ذات میں اور اپنی ذات کے لئے قرار دے۔

امام خمینی نے اپنے وصیت نامے میں صحیفہ فاطمیہ کا بھی ذکر کیا ہے چونکہ خود حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا بھی ظالمین کے خلاف جنگ و جہاد کا نمونہ ہیں۔ چنانچہ آپ کا وہ معروف خطبہ جو تقریباً" قرآن کے ایک سپارے کے برابر ہے(19) اس میں آپ نے حکومت وقت سے کس انداز میں جواب طلبی کی ہے اور انہیں رسوا کیا ہے۔ خطبے کے آغاز میں حضرت زہرا نے یہ آیہ کریمہ تلاوت فرمائی۔

اَفَحُكْمُ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْماً لِقَوْمٍ يُوْقِنُوْنَ (20)

آیا یہ لوگ جاہلیت کا حکم چاہتے ہیں جب کہ اہل یقین کے لئے اللہ سے بہتر حکم کرنے والا کوئی نہیں ہے۔

جناب سیدہ گویا اس خطبے میں یہ فرما رہی ہیں کہ جو قوم بھی قرآن پر عمل نہ کرے ان کی حکومت جاہلیت کی حکومت ہے اگرچہ اس پر دین کا رنگ چڑھا ہوا ہو نیز اس خطبے میں جو آپ نے صدر اسلام میں اس جرأت و شجاعت سے بیان فرمایا ہمیں توحید کے مسلم اصول کی طرف دعوت دے رہی ہیں اور فرما رہی ہیں ہر قسم کے شرک اور غیروں کی طرف مائل ہونے سے پرہیز کرو جو آج لاشرقی و لاغربی کی صورت میں نمایاں ہے اور سب کے اندر ہمت و شجاعت کی روح بھی ڈال دی ہم سب کو جنگ و جنگجوئی کا عاشق بھی بنادیا تاکہ کہیں ایسا نہ ہو دشمن ہمارے اندر کاہلی و سستی محسوس کر کے ہم سے غلط استفادہ کر لے۔

امام سجاد علیہ السلام نے صحیفہ سجادیہ کی صورت میں عرفان کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا اور کوفہ اور شام میں اپنے حماسہ و شجاعت کے جوہر بھی دکھائے لیکن کربلا میں مصلحت یہ تھی

کہ آپ جام شہادت نوش نہ کریں۔ امام زین العابدین علیہ السلام خود فرماتے ہیں کہ شب عاشور میں بیماری کی حالت میں اپنے بابا کے خیمے کے سامنے کھڑا ہوا تھا میں نے دیکھا کہ میرے بابا نے اپنے تمام اصحاب کو اکٹھا کیا اور ان سے فرمایا کہ کل اس سرزمین پر شہادت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔ ان لوگوں کو مجھ سے عداوت ہے۔ میں نے اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے اٹھالی ہے اگر جانا چاہو تو یہاں سے جاسکتے ہو۔ رات تاریک ہے اس کی تاریکی سے فائدہ اٹھاؤ اور یہاں سے چلے جاؤ۔ حضرت عباسؑ بن علیؑ سب سے پہلے اٹھ کر کھڑے ہوئے اور فرمایا کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم آپ کو تنہا چھوڑ جائیں۔ اس کے بعد ایک ایک کر کے باقی اصحاب بھی عرض ادب کر کے اپنی وفا کا اظہار کرنے لگے۔ (21)

امام سجاد علیہ السلام مزید فرماتے ہیں کہ جناب حبیب بن مظاہر اسدی نے میرے بابا سے پوچھا کہ آیا کل زین العابدینؑ بھی شہید ہو جائیں گے ؟ تو میرے بابا نے جواب میں فرمایا "نہیں ھوابو ثمانیه ائمة وہ شہید نہیں ہوں گے چونکہ وہ آٹھ اماموں کے والد ہیں یعنی تقدیر الٰہی یہ ہے کہ آٹھ امام ان سے متولد ہوں ورنہ وہ بھی جام شہات نوش کرتے۔

امام سجاد علیہ السلام کو جب لوہے کی بھاری زنجیروں میں اسیر کر کے کوفہ لے جایا گیا تو دارالاماۃ میں آپؑ نے فرمایا۔

اَبا لِقَتلِ تُهَدِّدُنا فَاِنّ كَرَامَتَنا اَلشّهادَةُ ۔ (22)

آیا ہمیں قتل سے ڈراتے ہو جب کہ شہادت ہمارے لئے شرف ہے۔

یہی امام جو صاحب مناجات و دعائے صحیفہ کاملہ ہیں کوفہ میں فرماتے ہیں کہ شہادت ہمارے لئے شرف ہے اور شام میں فرماتے ہیں کہ ہم منٰی کے وارث ہیں فقط کعبہ کے ہی نہیں بلکہ منٰی کے بھی وارث ہیں۔ شام میں سب سے پہلی بات ہی یہ کی کہ ہم قربانی کی سرزمین کے وارث ہیں ہم نے اگرچہ وہاں پر جانور ذبح نہیں کئے لیکن ہمارے شہیدوں کی شہادت نے اس سرزمین کو زندہ کر دیا ہے اور چونکہ اس زمین کو ہم نے احیاء کیا ہے لہذا وہ ہماری ہے چونکہ اسلام کا قانون یہ ہے کہ

''مَنْ اَحْییٰ اَرْضاً مَیْتَۃً فَھِیَ لَہ'' (23)

بنجر زمین کو جو بھی آباد کرے وہ اسی کی ہے۔

منٰی کی زمین اس سے پہلے بنجر تھی ہم نے شہید دے کر اسے آباد کیا ہے ایسی طرح ہم نے مکہ کی زمین کو بھی آباد کیا ہے جو مشرکوں سے نفرت و بیزاری کی زمین ہے۔ جو ہمارا ساتھ نہیں دے گا وہ کعبے میں بھی پناہ لے لے تو بھی خدا اسے امان نہیں دے گا۔ اسی وجہ سے ابن زبیر نے جب امام حسینؑ اور امام سجاد علیہ السلام کا ساتھ نہیں دیا اور کعبہ میں پناہ لی تو مروانیوں نے کوہ ابو قبیس کے اوپر منجنیق نصب کر کے کعبے کو ہی پتھروں سے ویران کر دیا اور ابن زبیر کو گرفتار کر کے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ چونکہ جو بھی فرزند کعبہ اور وقت کے امام کی مدد نہ کرے وہ کعبے میں بھی پناہ لے تو بھی محفوظ نہیں رہ سکتا۔ چونکہ گارے اور پتھر کا کعبہ تو بارہا گرایا اور بنایا جا چکا ہے۔ ابرہہ نے جب قبلہ کو ویران کرنے کی کوشش کی تو خدا نے اسے یہ مہلت ہرگز نہ دی لیکن مروانی قبلہ کو ختم نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ ابن زبیر کو گرفتار کرنا چاہتے تھے لہذا خداوند نے انہیں اتنی مہلت دیدی کہ کعبہ کو ویران کر کے ابن زبیر کو گرفتار کر لیں اور بعد میں اسے دوبارہ تعمیر کر دیں۔(24)

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم نے کعبے کو آباد کیا ہے لہذا جو ہماری مدد چھوڑ کر کعبے میں جا کر پناہ لے وہ محفوظ نہیں ہے۔ غرض یہ کہ یہ ساری سرزمینیں ہم نے آباد کی ہیں اور چونکہ ہم نے آباد کی ہیں ہم ہی ان کے وارث بھی ہیں۔ ان سے جو تاثیر لینا چاہتا ہے اسے چاہئے ہمارے ذریعے سے لے۔

خلاصہ کلام یہ کہ عارف آزاد ہونے اور آزاد کرنے کے لئے جنگ لڑتا ہے۔ وہ کبھی بھی غنائم جنگی کی بات نہیں کرتا۔ اس کی فکر میں بھی نہیں ہوتا کہ جنگ کے بعد غنائم جنگ تقسیم ہوں گے بلکہ اس کی سب سے بڑی غنیمت اس کی آزادی ہوتی ہے۔ چونکہ اہل معرفت لڑتے ہی فقط آزادی کی لئے ہیں نہ فقط لوگوں سے آزادی بلکہ دنیا سے آزادی کے لئے بھی لڑتے ہیں۔ وہ جنگجو جس کے لئے امام سجادؑ دعا کرتے ہیں وہ جب محاذ سے واپس آتا

ہے اسی دعا کا مضمون غنیمت کے طور پر ساتھ لاتا ہے یعنی واپس آکر دنیا کی فکر میں نہیں ہوتا۔ امام خمینی جب طویل جلاوطنی کی مدت گزار کر واپس وطن آرہے تھے تو آپ سے پوچھا گیا کہ کیا محسوس کررہے ہیں؟ آپ نے فرمایا "کچھ بھی محسوس نہیں کررہا۔"(25) چونکہ ایک عارف جو غنیمت ساتھ لاتا ہے وہ دنیا سے آزادی ہے نہ کہ دنیا کی قید واسارت پس عارف جنگ بھی کرتا ہے جنگ کو اہمیت بھی دیتا ہے اس کا مال غنیمت حریت ہوتا ہے۔ غیر عارف آدمی بھی جنگ لڑتا ہے۔ زاہد و عابد بھی جنگ کرتے ہیں لیکن دیگر مقاصد کے لئے کہ بزدل لوگ بھی مومنین کے ساتھ لڑتے ہیں لیکن بے چارے اس سے بے خبر ہیں کہ یہ جنگ دین کے چاہنے والوں اور ایمان کے وارثوں کے خلاف لڑ رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ سارے انسانوں کی مانند بزدل آدمی میں بھی غضب ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر جذب و دفع کی قوت رکھی ہے بزدل آدمی کے اندر بھی یہ قوت موجود ہے لیکن بزدل ہمیشہ دین کے دشمنوں سے ڈرتا ہے اور اپنا غضب و غصہ دین کے ماننے والوں کے خلاف ظاہر کرتا ہے۔ لہذا شاید ہی کوئی بزدل ہو جس نے انقلاب اسلامی اور دین کے خلاف کوئی تہمت نہ لگائی ہو یہ جو بعض لوگ جنگ اور مجاہدین کے خلاف باتیں بناتے تھے ان کی غیبت کرتے اور ان پر بے جا تہمتیں لگاتے تھے اس کا نفسیاتی عامل ان کا خوف ہی تھا چونکہ جو کچھ کرتے تھے سب غضب کے آثار ہیں لیکن یہ بے چارے سمجھتے نہیں اور سوچتے نہیں کہ اپنا غضب کس کے خلاف ظاہر کررہے ہیں۔ غیبت کرنے والے تہمت لگانے والے اور تکفیر کرنے والے بزدل سب کے سب قرآن و عرفان کے خلاف جنگ کررہے ہیں اور گمان کرتے ہیں کہ میدان جنگ سے باہر ہیں لیکن یہ ان کا گمان باطل ہے چونکہ وہ دشمنوں کے مقابلے میں میدان سے باہر ہیں لیکن دوستوں کے مقابلے میں باقاعدہ مشغول جنگ و نبرد ہیں۔ غیبت کرنے والا اور تہمت لگانے والا باقاعدہ حالت جنگ میں ہے۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

اَلْغِیْبَۃُ جُہْدُ الْعَاجِزِ (26)

عاجز انسان کی جدو جہد غیبت ہے۔

البتہ یہ ایک نفسیاتی جنگ ہے جو دوستوں کے خلاف لڑی جاتی ہے امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں ایسے مقام پر فائز ہوں کہ اگر روئے زمین پر موجود تمام انسان کافر ہو جائیں یا طبعی یا اعتقادی موت مر جائیں تو بھی مجھے کسی قسم کی تنہائی کا احساس نہیں ہو گا۔

لَوْمَاتَ مَنْ بَیْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَمَا اسْتَوْحَشْتُ بَعْدَ اَنْ یَکُوْنَ الْقُرْآنُ مَعِیَ (27)

یعنی اگر مشرق و مغرب کے درمیان رہنے والے سب ختم ہو جائیں تو مجھے کسی قسم کی وحشت و تنہائی محسوس نہیں ہو گی کیونکہ قرآن میرے ہمراہ ہے۔

امام سجاد علیہ السلام جب آیت مالک یوم الدین کی قرات کرتے تو اسے اتنا تکرار کرتے حتٰی کہ قریب الموت ہو جاتے دوسری طرف زین العابدین علیہ السلام ہی ایسی شخصیت ہیں کہ تمام اہل دنیا کے ساتھ جنگ کر کے بھی وحشت زدہ نہیں ہوتے۔

آپ کی یہ شجاعانہ روح وہی ہے جس نے صحیفہ سجادیہ کی سراپا عرفانی دعائیں بھی طلب کی ہیں۔ عارف کی دعا حماسہ و جنگ کو بھی عرفانی رنگ عطا کر دیتی ہے۔ چنانچہ جب امام چہارم کو کوفہ کے اندر دارالامارۃ میں موت کی دھمکی دی جاتی ہے تو آپؑ فرماتے ہیں کہ شہادت ہمارا اشرف ہے۔ ابن زیاد کو مخاطب ہو کر فرمایا: ”اگر میرے قتل پر سنجیدہ ہو تو پھر اس قافلے کے لئے ایک محرم تلاش کرو چونکہ میرے علاوہ اب ان کا محرم کوئی نہیں ہے اور بغیر محرم کے یہ سفر طے نہیں ہو سکتا۔“

شام میں حضرت زینب کبرا علیہا السلام نے یزید ملعون کے دربار میں سب کے سامنے شجاعانہ طور پر خطاب (28) کیا۔ اسی دربار میں بنو امیہ کے ترجمان کی باتوں کے جواب میں امام سجاد علیہ السلام نے فرمایا۔

اَیّھَا الْخَاطِبَ اِشْتَرَیْتَ سخطَ الْخَالِقِ بِرِضَی الْمَخْلُوق (29)

اے بولنے والے تو نے مخلوق کی خوشنودی کی خاطر خالق کی ناراضگی مول لی ہے۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ ایک انسان متعدد شہید دینے کے بعد کئی منزلوں تک اسیر رہے ، ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑے ہوں' گلے میں طوق آویزاں ہوں' اسے اپنے عزیزوں کے ہمراہ لوگوں کے سامنے تماشا بنایا جائے' دروازہ شام پر کافی دیر تک ٹھہرایا جائے۔ اس کے بعد مجمع عام میں لا کھڑا کیا جائے یہ ساری سختیاں جھیلنے کے بعد جب وہ دیکھے کہ منبر پر چڑھ کر کوئی شخص علی بن ابی طالبؑ کو ناسزا کہہ رہا ہے اسی حالت میں یہ اسیر پکار اٹھے کہ اے خطیب تو نے اپنی اس بات سے مخلوق کی خوشنودی کے لئے خدا کا غضب خرید لیا ہے۔

یہ شجاعانہ روح کا کرشمہ ہے اور ایسا کام کونسی قدرت اور طاقت سے ممکن ہوا ہے ؟

آج تو اسلامی حکومت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں بٹی ہوئی ہے اس کے بر خلاف اس زمانے میں تمام اسلامی ممالک ایک مرکزی حکومت کے تحت تھے یعنی موجودہ فرانس سے لے کر ایشیاء کے بڑے علاقے تک سب یزید کی حکومت تھی۔

اس کے باوجود امام علیہ السلام نے اس قسم کے حاکم کے سامنے آواز اٹھائی اور شجاعت و حماسے کا مظاہرہ کیا۔ یہ حماسہ دکھانے والا وہی انسان ہے جو صاحب دعا و مناجات ہے اسی سے روح شجاعت روح دعا و مناجات کے ساتھ اکٹھی ہو گئی۔

اس کے بعد امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اب مجھے بھی ان لکڑی کے تختوں پر جانے کی اجازت دو تا کہ ایسی بات کروں جس سے خدا راضی ہو جائے۔ آپ نے منبر نہیں کہا بلکہ اسے لکڑی کے تختے کہا۔ پہلے تو یزید نے اجازت نہیں دی لیکن جب دیکھا کہ رائے عامہ خلاف ہو رہی ہے تو فوراً آپ کو بولنے کی اجازت دی گئی۔ امام زین العابدین علیہ السلام لکڑی کے انہی تختوں پر چڑھے اور ایسا حماسی خطاب کیا جس سے شامیوں کے آنسو نکل آئے۔

آپؑ نے ایک خطبے کے ذریعے شام کی سیاسی فضا کو یکسر تبدیل کر دیا۔ شامیوں نے یزید اور اس کی سنگین حکومت کی کامیابی کا جشن برپا کیا ہوا تھا اور خوشیاں منا رہے تھے لیکن آپ کے ایک خطبے نے ان کی خوشیوں کو عزا میں تبدیل کر دیا اور ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ در حقیقت یہ آپ کی حماسی روح کا اثر تھا۔

امام سجاد علیہ السلام پورے واقعہ کربلا میں موجود تھے یہی وجہ ہے کہ شب نہم اور شب عاشور کے ناقابل فراموش حوادث و واقعات آپ کو معلوم تھے۔ ہر شہید سے آپ کو ایک خاص انس حاصل تھا۔ آپ نے سب کچھ نزدیک سے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ اپنے والد بزرگوار کے باقاعدہ مشیر اور مورد اعتماد تھے اسی وجہ سے امام حسین علیہ السلام نے تمام اسرار امامت آپ کو سونپ دیئے لیکن بنی امیہ کی ظالم حکومت سے مخفی رکھنے کے لئے کہ مبادا انہیں حضرت سجادؑ کی امامت اور حجت خدا ہونے کا علم ہو جائے آپؑ نے سب کو حکم دیا کہ اپنے شرعی احکام اور مسائل حضرت زینب کبریٰ سے پوچھیں اور فرمایا کہ راستے میں زین العابدین سے سوال نہ پوچھنا کہ مبادا وہ آپ کے علم کی طرف متوجہ ہو جائیں۔ حضرت زینبؑ بھی امام سجاد علیہ السلام سے مسائل پوچھ لیتیں اور ہر سوال کرنے والے کو جواب دیتیں۔ خود حضرت سجاد علیہ السلام کسی کو بلاواسطہ کوئی حکم نہیں دیتے تھے۔ لہذا جب کوفہ میں روٹی اور کھجوریں بچوں کو دی گئیں تو ایک بچے نے کہا کہ

عَمّتِیُ تَقُوْلُ اِنّ الصّدَقَةَ عَلَیْنَا حَرَامُ‘‘(30)

ہماری پھوپھی جان کہتی ہیں کہ صدقہ ہم پر حرام ہے۔

یہ انہی احکام کا ایک نمونہ ہے جو حضرت زینبؑ امامؑ وقت سے پوچھ کر بیان کرتی تھیں۔

امام رضا علیہ السلام کے ایک مناظرے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام سجاد علیہ السلام کو زندان میں ڈالا گیا تھا۔ چنانچہ فرقہ واقفیہ کے پیروکار ایک فرد نے امام رضا علیہ السلام سے پوچھا اگر آپ امام ہیں تو پھر آپ کو امام ہفتم حضرت موسیٰ کاظم علیہ السلام کے جنازے میں شرکت کرنی چاہیئے تھی کیونکہ امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی رحلت جب بغداد میں ہوئی تو آپ مدینہ میں تشریف فرما تھے۔

امام رضا علیہ السلام نے جواب دیا کہ تمہیں میری امامت میں شک ہے لیکن امام زین

العابدین علیہ السلام کی امامت میں تو شک نہیں ہے جب امام حسین علیہ السلام کو دفن کیا جارہا تھا اس وقت حضرت سجاد کوفہ کے زندان میں زنجیروں سے جکڑے ہوئے تھے تو جس خدا نے حضرت سجاد کو کوفہ کے زندان میں زنجیروں سے نکال کر کربلا پہنچایا ہے تاکہ اپنے والد گرامی کے دفن میں شریک ہو سکیں اسی خدا نے مجھے مدینے سے بغداد پہنچایا تاکہ اپنے والد کے نماز جنازہ میں شریک ہو سکوں۔(31)

اس روایت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اہل بیتؑ کو کوفہ کے اندر بھی زندان میں رکھا گیا ہے۔ لیکن ان تمام مصائب اور رنج و غم نے امام سجاد علیہ السلام کی حماسی روح میں کوئی منفی اثر نہیں چھوڑا جس کی دلیل یہ ہے کہ شام میں کوئی چیز آپ کے اعتراض میں مانع نہ بن سکی۔ اسی طرح یہ تمام رنج و غم حضرت زینبؑ کے اعتراض کو بھی نہ روک سکے چنانچہ آپؑ کھڑی ہوئیں اور فرمایا

ابحننت یا یزید حیث اخذت علینا اقطار الارض و آفاق السماء فاصبحنا نساق کما تساق الاساریٰ ان بنا علی اللّٰہ ہوانا و بك علینا کرامةً و ان ذلك لعظم خطرك عنده فشمخت بانفك ونظرت فی عطفك جذلان مسروراً حیث رایت الدنیا لك مستوثقته والامور متّةً حین صفا لك ملکنا و سلطاننا مهلاً مهلاً (32)

اے یزید تو یہ گمان کرتا ہے کہ ہم پر زمین کی حدود تنگ کر کے اور آسمان کے افق روک کر اور ہمیں اسیروں کی طرح ادھر اُدھر پھرا کر تو اللہ کی بارگاہ میں محترم بن گیا ہے اور ہم ذلیل و خوار ہیں؟ تیرے خیال میں ہم پر غالب آنا تیرے لئے شان و شوکت کا سبب بنا ہے؟ اسی گمان میں تو نے ناک بھوں چڑھائی ہوئی ہے اور تکبر کے ساتھ اتراتا ہے، خوش ہو رہا ہے کہ دنیا تیرے اختیار میں ہے تو سوچتا ہے کہ تیرے سارے کام مرضی کے مطابق ہو رہے ہیں اور ہماری رہبری اور مقام تیرے لئے صاف اور ہموار ہے ذرا سنبھل کے چل!.....

آٹھویں فصل

میدان جنگ میں عارف کی مناجات

جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے الٰہی انسانوں کا شیوہ ہے کہ ان کی رحمت غضب پر فائق ہوتی ہے۔ وہ اس ذات الٰہی کے مظہر ہیں جس کی رحمت اس کے غضب پر سبقت رکھتی ہے۔ جب رحمت غضب کے لئے امام بن جائے اور غضب اس کا ماموم ہو تو جس طرح ہر ماموم پر اپنے امام کا رنگ غالب ہوتا ہے اسی طرح الٰہی انسانوں میں رحم ودرگزر کا رنگ غالب ہوتا ہے۔ جہاں کہیں قہر وغضب پہ عمل کرتے ہیں وہاں بھی در حقیقت رحمت پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ بالکل اس جراح کی مانند ہوتے ہیں جو مریض کا اگر کوئی عضو کاٹتا ہے تو حقیقتاً غضب کی شکل میں رحمت پر عمل پیرا ہوتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کی ذات میں جلال وجمال دونوں ہیں جمال الٰہی رحمت وعفوودرگزر جیسی صفات کا باعث ہے جب کہ جلال قہر وغضب کا سبب ہے۔ اس اعتبار سے جلال وجمال ایک دوسرے کے بالمقابل ہیں۔ لیکن ذات خداوندی کے جمال مطلق کا کوئی مقابل نہیں ہے اور جس جمال کے مقابلے میں جلال فرض کیا جاتا ہے وہ جمال مقید ہے نہ کہ جمال مطلق بلکہ جمال مطلق رحمت مطلقہ کی مانند ہے یا پھر ہدایت مطلقہ کی طرح ہے کہ جس کے مقابل کوئی چیز مفروض نہیں ہے بنابریں ذات خداوند تعالیٰ جمال محض ہے اور اس کے تمام افعال جمیل ہیں۔ لہذا جب قصاص کا حکم بیان فرمایا ہے تو یوں خطاب کیا:

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ (1)

قصاص میں تمہاری حیات ہے۔ یعنی انسانیت پر رحم کرتے ہوئے حکم قصاص مقرر کیا ہے۔جب جنگ وقتال کا حکم دیا تو یوں فرمایا:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُو اسْتَجِيْبُو اِللّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (2)

اے ایمان والوں خدا اور اس کا رسول کی دعوت پر لبیک کہو اسی میں تمہاری حیات ہے۔ قصاص قتل اگرچہ بظاہر موت کے گھاٹ اتارنے کا نام ہے لیکن حقیقت میں لوگوں کے لئے عامل حیات ہے۔ جہاد و دفاع بھی اسی طرح ہے چونکہ جہاد کے دوران بھی بعض افراد شہید ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے اندر آزادی کی روح پھونک کر انہیں زندہ کر دیتے ہیں۔ لوگوں سے ذلت اور ستم پذیری کی روح ختم کر دیتے ہیں اور یہ سارے امور بجائے خود جمال ہیں۔ پس جمال مطلق کا کوئی مقابل نہیں ہے بلکہ جمال مقید کے مقابلے میں جلال ہے۔

جو افراد اخلاق الٰہی سے متصف ہوتے ہیں ان کے اندر رحمت و جمال دیگر اوصاف کے امام ہوتے ہیں انسان کامل کے تمام اوصاف اس کی ایک برجستہ اور نمایاں صفت کی امت شمار ہوتے ہیں اور چونکہ عارف کی رحمت اس کے غضب کی امام ہوتی ہے لہذا اس کے سارے اعمال رحمت کی اساس پر ہوتے ہیں۔ عارف رحمت کے چہرے کے ہوتے ہوئے جنگ کی بھی تصدیق کرتا ہے' دفاع کو بھی رحمت کے پہلو سے قبول کرتا ہے' میدان جنگ میں جائے تو جانے سے پہلے دعا مانگتا ہے' میدان کارزار میں شہادت کے لئے دعا کرتا ہے' جنگ کے دوران اس کی ساری دعائیں عارفانہ ہوتی ہیں۔ عارف کی جنگ دو دعاؤں اور دو مناجاتوں کے اندر لپٹی ہوتی ہے چونکہ عارف کی جنگ و صلح بلکہ پوری حیات عرفان ، رحمت اور جمال کے سائے میں ہوتی ہے۔

علی علیہ السلام جہاں پر کفر و نفاق و ستم کے خلاف جنگ اور حماسہ کا سب سے اعلیٰ نمونہ ہیں، مہر و محبت اور عرفان کا بھی اعلیٰ نمونہ ہیں۔ آپؑ نے جنگ کے موقعوں پر متعدد

دعائیں مانگی ہیں۔ انہی میں سے ایک دعا یہ ہے کہ خدایا اگر ہمیں دشمن پر فتح نصیب ہوتی ہے تو ہمیں اتنی توفیق عطا فرما کہ قہر و غضب کی خو ہمارے اندر زندہ نہ ہو تا کہ ہم کینہ توز انتقام لینے والے نہ بنیں اور اگر دشمن فتح پائے تو اس وقت ہماری موت کو شہادت کی صورت میں مقرر فرما۔ فرماتے ہیں

اِنْ اَظْهَرْتَنَا عَلٰی عَدُوِّنَا فَجَنِّبْنَا وَ سَدِّدْنَا لِلْحَقِّ وَ اِنْ اَظْهَرْتَهُمْ عَلَیْنَا فَارْزُقْنَا الشَّهَادَةَ وَ اعْصِمْنَا الْفِتْنَةَ(3)

بارالہا اگر تو نے ہمیں دشمنوں پر غلبہ دیا تو ظلم سے ہمارا دامن بچانا اور حق پر ہمیں قائم رکھنا اور اگر دشمنوں کو ہم پر غلبہ دیا تو ہمیں شہادت نصیب کرنا اور فتنے سے بچا کر رکھنا۔ یعنی اے اللہ فتح کی صورت میں ایسا نہ ہو کہ ہم حق و عدالت کی سرحد کو پھلانگ جائیں ، ہم اپنی تشفی خاطر کے لئے جنگ نہیں لڑتے بلکہ فقط تیری رضاء کی خاطر اور تیرے دین کی حفاظت کے لئے لڑتے ہیں ایسا نہ ہو کہ جنگ کے دوران ہمارے اوپر کینہ و نفرت مسلط ہو جائے اور دشمن کو حد سے زیادہ نقصان پہنچا جائیں۔ اگر ہم فاتح ہوں تو ہماری مدد فرما ہمیں، حق پر قائم رکھ اور ظلم و ستم سے نجات عطا فرما۔ اگر ہم قتل ہو جائیں اور دشمن فتح پائے تو ہماری موت کو شہادت قرار دے۔ خداوندا ہم مٹی ، پانی اور جہان مادہ کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں۔ ہم اس لئے لڑ رہے ہیں تا کہ تیرے نام کا بول بالا اور ظالموں کا سر نیچا ہو جائے۔

كَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا وَ كَلِمَةُ الظَّالِمِیْنَ هِیَ السُّفْلٰی

ہم مکتب حق زندہ رکھنے اور باطل کو درگور کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں تا کہ اس کے سائے میں وطن اور افراد کی آزادی بھی حاصل ہو جائے۔

اگر دشمنوں کے ساتھ جنگ و نبرد مذکورہ مقاصد کے لئے ہے تو اس کے معنی یہ ہیں

کہ ہمارے تمام امور کی امامت جمال ور حمت کے ہاتھ میں ہے اور ہمارے غضب پر رحمت کا غلبہ ہے اس صورت میں ہماری موت شہادت کی موت ہو گی اور ہماری فتح عارفانہ فتح ہو گی ۔ تمام اہل حماسہ عرفاء میدان جنگ میں یہی مناجات کرتے ہیں۔ وہ سب جام شہادت پیتے وقت یہی کہتے ہیں۔

فُزتُ وَ رَبِّ الکَعبَةِ(4)

رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔

چونکہ ہمارا مقصد زندہ رہنا نہیں بلکہ معاشرے کو زندہ رکھنا ہے چنانچہ یہ مقصد یا قتل ہو کر حاصل ہوتا ہے یا قتل کر کے حاصل ہو گا۔

مذکورہ بالا جملہ

فُزتُ وَ رَبِّ الکَعبَةِ

علی علیہ السلام کی شہادت سے بھی پہلے آپ کے پروردہ ایک شاگرد نے جنگ میں شہادت کے وقت کہا تھا۔ یہ عبارت نہ سب سے پہلے علی علیہ السلام نے بیان فرمائی ہے اور نہ ہی آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ امیر المومنین علیہ السلام کے درجات و مقامات اس قدر زیادہ ہیں کہ امام خمینی اپنے وصیت نامے میں لکھتے ہیں:

قرآن و عترت کے معنوی اسرار اور کمالات غیبی اس قدر زیادہ ہیں کہ مجھ جیسے انسان کے لئے انہیں بیان کرنا اگر محال نہ بھی ہو تو دشوار ضرور ہے۔

علیؑ کو فقط اسی حد تک محدود نہیں سمجھنا چاہئے کہ جب شہید ہوئے تو فرمایا:

فُزتُ وَ رَبِّ الکَعبَةِ

چونکہ یہ جملہ تو آپ کے تربیت یافتہ شاگرد نے آپ سے پہلے شہادت کے وقت بولا ہے ، جب کہ آپ کا مقام اس سے کہیں بڑھ کر ہے چونکہ جب علیؑ ملکوت کی قلمرو میں ہوتے ہیں یا عالم جبروت کی ابتداء میں ہوں تو دوسرے بھی آپ کے ہمراہ وہاں تک جا سکتے ہیں لیکن جب آپؑ اس مقام سے آگے بڑھتے ہیں تو دوسرے فوراً پکار اٹھتے ہیں۔

لَوْ دَنَوْتُ اَنْمُلَةً لاَ حْتَرَقْتُ(5)

اگر ایک سر انگشت بھی آگے بڑھے تو جل جائیں گے۔

غرض یہ کہ جو غضب پر رحمت کی سبقت کا اعلیٰ نمونہ قرار پائے ہمیشہ اس کی رحمت ہی غضب کی رہنما ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ بغض فی اللہ کے عنوان سے جنگ لڑتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ عارف دراصل کسی خاص فرد یا گروہ کے لئے رحمت ہوتا ہے یا تمام انسانیت کے لئے رحمت ہے۔ انسان کامل رحمتہ اللعالمین ہوتا ہے اور جب تمام عالمین کے لئے رحمت ہوتا ہے تو پھر سالکین کوئے حق کی راہ میں حائل ہر راہزن کو نابود کر دیتا ہے۔ چونکہ شیطان اور اس کی ذریت کی ماموریت یہ ہے کہ راہیان حق پر راستہ بند کر دیں شیطان نے قسم کھائی ہے کہ:

لاَ قْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيمَ(6)

میں تیرے سیدھے راستے پر ان کے لئے کمین گاہ بناؤں گا انہیں اپنا اسیر بناؤں گا جب وہ میری قید میں آجائیں گے تو ان پر بیٹھ کر سواری کروں گا اور ان کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔

لاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ اِلاَّ قَلِيْلاً (7)

آدم کی اولاد کو احتناک کروں گا یعنی ان کے گلے میں رسی ڈال دوں گا۔ شیطان نے دو دھمکیاں دی ہیں ایک یہ کہ اہل سلوک کی راہ میں کمین گاہ بنا کر بیٹھوں گا۔ دوم یہ کہ ان کو اسیر بنا کر ان کے گلے میں رسی ڈال کر سواری کروں گا اور جدھر چاہوں گا ان کا رخ موڑ دوں گا۔

اولیاء الٰہی جو رحمت خدا کا مظہر ہیں تمام انسانیت کے لئے رحمت ہیں لہذا معاشرے کی راہ میں حائل تمام مزاحمتوں کو بر طرف کرنا ان کا کام ہے۔ لیکن یہ مقصد اندرونی اور بیرونی شیطان کو گوشہ نشین بنائے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ کیونکہ شیطان کو ہٹانا جنگ کے بغیر ناممکن ہے بلکہ کسی بھی دشمن کو جنگ کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بنیادی طور پر شیطان کی ساری کوشش اور پوری عمر انسانیت کے ساتھ دشمنی کے لئے ہے۔ لہذا انبیاء اللہ

اور وہ اولیاء اللہ جو اوصاف و اخلاق انبیاء سے متصف ہیں انہیں چاہئے کہ انسانیت کے دشمن تمام مزاحمت کرنے والوں کو راستے سے ہٹا دیں۔ لا محالہ عرفاء حماسہ و شجاعت سے مانوس ہوتے ہیں وہ ہر گز جنگ سے گریزاں نہیں ہوتے لیکن عرفاء ہمیشہ جنگ کو رحمت کے روپ میں لیتے ہیں اور ایک عبادت سمجھ کر لڑتے ہیں سرحدی محافظوں کے لئے امام سجاد علیہ السلام کی دعا غضب پر رحمت کی سبقت کی علامت ہے۔ چونکہ امام علیہ السلام کے وجود مبارک میں بھی رحمت کا غضب پر غلبہ ہے لہذا سرحدی محافظوں کے لئے دعا فرماتے ہیں کہ بار الٰہ ان مجاہدوں کو پہلے عارف بنا اور بعد میں جنگجو۔ چونکہ عرفان جنگ پر مقدم ہے اسی وجہ سے آپ کی اس دعا کا بڑا حصہ تہذیب نفس، تزکیہ اخلاق، تربیت نفوس اور تطہیر دل کے بارے میں ہے۔ امام فرماتے ہیں خدایا یہ لوگ جو سرزمین اسلام کی حفاظت کے لئے جنگ کی اگلی صفوں میں کوشش کر رہے ہیں اور جہاد میں مشغول ہیں ان کے دلوں کو اپنی یاد سے گرما دے، دنیا کی محبت ان کے دلوں سے خارج کر دے، گھر بار اور دیار و شہر سے ان کے دلوں کا رابطہ منقطع کر دے۔ جب تیرے علاوہ سب کچھ فراموش کر دیں گے اس وقت ان کے دل تیرے جلوے کے لئے آمادہ ہوں گے۔ یہ ایک عارفانہ دعا ہے۔ عارف جب بھی دعا مانگتا ہے اس پر عرفان کا رنگ چڑھا دیتا ہے۔

معمولی انسان مٹی پانی اور سمندر کے لئے لڑتا ہے۔ جب تک اسے آب و خاک کی یاد نہ ستائے وہ جنگ نہیں لڑتا۔ اہل و عیال کی فکر کے بغیر اس سے جنگ نہیں ہو سکتی۔ لیکن جب اپنے وطن کو فراموش کر بیٹھے ہر گز اسلحہ نہیں اٹھاتا، جب اپنے اہل و عیال کو بھلا بیٹھے اس کے اندر لڑنے کا کوئی محرک نہیں ہوتا۔ اسی طرح معمولی جنگجو کو اگر معدنیات اور تیل کے ذخائر یاد نہ رہیں تو اس کے لئے جنگ کا کوئی مقصد ہی نہیں ہوتا۔ لیکن عارف اس وقت اسلحہ اٹھاتا ہے جب ان ساری چیزوں کی یاد اس کے دل سے نکل جائے چونکہ وہ تیل یا مٹی اور پانی کے لئے نہیں لڑتا بلکہ وہ لڑتا ہے تاکہ

لِتَکُونَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا وَ کَلِمَةُ الَّذِیْنَ

كَفَرُوا السّفلىٰ(8)

کلمہ خدا کا بول بالا اور کافروں کا سر نیچا ہو جائے۔

جب دین محفوظ ہو جائے تو وہ زمین کی حفاظت کو بھی گرانبہا بنا دیتا ہے۔ محفوظ دین کا یہ کہنا ہے کہ۔

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَالِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ(9)

جو اپنے مال کی حفاظت کرتے ہوئے مارا جائے وہ شہید ہے۔

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ عِرْضِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ(10)

جو اپنی ناموس کے دفع میں مارا جائے وہ شہید ہے

مَنْ قُتِلَ دُوْنَ مَظْلِمَتِهِ فَهُوَ شَهِيْدٌ(11)

جو اپنے ساتھ کی گئی بے انصافی کی خاطر مارا جائے وہ شہید ہے۔

یہ سب دین کے فرامین ہیں۔ دین کہہ رہا ہے کہ اگر آب و خاک کا دفاع کرتے ہوئے مارے گئے تو شہید ہو۔ اگر ناموس کے دفاع میں مارے گئے تو شہید ہو۔ حتیٰ کہ اگر اپنے مال کی خاطر مارے گئے تو بھی شہید ہو۔ چونکہ یہ سب کچھ دین کی وجہ سے ہے لہذا اگر دین ہی نہ ہوا تو یہ ساری باتیں ختم ہو جائیں گی اسی وجہ سے عارف اپنے حماسہ و شجاعت کے ذریعے کوشش کرتا ہے تاکہ دین بچ جائے اور دین زندہ ہو جائے۔

خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید میں دفاع و جہاد کا جو مقصد بیان فرمایا ہے اس کی طرف علی علیہ السلام نے نہج البلاغہ میں بھی اشارہ کیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللهِ هِيَ الْعُلْيَا وَ كَلِمَةُ الَّذِيْنَ كَفَرُوا السّفلىٰ

تاکہ کلمۂ خدا کا بول بالا اور کلمۂ کفار کا سر نیچا ہو جائے۔

امیر المومنین علیہ السلام نہج البلاغہ میں جنگ کے دوران ایک جنگجو کا مقصد و ہدف ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا وَ كَلِمَةُ الظَّالِمِيْنَ هِيَ السُّفْلٰى

کلمتہ خدا کا بول بالا اور کلمہ ظالمین کا سر نیچا ہو جائے۔

قرآن مجید میں کفار اور نہج البلاغہ میں ظالمین کا لفظ آیا ہے جو کفار سے ذرا عام ہے البتہ یہ قرآن ہی کی تفسیر اور تشریح ہے۔

لہذا عارف کہتا ہے خداوندا میں فقط تیرے نام اور تیری یاد کے لئے لڑرہا ہوں اور اس میں کسی اور کو شریک کرنا نہیں چاہتا۔ میں مقصد و ہدف میں موحد رہنا چاہتا ہوں۔ میں قرآن اور تیل کے لئے نہیں، قرآن اور ایران کے لئے بھی نہیں بلکہ فقط تیرے لئے لڑتا ہوں۔ بلا شبہ قرآن کے سائے میں مال ، ناموس ، وطن ، سرزمین ، آب و خاک اور تیل وغیرہ جیسے ذخائر کا دفاع بھی ہے۔

امام سجاد علیہ السلام نے جنگ کو عرفانی رنگ دینے کے لئے مجاہدین کے لئے دعا کی اور فرمایا خداوندا ان مجاہدین کو جنگ میں اہل توحید بنادے تاکہ فقط تیرے نام کی تکبیر کہیں اور تیرے علاوہ کسی کی فکر میں نہ ہوں۔

چونکہ اہل و عیال ، ماں باپ ، بہن بھائی اور آب و خاک کی یاد اگر دل میں ہو تو اس کے کئی نقصانات ہیں۔ ایک تو جنگجو کے ہاتھوں میں سستی آجاتی ہے۔ دوسرے اس کے عزم و ارادے میں کمزوری آجاتی ہے۔ چونکہ پہلے فقط خدا کے لئے گھر سے نکلا تھا اب خدا اور اولاد دونوں کے لئے لڑتا ہے تو اس فکر میں ہوتا ہے کہ اہل و عیال میں زندہ واپس لوٹ جائے۔ اس کے دل میں بچے کو آغوش میں لینے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ لیکن جب اہل و عیال اور اولاد کی فکر میں نہیں ہوتا تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ آگے ہی بڑھتا جائے اور واپس پلٹ کر ہرگز نہ دیکھے۔

خلاصہ یہ کہ جنگ عرفاء بھی لڑتے ہیں اور دوسرے بھی لیکن دونوں کے جنگ کرنے میں فرق ہے عارف جنگ لڑے یا جنگجو کے لئے دعا کرے ہر صورت میں اس کے

سارے عمل پر رحمت و معرفت کا رنگ غالب ہوتا ہے وہ اس رحمت کو اکثر مواقع پر کمال الانقطاع کے نام سے یاد کرتا ہے۔

چنانچہ مناجات شعبانیہ میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

امام خمینی نے اپنے وصیت نامے میں مناجات شعبانیہ کو صحیفہ سجادیہ کے ساتھ ملا کر ذکر کیا ہے اس کے وجہ یہ ہے کہ مناجات مذکورہ میں توحید کی روح سمائی ہوئی ہے۔ اسی دعا میں اللہ تعالی سے یوں طلب کیا گیا ہے:

اِلٰهِیْ هَبْ لِیْ کَمَالَ الْاِنْقِطَاعِ اِلَیْكَ

الہی مجھے ہر چیز سے منقطع کر کے اپنی ذات کی طرف متوجہ فرما۔

کمال انقطاع اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان ہر چیز کو فراموش کردے البتہ یہ ایک مقدس نسیان ہے۔ انسان ہر چیز کو بھول کر اللہ کی طرف توجہ کرلے تو ہر چیز کی جانب توجہ رہتی ہے چونکہ ہر شئے میں خدا ہے

هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ

وہی اول ہے وہی آخر وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے۔

جو آدمی جمال حق کا مزہ چکھ لے وہ امام سجاد علیہ السلام کی طرح کہہ اٹھتا ہے:

یَا نَعِیْمِیْ وَ جَنَّتِیْ وَ یَا دُنْیَایَ وَ آخِرَتِیْ وَ یَا اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ(12)

اے میری بہشت، اے میری جنت، اے میری دنیا، اے میری آخرت اور اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے۔

دوسروں نے اگر کوئی حماسہ بیان بھی کیا ہے تو سلاطین کی مدح و ثناء میں مثلاً" یہ کہ۔

اگر من از روزگار بهره ای ندارم زمین و اراضی ندارم

بس است قهر و مهر او ضیاء من عقار من

یعنی اگر میرے پاس زمانے کا دیا ہوا کچھ نہیں ہے زمین و جائیداد و املاک نہیں ہیں تو

مجھے اس کا قہر و محبت و مہر مال و جائیداد کے طور پر کافی ہے۔

لیکن امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں "میری دنیا بھی خدا ہے، میری آخرت بھی خدا ہے، میری بہشت بھی خدا ہے اور میری نعمت بھی خدا ہے۔ اول رحمت بھی وہی ہے اور آخر رحمت بھی وہی ہے۔"

آپؑ جو کچھ اپنے لئے طلب کرتے ہیں وہی میدان جنگ میں مشغول نبرد آزما جنگجو کے لئے بھی مانگتے ہیں۔ چونکہ امام علیہ السلام نے ہر چیز کو پالیا ہے اور یہ بھی جانتے ہیں ہر چیز کو پالینا ہر شئے سے آزادی کا رہین منت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم جب تک ہر چیز کی قید و بند سے آزاد نہیں ہوں گے کسی کو پا نہیں سکیں گے۔ پس اہل و عیال، ماں باپ، خاک و آب سے بلند ہو کر اس خدا تک پہنچیں جو ہر چیز ہے۔ امام علیہ السلام مجاہد کے لئے یہی دعا کرتے ہیں کہ خدایا تو ان کے دلوں میں تاثیر ڈال دے چونکہ بھول اور فراموشی کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ کوئی بھی اپنے دل کو کنٹرول نہیں کر سکتا اور دل کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکتا کہ فلاں تصور دل سے نکل جائے اور فلاں فکر ذہن میں سرایت نہ کر جائے، ممکن ہے سائنس اتنی ترقی کر جائے کہ کسی سیارے کے اردگرد حصار قائم کر دے۔ نہ کسی کو وہاں آنے دے اور نہ کسی کو وہاں سے جانے دے۔ بعید نہیں ہے کہ سائنسی ترقی سے منظومہ شمسی کے اردگرد انسان اس قسم کی دیوار کھڑی کر دے جس کی وجہ سے نہ یہاں سے کوئی چیز باہر جا سکے اور نہ ہی باہر کی کوئی چیز اندر آ سکے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ دل و ذہن کے اردگرد اس طرح کا حصار بنایا جا سکے اس لئے کہ قلب سات آسمانوں اور سات زمینوں سے زیادہ وسیع ہے نماز کے دوران قنوت میں پڑھا جاتا ہے کہ خدا سات آسمانوں اور سات زمینوں کا پروردگار ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سات آسمانوں یا نظام کائنات کو دیدہ عقل سے دیکھا ہے کہ یہ سب حق تعالیٰ کی ربوبیت میں ہیں انسان اگر آسمان شناس نہ ہو اور اسے سات آسمانوں کی کوئی خبر نہ ہو تو کیسے کہہ سکتا ہے کہ خداوند تعالیٰ سات آسمانوں سات زمینوں اور جو کچھ ان کے اندر ہے اس کا پروردگار ہے ہماری روح میں اتنی طاقت ہے کہ

پوری کائنات کو اس کے اندر سما سکتی ہے روح اتنی قوی اور دل اتنا وسیع ہے۔

حدیث قدسی میں نقل ہوا ہے کہ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے۔

میں زمین و آسمان میں نہیں سما سکتا لیکن عرفاء کے ٹوٹے ہوئے دلوں میں سما جاتا ہوں۔

(13) اس کا راز بھی یہی ہے کہ قلب عظیم وسعت کا حامل ہے۔ پس کائنات کے مدار کو بند کیا جا سکتا ہے۔ لیکن دل کی قلمرو کے گرد حصار کھینچنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ لہذا ہم اپنے تصورات روک نہیں سکتے نہ کسی چیز کی فراموشی پر قادر ہیں نہ یاددہانی پر۔ کبھی تو ایسے ہوتا ہے بیٹھے بیٹھے ناگہاں دس سال پہلے کے خیالات ذہن میں آجاتے ہیں اور کبھی ہمارے پسندیدہ افکار ذہن سے غائب ہو جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ سہو و نسیان رام نہیں ہو سکتے جیسا کہ یاداشت زیر دام نہیں آسکتی البتہ کمی یا زیادتی کی جا سکتی ہے لیکن مکمل طور پر کنٹرول ممکن نہیں ہے۔

چونکہ دل فقط دل آفرین کے اختیار میں ہے اور بس۔ لہذا اگر کوئی شخص کسی چیز کی محبت دل سے نکالنا چاہے ، اولاد اور بہن بھائیوں سے توجہ ہٹانا چاہے تو اس کے لئے ہرگز مقدور نہیں ہے مگر یہ کہ اپنا دل مقلب القلوب کے حوالے کر دے وہ تنہا ایسی ذات ہے جس کے اختیار میں مومن کا دل ہے۔

قَلْبُ الْمُوْمِنِ بَیْنَ اِصْبَعَیْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (14)

مومن کا دل رحمان کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

یُقَلِّبُ کَیْفَ یَشَاءُ وَ یَفْعَلُ مَایَشَاءُ

وہ جس طرح چاہے دل مومن کو تبدیل کر سکتا ہے۔

وہ جس طرح چاہے موڑ سکتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے۔

وہ جو پسند کرے دل میں ڈال دیتا ہے اور جو چاہے دل سے نکال دیتا ہے

کبھی کبھار ایسے بھی اتفاق ہوتا ہے کہ گناہگار انسان کو کسی محفل میں بیٹھے بیٹھے ناگہاں اپنے

بیس برس پہلے کے گناہ یاد آجاتے ہیں ایسے شخص کو حق شناس ہونا چاہیئے اور فورا" سجدہ شکر بجالانا چاہیے یہ گناہ خداوند تعالی نے اس لئے یاد دلایا ہے تاکہ توبہ کر سکے اور کہے:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اسْتِغْفَارَ تَذَلُّلٍ وَ اِنَابَۃٍ

میں ذلت و پشیمانی کے ساتھ خدا سے مغفرت طلب کرتا ہوں۔ وہ بہت ہی برا انسان ہے جسے گناہ یاد آئے لیکن وہ توبہ نہ کرے چونکہ خدا نے اسے ایک نعمت عطا کی لیکن اس نے توجہ نہیں کی۔

ممکن ہے کئی برس پہلے ایک غیبی احسان انسان کو نصیب ہوا ہو اور آج اسے یاد آرہا ہے تو فوراً خدا کا شکر بجالائے اور کہے۔

اَللّٰھُمَّ کَمْ مِنْ قَبِیْحٍ سَتَرْتَهُ وَ کَمْ مِنْ فَادِحٍ مِنَ الْبَلَاءِ اَقَلْتَهُ وَ کَمْ مِنْ عِثَارٍ وَقَیْتَهُ وَ کَمْ مِنْ مَکْرُوْہٍ دَفَعْتَهُ وَ کَمْ مِنْ ثَنَاءٍ جَمِیْلٍ لَسْتُ اَھْلاً لَهُ نَشَرْتَهُ(15)

خدایا تو نے میری کتنی برائیوں کو چھپا رکھا ہے اور کتنی بلاؤں کو تو نے مجھ سے ٹال دیا ہے۔ کتنی لغزشوں سے تو نے مجھے بچالیا اور کتنی اذیتوں کو تو نے دور کیا اور میری کتنی خوبیاں اور تعریفیں جن کا میں اہل نہیں لوگوں میں پھیلادی ہیں۔

اگر کوئی چیز یا دفع شر انسان کو یاد آجائے اور شکر نہ کرے تو بہت ہی برا انسان ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص ملت میں مقبولیت پیدا کرلے اجتماعی محبوبیت حاصل کرلے۔ کئی سال گزر جائیں اور وہ غافل رہے اور پھر ناگہاں اس نعمت کی طرف متوجہ ہو جائے تو اسے فورا "شکر بجالانا چاہیئے اور یوں کہنا چاہیئے:

وَکَمْ مِنْ ثَنَاءٍ جَمِیْلٍ لَسْتُ اَھْلاً لَهُ نَشَرْتَهُ

خدایا میری کتنی ایسی تعریفیں جن کا میں مستحق نہیں تھا تو نے لوگوں میں پھیلادی ہیں۔

جو خیال بھی ہمارے ذہن و دل میں پیدا ہوتا ہے وہ ہمیں بیدار کرنے کے لئے ہے۔

ایسے خیالات اگر دل میں پیدا ہوئے اور خدانخواستہ ہم نے ان سے کوئی اثر نہ لیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ یہ گناہ ہم بھول جائیں گے۔ جب گناہ فراموش ہوجائے تو اس کی تلافی اور توبہ کی پرواہ بھی نہیں ہوتی۔ افسوس ایسی حالت میں انسان سیاہ روی کے ساتھ اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

پس جو کچھ بھی انسان کے دل میں آتا ہے وہ پروردگار کی عنایت کے نتیجے میں ہوتا ہے جو مجاہد ایک فاتح کی حیثیت سے پلٹنا چاہتا ہے اس فتح سے اس کا مقصد فقط اعلاء کلمتہ اللہ ہو یا پھر جام شہادت نوش کر کے۔(16)

فُزتُ وَ رَبّ الکَعبَۃِ (17)

کی منزل پر فائز ہونا چاہتا ہے اسے چاہئے کہ امام سجاد علیہ السلام کے فرامین پر عمل کرے۔ چونکہ آپؑ نے خود بھی دعا مانگی ہے اور دیگر مجاہدین کو بھی دعا مانگنے کے آداب سکھائے ہیں۔ وہ یہ کہ خدایا ان مجاہدین کے دلوں کو اپنی رحمت و قہر اور اپنی یاد کی تجلی گاہ قرار دے۔ اہل و عیال کی فکر ان کے دلوں سے نکال دے تاکہ فقط تیری یاد میں جنگ لڑیں۔ یہ نہ کہیں کہ خدا اور اولاد دونوں کے لئے لڑ رہے ہیں بلکہ ان کی زبان پر اور دل میں فقط خدا ہو ۔البتہ رحمت خدا کے سائے میں خاندان خود ہی محفوظ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں یہ حماسہ عارفانہ یا عرفان حماسی ہو جائے گا۔ جو اس طرح سے مناجات نہ کرے وہ اپنے دل کو محض خدا کے اختیار میں قرار نہیں دے سکتا چونکہ انسان کے دو دل نہیں ہیں۔

مَا جَعَلَ اللّٰہُ لِرَجُلٍ مِن قَلْبَیْنِ فِی جَوْفِہِ (18)

اللہ نے کسی انسان کے وجود میں دو دل قرار نہیں دیئے۔

ایک ہی دل میں خدا اور غیر خدا دونوں کی یاد اور محبت کی گنجائش نہیں ہے۔ مہر خدا اتنا لطیف ہے کہ معمولی سا غبار بھی اس کو سیاہ و تاریک کر دیتا ہے مثلاً اگر کسی کے دل میں ننانوے فیصد محبت خدا اور ایک فیصد غیر خدا کی محبت ہو تو یہ ایک فیصد اس ننانوے فیصد کو بھی غبار آلود کر دیتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ محبت حق کا آئینہ بہت ہی لطیف ' نازک اور

شفاف ہے۔ پس غیر خدا کی محبت بطور کلی دل سے نکال دینی چاہیئے۔ اس صورت میں انسان کا دل فقط خدا کے لئے ہوتا ہے نہ کہ کسی اور اس شے کے لئے۔ بلکہ غیر خدا وسیلہ قرار پاتا ہے نہ کہ مقصد۔ غیر خدا کی محبت دل کی قلمرو سے تو ہو سکتی ہے لیکن دل کے اندر نہیں ورنہ دل کے اندر خدا کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ خداوند تعالیٰ شریک قبول نہیں کرتا وہ اپنے علاوہ کسی دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا جس طرح اس کی ذات

لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ (19)

ہے اسی طرح اس کی محبت بھی

لَیْسَ کَمِثْلِهِ شَیْءٌ

ہے اسی وجہ سے ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے دلوں کو تیمّم کریں یعنی اپنے دل کو مکمل طور پر خدا کی محبت سے بھر دیں تاکہ حیرت ممدوح کا باعث بنے۔ اہل و عیال وغیرہ سے محبت ضرور کریں چونکہ ایک دینوی تعلق ہے تاکہ معاشرے کا نظام چل سکے ورنہ وہ کوئی کمال نہیں ہیں۔ اگر کمال ہوتے تو پھر قیامت کے دن خطرے کے وقت ان سے فرار کیوں کیا جائے گا؟(20)

بلکہ محشر میں تو ممکن ہے سرے سے رشتہ داروں کو انسان دیکھ بھی نہیں سکے۔ ضروری نہیں ہے کہ ایک ہی قبرستان میں ساتھ ساتھ دفن ہونے والے قیامت میں ایک ساتھ اٹھائے جائیں اور وہاں بھی اکٹھے ہی ہوں۔ اس مٹی کو تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں مرتبہ تبدیل ہونا ہے لہذا ممکن ہے دو آدمی ایک دوسرے کے پہلو میں ایک ہی قبرستان میں دفن کئے گئے ہوں لیکن قیامت میں ایک دوسرے کو ہرگز نہ دیکھ سکیں ایک مشرق میں ہوگا تو دوسرا مغرب میں فقط اہل بہشت کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

اَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَ مَا اَلَتْنَاھُمْ مِنْ عَمَلِھِمْ مِنْ شَیْءٍ (21)

ہم نے ان کی ذریت کو ان سے ملا دیا اور ان کے عمل سے کوئی چیز بھی کم نہیں کی۔ انسان

کی اولاد صالحہ کو خدا بہشت میں ان کے قریب کر دے گا تا کہ وہاں بھی اکٹھے رہیں۔ اگر فرزند غیر صالح ہو تو ایک پارسا انسان کو جنت میں یاد بھی نہیں ہو گا کہ اس کا غیر صالح فرزند بھی ہے۔ امام معصوم علیہ السلام سے کسی نے سوال کیا کہ جنت میں تو نہ غم ہے نہ اندوہ

لَا لَغْوٌ فِيهَا وَ لَا تَاثِيمٌ (22)

اور

لَا يَمَسُّنَا فِيهَا نَصَبٌ وَ لَا يَمَسُّنَا فِيهَا لُغُوبٌ (23)

اس میں نہ ہمیں کوئی تھکن ہو گی اور نہ ہی افسردگی و غم۔

امامؑ نے جواب میں فرمایا "ایسے ہی ہے۔" اس پر پوچھا گیا کہ اگر تمام اہل بہشت ایسے ہیں کہ انہیں کوئی غم و حزن نہیں ہو گا چنانچہ وہ خود بھی کہیں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ (24)

حمد ہے اس خدا کی جس نے ہم سے غم و حزن کو دور کیا ہے

تو پھر حضرت نوحؑ بہشت میں ہوں گے جب کہ ان کا فرزند غیر صالح جہنم میں تو کیا وہ اپنے بیٹے کے لئے غمگین نہ ہوں گے یا بطور کلی وہ والدین جو بہشت میں ہوں اور ان کی اولاد جہنم میں آیا وہ غم و اندوہ میں نہیں ہوں گے؟

امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ بہشت میں کسی کو یہ یاد ہی نہیں ہو گا کہ ہماری ناصالح اولاد بھی تھی چونکہ خداوند تعالیٰ جنت میں ان کے دلوں سے غیر صالح اعزاء کی یاد ہی نکال دے گا۔ پس حضرت نوحؑ کو بھی یاد نہیں ہو گا کہ ایسا ناخلف بیٹا تھا لہذا غمگین بھی نہیں ہوں گے۔

ایک اور نمونہ یہ ہے کہ جب ہمارے ساتھ کوئی جفا کرے اور ہم جواب میں اس کے ساتھ وفا کریں تو جب بھی اسے اپنی جفا اور ہماری وفا یاد آئے گی شرمندہ ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ احسان اس پر یہ کر سکتے ہیں کہ اسے معاف کر دیں بلکہ اس کے ساتھ مہربانی سے پیش آئیں، کبھی بھی اسے یاد نہ دلائیں اور اس کی پیٹھ پیچھے بھی ذکر نہ کریں۔ ہم جتنا بھی اس کے

ساتھ اچھابرتاؤ کریں گے وہ اور زیادہ شرمندہ ہوگا ہم اس کی یہ اندرونی شرمساری ختم نہیں کرسکتے نہ صرف ہم بلکہ وہ خود بھی اس پر قادر نہیں ہے۔ لیکن خداوند تعالی میں یہ قدرت ہے کہ اس طرح سے کسی بندے کو بخش دے کہ وہ شرمسار نہ ہو یعنی جو شخص خدا کی بارگاہ میں معصیت کامرتکب ہو۔ مثلاًماہ مبارک رمضان میں عمداً روزہ چھوڑ دے اور بعد میں توبہ کرلے تو خداوند تعالی اس کی توبہ کو قبول کرلیتا ہے اور جب اسے جنت میں لے جائے گا تو اس طرح اس کا دل صاف ہوگا کہ اسے یاد ہی نہیں رہے گا کہ دنیا میں اس نے معصیت کی تھی اور اس کے بعد توبہ کی تھی تاکہ بہشت میں شرمندہ نہ ہو۔ توبہ کرنے والوں کے لئے بہشت میں ایک مخصوص دروازہ ہوگا

اَنۡتَ الّذِیۡ فَتَحۡتَ لِعِبَادِکَ بَاباً اِلیٰ عَفۡوِکَ وَ سَمّیۡتَهُ التّوۡبَة(25)

تو وہ ذات ہے جس نے اپنے بندوں کیلئے عفوو بخشش کا دروازہ کھولا ہے جسے توبہ کہا ہے۔

فَقُلۡتَ تُوۡبُوۡا اِلَی اللهِ تَوۡبَةً نَصُوۡحاً(26)

اور تو نے یہ فرمایا کہ (اللہ کی بارگاہ میں) توبہ کرو خالص توبہ۔

یعنی اللہ نے توبہ کو اپنے بندوں کے لئے دروازہ قرار دیا ہے۔ توبہ جنت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے توابین اسی در سے داخل ہوں گے لیکن دوسرے عام لوگوں کی طرح ہی ہوں گے اور انہیں یاد تک نہ ہوگا کہ انہوں نے کوئی گناہ کیا تھا تاکہ شرمندہ ہوں۔

اگرچہ دو مومن ایک دوسرے کی نسبت کینہ وعداوت رکھتے ہوں مومن ہونے کی وجہ سے دونوں بہشت میں جائیں گے اور جنت میں ہر ایک کا باطن دوسرے کے لئے نمایاں اور ظاہر ہو جائے گا تو خدا اگر ہمیں اس حالت میں بہشت میں ڈال دے کہ ہمارے دل میں اپنے ہی دوستوں کے بارے میں کینہ وعداوت ہو تو قاعدے کے مطابق جو کچھ ہمارے باطن میں ہے اسے ظاہر ہو جانا چاہئے اور اگر یوں ہو جائے تو دوسرے جان لیں گے کہ ہمارے دل

میں ان کی نسبت کینہ و حسد ہے تو یہ ہمارے لئے رسوائی کا سبب بنے گا۔
لیکن خداوند تعالیٰ بہشت میں لے جانے سے پہلے ہمارے دلوں کی تطہیر فرمائے گا۔

وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِنْ غِلٍّ اِخْوَانًا(27)

اور بھائیوں کے بارے جو کچھ میل ان کے دلوں میں ہوگی ہم اسے نکال دیں گے۔

دلوں سے جب کینہ و عداوت نکال دی جائے گی تو پھر تطہیر شدہ دل کا باطن دوسروں کو دکھایا جائے گا لہٰذا ہم ایک دوسرے کے دلوں کو آئینے کی طرح صاف و شفاف دیکھیں گے۔ خدا مومن کی کسی جگہ بھی آبروریزی ہونے نہیں دیتا چنانچہ اس عارف سے جب پوچھا گیا نجات کا راستہ کونسا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا۔

به پیر میکده گفتم که چیست راه نجات
بخواست جام می و گفت راز پوشیدن(28)

پیر میکدہ سے میں نے پوچھا نجات کا راستہ کیا ہے؟ تو اس نے جام اٹھا کر کہا رازوں پر پردہ ڈالنا۔

لہٰذا جو شخص ستار العیوب ہو دوسرے کے عیوب پر پردہ ڈالے لوگوں کی عزت و آبرو کو محفوظ رکھے تو خداوند تعالیٰ بھی قیامت کے دن اسکی آبرو بچالے گا۔

پس عارف اسی وجہ سے دعا مانگتا ہے کہ بارالٰہا مجاہدین کے دلوں کو صاف کر کے اپنی محبت اور یاد سے پر کردے چنانچہ حضرت علی اکبر علیہ السلام یاد خدا سے بھرے ہوئے دل کے ساتھ میدان میں گئے حضرت امام حسینؑ نے بھی قلب قیمّ کے ساتھ انہیں روانہ کیا چونکہ امام علیہ السلام کا دل محبت خدا سے پر تھا لہٰذا فرزند کی محبت اسے میدان میں بھیجنے کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنی۔ حسینؑ کا دل سراپا شبستان حب خدا ہے اور علی اکبر کا دل بھی بوستان یاد خدا ہے۔

اولیاء الٰہی چونکہ صبغہ اور رنگ الٰہی رکھتے ہیں لہٰذا محمود بھی ہیں اور ممدوح بھی ہیں۔ نہ باپ کو بیٹا چاہئے اور نہ بیٹے کو باپ۔ بلکہ ہر دو طالب رضا خدا ہیں۔ بیٹا برضا و رغبت اجازت

مانگتا ہے۔باپ خوشی خوشی اجازت دے دیتا ہے۔چونکہ دونوں کے دل یادِ حق سے پُر ہیں۔
امام سجاد علیہ السلام نے یہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور پھر مجاہدین کے لئے بھی یہی دعا مانگی پس جنگجو پہلے اپنے باپ یا بیٹے کو فراموش کردے تاکہ ایک حقیقی مجاہد بن سکے امام علیہ السلام نے جنگجوؤں کے لئے یہ دعا مانگی کہ خدایا ان کے دلوں کو اپنی محبت سے لبریز کردے۔امام حسین علیہ السلام نے جناب علی اکبرؑ سے فرمایا بیٹے جاؤ اپنے جد رسولؐ اللہ کے ہاتھوں سے سیراب ہو جاؤ۔جب حضرت علی اکبرؑ جنگ کے دوران واپس پلٹے اور عرض کی۔

يَاَابَتِ الْعَطَشُ قَدُ قَتَلَنِیُ وَثِقُلُ الْحَدِيُدِ اَجُهَدَ نِیُ فَهَلُ اِلٰی شِرُبَةِ مِنُ الْمَاءَ سَبِيُلُ' اَتَقَوّیَ بِهَا عَلیٰ الْاَعْدَاءَ(29)

باباجان پیاس مجھے ہلاک کررہی ہے لوہے اور اسلحہ کے بوجھ نے مجھے تھکا دیا ہے آیا ایک گھونٹ پانی مل سکتا ہے تاکہ پی کر میں دشمنوں پر قوت اور طاقت سے حملہ کروں ؟
فرماتے ہیں میں سیراب ہونے کے لئے نہیں بلکہ قوت و قدرت کے ساتھ لڑنے کے لئے پانی مانگ رہا ہوں۔امام حسین علیہ السلام نے فرمایا بیٹے اپنی زبان باہر نکالو اور میرے منہ میں ڈالو۔ حضرت علی اکبر نے اپنی زبان بابا کے خشک منہ میں ڈالی تو بہت زیادہ مضطرب ہو گئے شاید اپنے دل میں کہہ رہے ہوں گے آج تک اپنے بابا کا دل نہیں دکھایا اے کاش آج بھی پانی نہ مانگتا میرے بابا کا منہ تو مجھ سے بھی زیادہ خشک ہے۔
علی اکبر دوبارہ میدان جنگ میں پلٹے' سر مقدس پر ایک ضرب کھائی جس سے گھوڑے کی گردن کی طرف جھک گئے اور زمام انکے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ گھوڑا دشمنوں کے نرغے میں جا پہنچا۔ کئی زخم کھائے اور حالت احتضار میں اہل بیت سے وداع کیا اور فرمایا علیکم منی السلام آپ پر میرا سلام ہو۔
چونکہ مومن احتضار کے وقت اہل بیت کی زیارت کرتا ہے۔
اس کے بعد ایک جملہ ادا فرمایا۔

اَبَتَاهُ عَلَيْكَ السَّلاَمِ هٰذَا جَدِّیُ رَسُوْلُ اللهِ يَقْرِئكَ السَّلاَمَ وَيَقُوْلُ عَجِلّ الْقَدُوَمَ اِلَيْنَا (30)

اے بابا جان آپ پر سلام ہو یہ میرے جد رسولؐ اللہ ہیں آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں جلدی ہمارے پاس آجاؤ۔

اے بابا جان میں نے آپ سے ایک گھونٹ پانی مانگا۔ آپ کے پاس نہیں تھا میں نے آپ کے منہ میں اپنی زبان ڈالی اسے اپنے سے بھی زیادہ خشک تڑپایا لیکن ابھی رسولؐ اللہ تشریف رکھتے ہیں ان کے ہاتھ میں پانی کا پیالہ ہے مجھے سیراب کرنا چاہتے ہیں اور فرمارہے ہیں میرے بیٹے حسینؑ سے کہو جلدی آجاؤ جلدی آجاؤ۔ اے حسینؑ جلدی آؤ اور اپنے جد کے ہاتھوں سیراب ہو جاؤ۔

نویں فصل

علیؑ کا پیرو یا سعید ہے یا شہید ہے

حقیقی عارف لازماً شجاع ہوتا ہے جب کہ ایک الٰہی مدافع اور جنگجو یقیناً عارف ہوتا ہے۔ چونکہ دین کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنا معرفت کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ ذات خداوندی اور اسمائے حسنٰی کی معرفت جاذبہ ودافعہ یا تولیٰ و تبریٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اس ہم آہنگی کا سب سے بہترین نمونہ عظیم اسلامی عرفاء کا کلام ہے۔ ان کی دعا و مناجات جنگ میں شرکت اور شہادت کی تمنا کی صورت میں جلوہ گر ہے لہٰذا حضرت امیر المومنین علیہ السلام، حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت امام سجاد علیہ السلام کی اکثر دعائیں اسی طرح کی ہیں۔ عموماً لوگ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ صحیح و سالم رہیں تاکہ سلامتی کی زندگی بسر کر سکیں جب کہ علی علیہ السلام کی دعا یہ ہے کہ ''خدایا مجھے شہادت عطا فرما۔''

یہاں عرفان حماسہ و شجاعت کے ساتھ ھم آھنگ ہے۔ خدا سے مانگنا دین کے دفاع کی صورت میں جلوہ گر ہے۔

جناب مالک اشتر کے نام امیر المومنین علیہ السلام کے عہد نامہ کے اواخر میں حضرتؑ فرماتے ہیں:

اَنْ یَخْتِمَ لِی وَ لَكَ بِالسَّعَادَةِ وَالشَّهَادَةِ اِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُونَ(1)

میں خدا سے التجا کرتا ہوں کہ میرا اور تمہارا اختتام سعادت و شہادت پر ہو یقیناً ہم اسی کی

طرف جانے والے ہیں۔

حضرت امیر المومنینؑ نے خود سپہ سالار اعلیٰ ہوتے ہوئے مالک اشتر کو لشکر مصر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، انہیں مصر پر حکومت کا دستور العمل لکھ کر دیا اور آخر میں اپنے اور مالک کے لئے شہادت اور سعادت کی تمنا کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نظام علوی کا عہدہ دار سعید اور شہید ہوتا ہے۔ جو فرد اپنی سعادت دنیوی سلامتی میں دیکھتا ہے وہ لامحالہ مالک اشتر کے نقش قدم پر نہیں چل رہا اور وہ علوی صفت بھی نہیں ہے ہاں جو شہادت کو سعادت سمجھتا ہے وہ مالک اشتر کا ہم فکر اور تفکر علیؑ کا پیرو ہو سکتا ہے کیونکہ ممکن ہے کبھی کسی کے لب پر علیؑ کا نام ہو لیکن دل میں کوئی اور فکر ہو۔ علیؑ کا نام زبان کے ساتھ ساتھ دل میں بھی ہونا چاہئے اور دل میں علیؑ کا نام اس وقت آتا ہے جب انسان شہادت کی آرزو کرنے لگے اور بارگاہ خدا میں عرض کرے کہ پروردگار جب اسلام کو کوئی خطرہ درپیش ہو اور دین کو حفاظت کی ضرورت ہو تو مجھے شرف شہادت نصیب فرما۔ چونکہ بیماری کے ذریعے بستر پر مرنا ننگ ہے اور مردار ہونا ہے۔ اگر تیری مصلحت ہے تو مجھے شہادت عطا فرما اگر نہیں ہے تو بھی میں آمادہ شہادت ہوں۔

عہدنامہ مالک اشتر میں حضرت علی علیہ السلام کی یہی دعا ہے۔ گویا حضرت مالک اشتر سے فرما رہے ہیں کہ تم جو مصر جا رہے ہو اگر یہ گمان کرو کہ کوئی منصب و مقام لینے جا رہے ہو تو افسوس ہے تمہارے حال پر لیکن اگر مقام و منصب تمہارے سامنے آکھڑا ہوا ہے اور تم اس ذریعے کے اپنے فریضے پر عمل کرو تو لائق تحسین ہو۔

ہم کبھی جان بوجھ کر سمجھنا نہیں چاہتے اور اپنے لئے کام کو مشکوک بنا لیتے ہیں ممکن ہے دین کے استثنائی احکام کو اپنے گناہوں کی توجیہ کے طور پر یاد کر لیں چونکہ اکثر حرام امور میں استثنائی صورتیں بھی موجود ہیں لیکن چشم پوشی اور جان بوجھ کر امور کو مشتبہ بنانے کی بھی ایک حد ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص لمبے عرصے تک بعض مسائل کو مشکوک بنائے رکھے آخرکار اگر خود بیدار نہ ہوا تو اسے بیدار کر دیا جائے گا اگر اپنے قدموں سے چل

کر ہوشیاری کا رستہ طے نہ کرے تو اسے لے جایا جائے گا کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ اگر کوئی اپنے اختیار سے راہ خدا طے نہ کرنا چاہے تو اسے زبردستی بھی نہیں لے جایا جائے گا۔ لہٰذا اگر یہ راستہ ہم خود طے کر جائیں تو سب سے بہتر ہے ورنہ اس خطاب کے ساتھ لے جائے جائیں گے:

خُذُوهُ فَغُلّوهُ ثُمّ الْجَحِيمَ صَلّوهُ (2)

اسے پکڑ کر باندھ دو اور جہنم میں ڈال دو۔

کوئی شے بھی اس راستے میں ساکن اور ٹھہری ہوئی نہیں ہے۔ قافلہ انسانیت اپنے رب کی طرف جا رہا ہے سو اس سے ملاقات کرے گا۔

پس یہ ایک قانون کلی ہے کہ اگر ہم خود نہ گئے تو مندرجہ بالا خطاب آئے گا۔

لیکن اگر اپنی خوشی سے جائیں تو ہمیں کہا جائے گا:

سَلَامٌ عَلَيكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِيْنَ (3)

سلام ہو تم پاکیزہ لوگوں پر۔ آؤ بہشت میں ہمیشہ کے لئے داخل ہو جاؤ۔

جو شخص تنگ نظری کی محدودیت میں زندگی گزار رہا ہے اور ہمیشہ اپنی لالچ و حرص میں اضافہ کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے وہ اپنے مال و ثروت کے اعداد و ارقام کو بڑھانے کی فکر میں رہتا ہے۔ ایسا انسان ہر تین عوالم میں سختی میں رہتا ہے۔ دنیا میں ہرگز آزادی و آسائش کا مزہ نہیں چکھ سکتا۔ پس ہمیں خدا کا شکر بجالانا چاہئے کہ اس نے ہوس کا تلخ مزہ ہمیں نہیں چکھایا۔ بعض سرمایہ داروں کی مانند ہمیں بدبخت نہیں بنایا ورنہ معلوم ہو جاتا کہ کس عذاب میں جل رہے ہیں یہ بدبخت لوگ جب تک زندہ ہیں دو طرح کی سختیوں میں گھرے ہوئے ہیں:

ایک غیر حاضر چیزوں کی طلب کی سختی اور دوم حاضر اشیاء کی حفاظت کی سختی۔

لالچی انسان کبھی بھی سیر نہیں ہوتا اس کی ساری کوشش انہی دو کاموں میں صرف ہو جاتی ہے یعنی جو کچھ اس کے پاس نہیں ہے اسے حاصل کرنے کے لئے اور جو کچھ موجود

ہے اس کی حفاظت کرنے کے لئے۔ زندگی بھر ان دو تیز دھاروں کے نیچے سختی کی حالت میں رہتا ہے جب اس دنیا سے اٹھ جاتا ہے تو اس وقت بھی عذاب قبر کی سختی میں گرفتار ہو جاتا ہے اور جہنم میں جاتا ہے تو وہاں پر اسے کوئی کھلی جگہ میسر نہیں آتی چونکہ اہل جہنم کی جگہ بہت ہی تنگ ہے قران کریم نے ان تینوں عوالم کا حال بیان فرمایا ہے:

مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَاِنَّ لَهُ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (4)

جو ہماری یاد سے روگردانی کرے گا وہ زندگی کی سختی میں مبتلا ہو جائے گا۔

یعنی ایک تنگ معیشت میں گرفتار ہو گا زندگی میں ہرگز آسائش کا احساس نہیں کرے گا جب مرے گا تو فرشتے اس کے چہرے اور پشت پر ماریں گے۔ قرآن میں کئی مواقع پر یہ جملہ آیا ہے:

يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ (5)

ان کے چہرے اور پشت پر ضرب لگائیں گے۔

حالت احتضار میں بھی اپنے چہرے اور پشت پر لاتوں مکوں کو محسوس کرے گا اور یہی قبر کا عذاب ہے اور جب اسے جہنم میں ڈالا جائے تو وہاں بھی اس کی جگہ تنگ ہو گی۔

چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِذَا اُلْقُوا فِيهَا مَكَاناً مُقرنين (6)

جب وہ جکڑے ہوئے ایک تنگ جگہ پر بند کئے جائیں گے۔

تینوں عوالم کی تنگی اور سختیاں تنگ نظری کا نتیجہ ہیں تنگ نظر کا انجام ہمیشہ ایسا ہی ہو گا۔ لیکن اگر انسان شرح صدر رکھتا ہو' اس کی نگاہ اتنی بلند ہو کہ دنیا سے گزر کر اس کے بعد کا عالم بھی دیکھ لے تو ہر تین عوالم میں اس کے لئے وسیع میدان ہو گا۔ قران مجید میں ہر تین کا تذکرہ موجود ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

مَنْ يَتقِ اللّٰهَ يَجعَلْ لَهُ مَخرَجاً وَ يَرزُقْهُ مِنْ حَيثُ لاَيَحْتَسِبُ (7)

جو بھی تقویٰ خدا اختیار کرے خدا اس کے لئے کوئی راستہ بنا دیتا ہے اور اسے ایسے طریقے سے رزق دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔

باتقویٰ انسان ہرگز تنگدستی کی چکی میں نہیں پستا چونکہ تنگدستی تنگ نظر دنیا پرستوں کے لئے ہے جب کہ پرہیزگار اس خطرے سے محفوظ ہیں۔ جب اس دنیا سے رحلت کرتے ہیں تو فرشتے انتہائی ادب واحترام کے ساتھ ان کے استقبال کے لئے آتے ہیں۔

اَلَّذِينَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰئِكَةُ طَيِّبِينَ (8)

فرشتے بہت ہی خوشگوار حالت میں ان کی روح قبض کرتے ہیں۔

اور جب جنت میں جانے کی باری آئی ہے تو ان پر بہشت کے دروازے کھول دیئے جائیں گے اور جنت کا وسیع وعریض میدان انہیں سونپ دیا جائے گا۔

مُفَتَّحَة لَهُمُ الأَبْوَاب (9)

جنت کے دروازے ان کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

بہشتی انسان کے گھر کی وسعت پوری کائنات کے مساوی ہوگی۔ اگر وہ دنیا کے تمام انسانوں کی دعوت کرنا چاہے تو اس میں اتنی گنجائش موجود ہوگی۔ لیکن یہ گھر کہاں ہے اور اس کی یہ وسعت کس قسم کی ہے؟ امیر المومنین علیہ السلام نے بہشت کے دل پذیر مناظر اور اوصاف ذکر کرنے کے بعد اس کا جواب یوں بیان فرمایا:

"اگر تمہیں معلوم ہو جاتا کہ موت کے بعد پرہیزگاروں کے لئے کتنا بافضیلت مقام ہے تو ہرگز میرے ارد گرد جمع نہ ہوتے بلکہ تمہاری کوشش یہ ہوتی کہ جتنا جلدی ہوسکے تمہیں موت آجائے۔" (10)

حاصل کلام یہ کہ اگر انسان صحیح روش کے تحت اس راہ کو طے نہ کرے تو زبردستی لے جایا جائے گا۔ یوں نہیں ہوگا کہ بعض کو وصال خدا نصیب ہو اور کچھ کو نصیب نہ ہو چونکہ قرآن مجید نے تمام انسانوں کے لئے یہ قانون بیان فرمادیا ہے:

يَاأَيُّهَا الإِنْسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدْحاً

فَمُلاقِیهِ (11)

اے انسان تو اپنے پروردگار کی طرف جانے کے لئے کوشاں ہے چنانچہ تو اسے پالے گا اور ملاقات کرے گا۔

قرآن مجید نے اس کے بعد ایک اور قانون کی تشریح فرمائی ہے اور وہ یہ کہ بعض افراد کا نامہ اعمال ان کے دائیں ہاتھ میں ہو گا اور کچھ کا نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ہو گا لیکن دونوں گروہ وصال خدا تک پہنچیں گے البتہ ایک گروہ کو جمال خدا کا وصال نصیب ہو گا جب کہ دوسرے گروہ کو خدا کے جلال و قہر کا وصال نصیب ہو گا۔

اول الذکر گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَجُوهُ' یَومَئِذٍ نَاضِرَةُ' اِلیٰ رَبّهَا نَاظِرَةُ' (12)

بعض چہرے اس دن خوشحال اور ہشاش بشاش اپنے پروردگار کا نظارہ کریں گے۔

جب کہ دوسرے گروہ کے بارے میں فرمایا وہ اندھے ہوں گے اور خداوند تعالیٰ سے یوں عرض کریں گے۔

رَبّنَا اَبصَرنَا وَسَمِعنَا فَارجَعنَا نَعمَلُ صَالحاً اِنّا مُوقِنُونَ (13)

اے ہمارے پروردگار ہم نے اب سب کچھ دیکھ سن لیا ہے اور ہمیں یقین آگیا ہے چنانچہ اب ہمیں واپس پلٹا تا کہ اعمال صالح انجام دے سکیں۔

اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ یہ راہ ہر ایک کو طے کرنا ہے اگر خود نہ گئے تو زبردستی لے جایا جائے گا۔

اگر ہم خود جمال کو نہ دیکھ سکے تو جلال دکھایا جائے گا۔ بس اب جب کہ سب کو جانا ہی ہے تو بہتر ہے کہ خالص دل کے ساتھ یہ راہ طے کریں۔

ابو العرفاء حضرت امیر المومنین علیہ السلام نے دعائے کمیل میں خداوند تعالیٰ کو **غایته آمال العارفین** عرفاء کی آخری آرزو قرار دیا ہے اور آپؑ نے ہمیں خدا تک

پہنچنے کا راستہ اور طریقہ بھی بتایا ہے نیز سعید یا شہید ہونے کا ڈھنگ بھی سکھایا ہے۔ آپؑ نے حماسہ وسیاست کو یکجا کر کے جناب مالک اشتر کو یوں فرمایا:

"نہ میں شہادت سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی تجھے ڈرنا چاہئے۔ جو شہادت سے ڈرتا ہو وہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام چلانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ جو شہادت سے ہراساں ہو وہ سپاہ مصر کی سپہ سالاری کے قابل نہیں ہے۔ میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ تیری عمر کا خاتمہ سعادت پر ہو۔ یہ عہد نامہ علوی کا اختتامیہ ہے۔"

علی علیہ السلام کے فرزند گرامی حضرت امام حسین علیہ السلام نے انہی معارف کو دعائے عرفہ میں بیان فرمایا اور کربلا کے دستور العمل کے طور پر انہیں عملی شکل دی۔ آپؑ نے ایسے افراد کو کربلا کی جانب دعوت دی جو عارفانہ حماسہ اور شجاعانہ عرفان کے علاوہ کسی چیز کی فکر میں نہ ہوں۔ امام حسین علیہ السلام نے محض عابد اور زاہد کو دعوت کربلا نہیں دی۔ آج بھی صورت حال یہی ہے جن لوگوں سے خشک وخالی عبادت وزھد کی بو آتی ہے وہ نہ تو کربلائی ہیں اور نہ ہی انقلابی۔ یہ لوگ امام زمانہؑ سے غائب ہونے کی بناء پر عقیدت رکھتے ہیں لیکن جب حضرت ولی عصر ظہور فرمائیں گے تو سب سے پہلے مذکورہ گروہ ہی آپ کی مخالفت کرے گا۔ جس شخص نے اپنے زہد کو شجاعت کے ساتھ یکجا کر دیا ہو وہ حضرت ولی عصر عجہ کا باوفا ساتھی ہے۔

امام حسین علیہ السلام نے کربلا میں مجاہدین کے لئے کچھ شرائط مقرر کی تھیں۔ پہلے تو آپؑ نے یہ اعلان فرمایا کہ دین خطرے میں ہے اس کے بعد آپ نے دین کی حفاظت کی خاطر شروع ہونے والی اپنی اس تحریک میں شرکت کی شرائط ذکر فرمائیں اور ان کی تشریح فرمائی۔ آپؑ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو بھی مسلمان ہے ہمارے ساتھ آملے یا عابد اور زاہد کو دعوت نہیں دی کہ اتنے مضبوط اموی نظام کی بنیادیں ہلا سکے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعض صحابہ کرام اس وقت زندہ تھے لیکن بہت بوڑھے ہو چکے تھے انہوں نے حضرت امام حسین علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم

اگرچہ کسی کو قتل کرنے پر قادر نہیں ہیں لیکن قتل ہونے کی طاقت رکھتے ہیں۔ واقعہ کربلا نبی اکرمؐ کی رحلت کے پچاس سال بعد وقوع پذیر ہوا ہے لامحالہ آنحضرتؐ کے وہ صحابی جنہوں نے پچاس سال کی عمر میں آپ کو دیکھا اور آپ کا عہد درک کیا تھا اب وہ پچاس سال گزرنے کے بعد سو سال کے عمر کے لگ بھگ ہوں گے۔ لیکن ان حالات میں ایک بوڑھے صحابی کا ہمراہ ہونا بھی غنیمت تھا۔ اس وقت اکثر لوگوں کی زبانوں پر یہ کلمہ ہوتا تھا کہ فلاں علاقے میں نبی اکرمؐ کا ایک بوڑھا صحابی موجود ہے جسے زیارت نبیؐ کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں سے ایک انس الکاہلیؓ ہیں۔ آپ نے کربلا میں امام علیہ السلام سے عرض کیا" مجھے بھی جام شہادت نوش کرنے کی اجازت دی جائے۔" امامؑ کی طرف سے اجازت ملنے پر انہوں نے دو کپڑے منگوائے ایک کے ذریعے اپنی جھکی ہوئی کمر کو باندھا اور دوسرے کپڑے سے آنکھوں کے اوپر پڑے ہوئے ابرو کو پیشانی سے باندھا تاکہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ سکیں۔(14) اس طرح کے لوگ کربلائی بنے ہیں۔ کربلا ایسے جوانمردوں نے برپا کی ہے جنہوں نے چالیس سال تک نماز عشاء کے وضو کے ساتھ ہی نماز صبح بھی ادا کی ہے۔ نماز مغرب پڑھ کر کچھ دیر کے لئے استراحت کرتے تھے۔

كَانُوا قَلِيلاً مِنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (15)

رات کو بہت تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتے تھے۔

اس کے بعد اٹھ کر عشاء پڑھتے، عشاء کے نوافل بجالاتے اور پھر ذکر و دعاء و مناجات میں مشغول ہو جاتے۔ ان کا یہ عمل نماز شب کے فضیلت کے وقت تک جاری رہتا۔ پھر نماز شب اور نماز صبح بجالاتے یہ ان کی چالیس سالہ سیرت تھی۔ کربلا کو اس قسم کے افراد نے بچایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں جو طاقت بھی کربلا کے مقابلے میں آئی ہے وہ نابود ہو گئی ہے۔ کبھی یہ طاقتیں نام حسینؑ سے ٹکرائیں، کبھی آپ کی قبر مبارک سے، کبھی آپ کے نام پر موقوفات سے اور کبھی آپ کے مقصد سے ٹکرائیں لیکن ابھی تک کوئی طاقت سامنے نہیں آئی جو شہدائے کربلا کے سلسلہ جلیلہ کے سامنے ٹھہر سکے۔ اس طرح کسی بھی

طاقت کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی۔

ویسے تو بہت سے افراد نے جنگیں لڑی ہیں، دوسروں کو مارا بھی ہے اور خود بھی قتل ہوئے ہیں لیکن ان کے نام تاریخ کے اندر دفن ہوگئے ہیں۔ آج ایک مورخ تاریخی کتابوں کی ورق گردانی کر کے تاریخی حوادث کی چھان بین کرتا ہے تاکہ ایک تاریخی واقعہ ملاحظہ کر سکے جب کہ حادثہ کربلا ہمیشہ تاریخ میں سر فہرست رہا ہے چونکہ یہ واقعہ معمولی افراد نے انجام نہیں دیا تھا۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کی سیرت سراپا عرفان ہے آپؑ نے دعائے عرفہ میں کربلا کے جنگجوؤں کے اوصاف و شرائط ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

میں عارف ہوں مجھے مدد کی ضرورت ہے لیکن ہر کس و ناکس سے نہیں بلکہ ایک خاص طبقے سے مدد چاہیئے۔

آپؑ نے فرمایا:

وَلْيَرْغَبِ الْمُؤْمِنُ فِي لِقَاءِ اللّٰهِ (16)

مومن کو وصال خدا کا شوق ہونا چاہیئے۔

یعنی جس کے سر میں وصال خدا اور لقاء اللہ کا سودا ہے وہ ہمارے ساتھ آئے۔ جو جہنم کے خوف سے تلوار اٹھاتا ہے ہمیں وہ نہیں چاہیئے چونکہ ممکن ہے جنگ کے لپکتے ہوئے شعلے دیکھ کر اس کے ہاتھ لرز جائیں ایسے ہی جو بہشت کے شوق میں میدان میں آئے ممکن ہے جنگ کے بعد اپنے ورثا کی قید و اسارت کا تصور کر کے اس کے پاؤں میں بھی لغزش آجائے۔ لیکن جو وصال خدا کے شوق میں آئے گا نہ فقط اس کے ہاتھ پاؤں نہیں لرزیں گے بلکہ اس کا دل بھی نہیں لرزے گا اور وہ دوسروں کو بھی استقامت اور ثابت قدمی کی دعوت دے گا۔

امام علیہ السلام نے سرزمین مکہ کے اندر اپنے خروج کے مقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اس وقت حج کا موقع نہیں ہے اگرچہ یہ ایام حج ہیں۔ میں شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجۃ کی آٹھ تاریخ تک یہاں رکا رہا۔ آٹھویں ذی الحجۃ کو حجاج مکہ سے احرام باندھ کر عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں لیکن میں امام ناطق ہوں آپ سے یہی کہہ رہا ہوں کہ اس وقت حج کرنے منٰی اور عرفات جانے کا موقع نہیں ہے اس وقت منٰی جاکر گوسفند یا اونٹ کی قربانی کا وقت نہیں ہے بلکہ اس وقت عراق جاکر اپنا خون بہانے کا وقت ہے۔"

سب کے ذہنوں میں یہ سوال اٹھ رہا تھا کہ آج آٹھ ذی الحجۃ ہے۔ سب احرام باندھ کر عرفات و منٰی کے لئے روانہ ہو رہے ہیں اور آئندہ چند دنوں میں حج کے سارے اعمال تمام ہو جائیں گے، جب کہ فرزند رسولؐ نے حج چھوڑ کر خروج کا ارادہ کر لیا ہے مزید چند دن صبر کیوں نہیں کر لیتے؟ امام علیہ السلام اگر چند دن بعد روانہ ہوتے تو اس سے کیا فرق پڑ جاتا مدینے سے مکہ قافلے کے ساتھ تشریف لائے چند مہینے مکہ میں رکنے کے بعد اب جب کہ حج کا موقع قریب آرہا ہے تو آپؑ حج کئے بغیر جا رہے ہیں؟

امام علیہ السلام اپنے اس عمل سے لوگوں کو یہی بتانا چاہتے تھے کہ پہلے حج کو زندہ اور آزاد کرنے کی ضرورت ہے اس کے بعد لوگوں کو ایک آزاد حج کی دعوت دی جائے جب کہ اس وقت کعبہ اسیر ہے۔ ہمارا فریضہ یہ ہے کہ بیت عتیق میں جاکر نماز ادا کریں بیت عتیق کے گرد طواف کریں چونکہ قرآن مجید کا فرمان بھی یہی ہے۔

وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ (17)

اور انہیں بیت عتیق کا طواف کرنا چاہئے۔

یہ نہیں فرمایا کہ کعبہ کے گرد چکر لگائیں بلکہ بیت عتیق کا طواف کریں۔ عتیق کے معنی آزاد شدہ کے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ جس سرزمین پر کعبہ واقع ہے وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

عام مساجد کی زمین پہلے کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے بعد میں اس پر مسجد تعمیر کی جاتی ہے۔ جب کہ سرزمین ابراہیمی کبھی کسی کی ملکیت نہیں رہی اس پر کسی کا تسلط نہیں تھا۔ اس میں

پانی تھا نہ سبزہ بلکہ بطور کامل ایک غیر زراعت پذیر زمین تھی۔ اس میں رہنے کی کسی کو خواہش نہ تھی(18) لہذا ایک آزاد سرزمین قرار پائی۔ آزادی کا تعلق خانہ کعبہ سے ہے۔ ایک آزاد گھر کے گرد طواف کرنا ہمیں آزادی کا درس دیتا ہے۔ آزاد گھر کی سمت نماز ادا کرنا بھی پیغام آزادی دیتا ہے۔ اس وقت یہ گھر آل سعود کی قید میں ہے آج اس کے گرد طواف کرنا حریّت کا درس نہیں دیتا سوائے اس کے کہ جمعہ سیاہ کی طرح اسلام کی راہ میں شہداء پیش کئے جائیں تاکہ کعبہ کو اپنی پہلے جیسی آزادی دوبارہ نصیب ہو جائے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام حج کئے بغیر وہاں سے روانہ ہو گئے آپؑ نے اپنے ایک خطبے میں فرمایا:

”اے لوگو، کل میں سرزمین عراق کی طرف جا رہا ہوں میں موت کا مشتاق ہوں اور تم سے بھی یہی کہنا چاہتا ہوں کہ موت الٰہی انسانوں کی گردن کا زیور ہے۔

خُطَّ الْمُوْتُ عَلٰی وُلْدِ آدَمَ مَخَطَّ الْقَلَادَةِ عَلٰی جِیْدِ الْفَتَاةِ وَمَا اَوْلَهَنِی اِلٰی اَسْلَافِی اشْتِیَاقَ یَعْقُوبَ اِلٰی یُوسُفَ وَاخبرلِی اَنَا لَاقِیهِ وَکَاَنِّی بِاَوصَالِی تَتَقَطَّعُها عَسَلان الْفَلَوات بَینَ النَّوَاوِیس وَکَرْبَلاء (19)

اولاد آدم کے لئے موت اسی طرح کا زیور ہے جیسے ایک دوشیزہ کی گردن میں گلوبند۔ میں اپنے آباء و اسلاف کی ملاقات کا اسی طرح مشتاق ہوں جیسے حضرت یعقوبؑ یوسفؑ کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ میری اس ملاقات کے لئے زمین کا انتخاب ہو چکا ہے۔ گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ نواویس اور کربلا کے درمیان صحرائی درندے میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں۔“ نواویس کربلا کے نزدیک اس گاؤں کا نام ہے جہاں حر بن یزید ریاحی کا قبیلہ سکونت پذیر تھا اور جناب حر کا مزار اسی گاؤں میں واقع ہے۔ امام علیہ السلام نے فرمایا ”موت کی وجہ سے تم سے کچھ بھی کم نہیں ہو گا بلکہ یہ تو شہادت کا سنہری گلوبند ہے جسے تم

اپنے گلے میں آویزاں رکھو اور اگر شہادت کا یہ ہار نہ پہنا تو موت لعنت بن کر تمہاری گردنوں میں آویزاں ہو جائے گی۔"

اس طوق لعنت کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح سے ہوا ہے:

سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ(20)

قیامت کے روز ان کا بخل طوق کی صورت میں ان کی گردن میں ڈالا جائے گا۔ مال ذخیرہ کرنے والے انسان کی گردن میں لعنت کا یہ طوق ڈالا جائے گا۔

امام علیہ السلام نے موت کا نقشہ بیان کرنے کے بعد فرمایا:

"میں بعد میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے بے خبر نہیں ہوں مجھے معلوم ہے میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میرے لئے کربلا کی سرزمین پر ایک قبر فراہم کی گئی ہے اور میں آگاہانہ طور پر اس کی طرف جا رہا ہوں۔ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ سرزمین کربلا کے درندے میرے بدن کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہے ہیں لیکن میں اپنے اجداد کی ملاقات کا اسی طرح مشتاق ہوں جیسے یعقوبؑ دیدار یوسفؑ کے مشتاق تھے۔ میں سب کچھ جانتے ہوئے روانہ ہو رہا ہوں۔ میرے ہمراہ فقط وہ لوگ آسکتے ہیں جن کا مقصد صرف لقاء اللہ ہو اور جو وصال خدا سے کمتر کسی چیز کی فکر میں نہ ہوں۔ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا:

اگرچہ اموی حکومت کے جاسوس یہ باتیں سن رہے تھے لیکن آپ نے کھلم کھلا فرمایا۔

مَنْ كَانَ بَاذِلاً مُهْجَتَهُ وَ مُوَطِّنًا عَلٰى لِقَاءِ اللّٰهِ نَفْسَهُ فَلْيَرْحَلْ مَعَنَا فَاِنِّي مُصْبِحٌ رَاحِلاً اِنْ شَاءَ اللّٰهُ (21)

جو بھی میری خاطر اپنی جان قربان کر سکتا ہو اور اپنے آپ کو وصال خدا کے لئے آمادہ کرلے وہ ہمارا ہمسفر ہو سکتا ہے میں ان شاء اللہ کل صبح روانہ ہو جاؤں گا۔

علی علیہ السلام جو اسلام میں سب سے پہلے عارف ہیں عہد نامہ مالک اشتر میں فرماتے ہیں: "خدایا میرا اور میرے لشکر کے سپہ سالار کا خاتمہ شہادت پر قرار دے۔" اور آپ کے فرزند عالی مقام حضرت امام حسینؑ کے عرفان نے نہ فقط دعائے عرفہ میں جلوہ دکھایا بلکہ

خطبہ مکہ میں نیز لوگوں کو جنگ کی دعوت دینے میں بھی اپنا ظہور دکھایا ہے۔

امام سجاد علیہ السلام بھی صحیفہ سجادیہ کی دعا میں خدا سے عرض کرتے ہیں "الٰہی ہمیں ایسی حمد کی توفیق دے جس کی بناء پر ہم مقام سعادت تک پہنچ سکیں۔" صحیفہ سجادیہ کے بارے میں امام خمینیؒ نے اپنے وصیت نامے میں لکھا ہے "ہم اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ صحیفہ سجادیہ ہمارے امام سے تعلق رکھتا ہے۔"

امام سجاد علیہ السلام فرماتے ہیں:

"حَمْداً نَسْعَدُ بِهِ فِي السُّعَدَاءِ مِنْ اَوْلِيَائِهِ وَنَصِيرُ بِهِ فِي نَظْمِ الشُّهَدَاءِ بِسُيُوفِ اَعْدَائِهِ اِنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيدٌ" (22)

ایسی حمد جس کے ذریعہ اس کے سعادت مند دوستوں میں شمار ہو کر سعادت مند قرار پائیں اور ان شہیدوں کے زمرے میں شمار ہوں جو اس کے دشمنوں کی تلواروں سے شہید ہوئے۔ بے شک وہی ولی اور قابل ستائش ہے۔"

ممکن ہے کوئی شخص مسئلہ شہادت کی توجیہ کرے اور جواز کے طور پر یہ کہے کہ جو انسان اہل بیت کے حق سے آشنا ہے وہ اگر بستر بیماری پر مر جائے تو بھی شہید ہے۔ اس جواز کو ختم کرنے کے لئے امام سجاد علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ بیان فرمایا- "خدایا ہمیں اتنی توفیق عطا فرما تاکہ تیرے دشمنوں کی تلواروں کے ذریعے صف شہداء میں داخل ہو جائیں۔" اس دعا میں عارفانہ حماسہ وشجاعت واضح اور نمایاں ہے-

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امام خمینیؒ نے اپنے وصیت نامے میں تمام ائمہ ہدی علیہم السلام کی عزا میں شرکت کرنے کا حکم کیوں دیا ہے خصوصاً حضرت امام حسین علیہ السلام کی عزاداری میں بھرپور شرکت کے متعلق وصیت کیوں کی ہے؟

یہ آپ کا قانونی وصیت نامہ ہے آپ نے اس میں فرمایا ہے "حسین بن علی علیہما السلام ایک حماسی روح کا نام ہے اس حماسی روح سے غفلت نہ برتی جائے۔" یہ بھی حماسہ وعرفان

کی ہم آہنگی کی ایک علامت ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام فرماتے ہیں:

''اِنّ اَکْرَمَ الْمَوْتِ اَلْقَتْلُ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ (23)

سب سے اشرف موت خدا کی راہ میں قتل ہونا ہے۔''

موت کے کئی درجات ہیں سب سے زیادہ اشرف درجہ خدا کی راہ میں شہید ہونا ہے اسی وجہ سے علی علیہ نے السلام نے فرمایا۔

''فَرَضَ اللّٰہُ الْجِہَادَ عِزّاً لِلاِْ سْلَام (24)

خداوند تعالیٰ نے اسلام کی عزت کے لئے جہاد کو واجب قرار دیا ہے۔''

اگرچہ قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے:

اَلعِزّۃُ لِلّٰہِ وَلِرَسُولِہِ وَلِلْمُؤمِنِیْنَ (25)

عزت خدا اس کے رسول اور مومنین کے لئے ہے

لیکن عزیز بننے کا طریقہ جہاد کو قرار دیا ہے آج ایران کی یہ ساری عزت شہداء کے خون، قیدیوں کی اسارت، گمشدہ مجاہدین کے فقدان اور زخمیوں کے ایثار و قربانی کی رہین منت ہے۔ لیکن جو اس کے برعکس عمل کرے اس کے بارے میں علی علیہ السلام کا فرمان ہے:

اَوّلُ مَا تَغْلِبُونَ عَلَیْہِ مِنَ الْجِہَادِ، اَلْجِہَادُ بِاَیْدِیْکُمْ ثُمّ بِاَلْسِنَتِکُمْ ثُمّ بِقُلُوبِکُمْ فَمَنْ لَمْ یَعْرِفْ مَعْرُوفاً وَلَمْ یُنکِرْ مُنْکَراً قُلِبَ فَجُعِلَ اَعْلَاہُ اَسْفَلَہُ وَاَسْفَلَہُ اَعْلَاہُ (26)

جہاد کے دوران سب سے پہلی چیز جس میں تم مغلوب واقع ہو گے ہاتھ کا جہاد، اس کے بعد زبان کا جہاد اور اس کے بعد دل کا جہاد ہے۔ جو اچھائی کی پہچان نہ رکھتا ہو اور بدی کا انکار نہ کرے اس کا نچلا حصہ اوپر اور اوپر کا حصہ نیچے کر کے الٹا کر دیا گیا ہے۔''

یعنی جو معروف کی شناخت نہ رکھتا ہو اور منکرات کے خلاف جہاد نہ کرے وہ ایک الٹا انسان ہے۔ جو عقل و شرع کی جانب سے تصدیق کی گئی چیزوں کی تصدیق نہ کرے اور عقل و شرع کی طرف سے ٹھکرائی ہوئی باتوں کو نہ ٹھکرائے وہ الٹا انسان ہے۔ منکر کو اسی وجہ سے منکر کہتے ہیں کہ عقل و شرع کی جانب سے ٹھکرایا ہوا اور ناشناختہ ہوتا ہے جس کی شناخت اس قسم کی نہ ہو وہ الٹا ہے اس کا دل خاک کی طرف اور پاؤں اوپر کی جانب ہیں۔

آخرت میں کچھ لوگ کیڑے مکوڑوں کی طرح محشور ہوں گے مثلا" چیونٹیوں کی طرح اٹھائے جائیں گے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ان کی ساری توجہ فقط پیٹ پر تھی قرآن میں ان کے بارے میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰ اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوا رُؤُسِہِم (27)

اگر آپ ملاحظہ کریں تو مجرموں کے سر الٹے ہوں گے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے اپنے ایک صحابی سے فرمایا "بنو امیہ کے فلاں شخص کے ساتھ بات نہ کرو اس کے ساتھ مناظرہ کی ضرورت نہیں ہے چونکہ اس نے تمام شرعی مسائل اپنے گناہوں کی تاویل کے لئے سیکھے ہیں۔ اس نے فقط یہ سیکھا ہے کہ کن مواقع پر روزہ کھایا جاسکتا ہے۔ اس نے دین اس لئے پڑھا ہے تاکہ لوگوں کو کہہ سکے میرے معدہ میں زخم ہے لہذا روزہ نہیں رکھ سکتا۔" چونکہ تمام فقہی مسائل میں کچھ استثنائی صورتیں بھی ہیں مثلاً روزہ واجب ہے لیکن بعض مواقع پر توڑا جاسکتا ہے۔ حج واجب ہے لیکن بعض صورتوں میں ترک کیا جاسکتا ہے ، زکوٰۃ دینا واجب ہے لیکن بسا اوقات معاف ہے ، خمس واجب ہے لیکن بعض مواقع پر معاف ہے یا مثلاً نماز کھڑے ہو کر پڑھنا واجب ہے لیکن بعض مخصوص حالات میں بیٹھ کر پڑھنا بھی جائز ہے۔ غرض یہ کہ تمام احکام فقہ میں اس قسم کی استثنائی صورتیں موجود ہیں۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں:

"دَعْهُ يَاعَمَّار! فَاِنَّهُ لَمْ يَاخُذْمِنَ الدِّيْنِ اِلاَّ مَا قَا
رَنَهُ مِنَ الدُّنْيَا وَ عَلٰى عَمْدٍ لَبَّسَ عَلٰى نَفْسِهِ

لِيَجْعَلَ الشُّبُهَاتِ عَاذِراً لِسَقَطَاتِهِ (28)

اے عمار اسے چھوڑ دو اس نے دین سے بس وہی لیا ہے جو اسے دنیا سے قریب کردے۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے آپ کو شبہات میں ڈال رکھا ہے تاکہ ان شبہات کو اپنی لغزشوں کا بہانہ قرار دے سکے۔"

بعض لوگ ایسے ہیں جو جان بوجھ کر اپنے آپ کو اندھا بنا لیتے ہیں ورنہ سعادت کا راستہ تو ہر ایک پر کھلا ہوا ہے۔ اتنے زیادہ جوانوں کی اصلاح ہوگئی ہے۔ ملک کا نظام تبدیل ہو چکا ہے لیکن کچھ لوگ جو ایک ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہیں ان کا آنا جانا اور غم و خوشی ایک ہیں' سب کی فکر بھی ایک جیسی ہے۔ انقلاب کے بارے میں صحیح سوچ نہیں رکھتے۔ ممکن ہے یہ گمان کرتے ہوں کہ دوسرے لوگ بھی ہماری طرح سوچتے ہیں اور ہمارے ہم فکر ہیں جبکہ یہ غلطی پر ہیں ان کی تعداد بہت محدود ہے اگر اپنے خول سے باہر آجائیں اور لوگوں سے آملیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ عام افراد کیا کہہ رہے ہیں۔

ہزاروں لوگ دور دراز کے شہروں سے پیدل چل کر امام خمینی کے مزار کی زیارت کے لئے آتے ہیں۔ انہی لوگوں نے ملک کی حفاظت کی ہے اور آج اس مملکت کے اصلی وارث بھی یہی ہیں۔ ان کا دور دراز سے پیدل چل کر امام کی زیارت کے لئے آنا اس لئے ہے کہ امام خمینی نے اسلامی نظام برقرار کیا ہے اور امام حسین علیہ السلام کی راہ کو زندہ کیا ہے۔

مدتیں گزر گی تب جا کر امام خمینیؒ کا مقام بلند ادراک ہوگا۔ ائمہ معصومین علیہم السلام کے بعد کہ جن کے ساتھ کسی کو بھی قیاس نہیں کیا جا سکتا امام خمینیؒ کا مقام اگر سب سے بڑھ کر نہ ہو تو کسی سے کمتر نہیں ہے۔ امام عزیز کی رحلت نے داغ غم کو ہمیشہ کے لئے ہمارے جگر پر چھوڑا ہے کہ جلدی جس کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ ہم امام زادوں کے مزار پر یوں زیارت پڑھتے ہیں:

اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَآتَيْتَ الزَّكَاةَ
وَاَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَيْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَطَعْتَ

اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَجَاهَدتَ فِی اللّٰهِ حَقّ جِهَادِهِ
حَتّیٰ اَتٰیكَ الْیَقِیْنُ

میں شہادت دیتا ہوں کہ آپ نے نماز قائم کی ،زکواۃ ادا کی ،امر بالمعروف اور نہی از منکر کیا ہے ،اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی ہے ،اللہ کی راہ میں جہاد کا حق ادا کیا ہے حتٰی کہ آپ کو یقین حاصل ہو گیا۔

زیارت ناموں کا یہ مضمون اور مذکورہ مطالب دیگر امام زادوں کے بارے میں ہم سنتے آئے ہیں لیکن امام خمینی کے بارے میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ انقلاب سے پہلے کے حوادث اور بعد کے وقائع کا آپس میں تقابل کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ تمام مراجع عظام کفر و ظلم کے خلاف فتوٰی دیا کرتے تھے ،تمام مدرسین ظلم و ستم کے خلاف کچھ نہ کچھ کہتے یا لکھتے رہتے تھے۔ ظالموں کے خلاف تقریریں بھی کرتے تھے لیکن جس انسان نے نظام کفر کا تختہ الٹ دیا ،جس نے نظام ستم کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا ،جس نے ظالموں کے ہاتھ کاٹ دیئے وہ فقط امام خمینیؒ کی ذات تھی۔ یہ آپ ہی کا کارنامہ ہے جو کسی معمولی انسان سے ممکن ہی نہ تھا لہذا پورے خلوص کے ساتھ آپ کے بارے میں کہا جا سکتا ہے:

اَشْهَدُ اَنَّكَ قَدْ اَقَمْتَ الصَّلٰوةَ وَآتَیْتَ الزَّكَاةَ
وَاَمَرْتَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَیْتَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاَطَعْتَ
اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَجَاهَدتَ فِی اللّٰهِ حَقّ جِهَادِهِ
حَتّیٰ اَتٰیكَ الْیَقِیْنُ

امام خمینی حضرت امام حسین علیہ السلام کے سچے پیروکاروں میں سے تھے اس مطلب کو آپ نے اپنے وصیت نامے میں بھی ثابت کیا ہے۔ زیارت نامہ عاشورا پڑھنے کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے اس کے اندر اہل بیت پر درود و رحمت اور ان کے دشمنوں پر لعنت بھیجنے کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ طرز تفکر منور ہو جائے۔ ورنہ آج نہ معاویہ موجود ہے یہ ہی یزید موجود ہے تاکہ ان پر لعن کی جاتی ہے ،ان کا نام و نشان مٹ چکا ہے اور ان کی قبریں بھی فقط زبالہ

دانی ہی ہیں- آج یزید زمانہ کی فکر اور اس کی راہ موجود ہے۔ فرعون کی زوجہ نے خداوند تعالیٰ سے یہ دعا مانگی تھی:

رَبِّ نَجِّنِیْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ (29)

خداوندا مجھے فرعون اور اس کے عمل سے نجات عطا فرما۔

اس عظیم المرتبت خاتون نے اللہ تعالیٰ سے فقط فرعون سے نجات کی دعا نہیں مانگی تھی بلکہ اس کے خدا مخالف عمل و فکر سے بھی نجات چاہی تھی۔ چونکہ تفکر ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام کی راہ آج بھی زندہ ہے شہید پر آنسو بہانے سے انسان کے اند شہادت کا شوق پیدا ہوتا ہے اور انسان کے اندر حماسہ و شجاعت کی خو زندہ ہوتی ہے- ایک حسینی شخص نہ دوسروں پر ظلم کرتا ہے نہ ہی اپنے اوپر ظلم قبول کرتا ہے۔ جو لوگ ظلم کرتے ہیں ان میں خوئے حسینی موجود نہیں ہے- چونکہ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص حسینؑ کا شیعہ ہو اور ظلم کرتا ہو یا پھر ظلم سہتا ہو- ظلم کرنا بنو امیہ کی خصلت ہے- انہوں نے دوسروں پر ظلم کیا اور یہ نہ ہو سکا تو پھر خود دوسروں کا ظلم برداشت کرتے رہے۔ لہذا ظلم کرنے اور ظلم سہنے والے سب اموی ہیں اور قیامت میں ہر ایک کو اپنے امام کے ساتھ پکارا جائے گا-

یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍ بِاِمَامِهِمْ (30)

قیامت کے روز ہم ہر انسان کو اس کے امام کے ساتھ بلائیں گے-

قیامت کے دن ستم کار انسان بنو امیہ کی صف میں کھڑا ہو گا۔ اگر ہم اپنے بارے میں یہ دیکھنا چاہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی راہ پر چل رہے ہیں یا بنو امیہ کی راہ پر تو یہ دیکھیں کہ ہمارے اندر ستم پذیری اور سلطہ گری کی خو موجود ہے یا نہیں ؟ اگر اپنے اندر یہ قبیح خصائل نظر آئیں احساس کیا تو پھر اپنے اخلاق پر ہمیں نظر ثانی کرنی چاہیئے۔ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشورا اپنے تمام اصحاب کو اکٹھا کر کے اتمام حجت کرتے ہوئے ان سے فرمایا:

"اموی ستم کاروں کو مجھ سے سروکار ہے آپ سے انکا کوئی واسطہ نہیں ہے- میں جانتا ہوں کہ آپ بہت ہی باوفا ساتھی ہیں لیکن یہاں پر فقط موت اور شہادت ہے۔ یہ سارا علاقہ

بنو امیہ کے گماشتوں سے اٹا ہوا ہے جس کی وجہ بنو امیہ کا غلط پروپیگنڈہ ہے۔ آپؑ نے فرمایا "جو بھی یہاں رکے گا وہ شہید ہو جائے گا حتی کہ میرا شیر خوار بیٹا بھی قتل کر دیا جائے گا۔" جناب قاسمؑ نے عرض کی "چچا جان آیا یہ لوگ خیام پر حملہ کریں گے؟" آپؑ نے فرمایا "جب تک میں زندہ ہوں وہ ہرگز ایسا نہیں کریں گے۔" جناب قاسمؑ نے عرض کی "یہ شیر خوار بچہ تو میدان جنگ میں نہیں جا سکتا اور وہ بھی خیام پر حملہ نہیں کریں گے تو پھر اسے کس طرح شہید کیا جائے گا؟" امام علیہ السلام نے جواب دیا کہ جب اس کا جگر پیاس سے خشک ہو جائے گا اس وقت میں اسے پانی سے سیراب کرنے کے لئے لے جاؤں گا اسی آن ایک تیر آئے گا جس کے ذریعے یہ شیر خوار بھی شہید ہو جائے گا۔

جناب قاسم نے عرض کی "چچا جان آیا میں بھی شہید ہو جاؤں گا؟" آپؑ نے دریافت فرمایا موت تمہیں کیسی لگتی ہے؟ جناب قاسم نے جواب دیا۔

اَحلٰی مِنَ العَسَلِ

"شہد سے زیادہ شیریں۔"

یہ وہی عارفانہ حماسہ اور عرفانی شجاعت ہے جس کی وجہ سے شہادت شہد سے زیادہ شیریں ہو جاتی ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے جناب قاسم سے فرمایا "ہاں بیٹے تم بھی شہید ہو جاؤ گے" (31)۔

امام زین العابدین علیہ السلام فرماتے ہیں "کربلا میں سب سے زیادہ بوڑھے فرد یعنی جناب حبیب بن مظاہر نے امام حسین علیہ السلام سے عرض "کیا آیا زین العابدینؑ بھی شہید ہو جائیں گے؟" امام علیہ السلام نے جواب دیا "وہ شہید نہیں ہوں گے چونکہ وہ آٹھ ائمہ کے والد ہیں۔"

امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور جب اپنے اصحاب کو واپس لوٹ جانے کی اجازت دیدی اور اپنی بیعت سے ان کو آزاد کر دیا تو سب سے پہلے جس شخصیت نے اٹھ کر اپنی وفاداری کا اظہار کیا وہ حضرت عباس بن علی علیہ السلام تھے۔ آپؑ نے کھڑے ہو کر کہا

کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ہم آپ کا ساتھ چھوڑ دیں۔ اس کے بعد باقی اصحاب نے باری باری عرض ادب کر کے اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ امام علیہ السلام نے فرمایا کہ اب جب کہ تم لوگ میرا ساتھ نہیں چھوڑ رہے تو کم از کم اپنی خواتین اور بچوں کو قریب کے کسی گاؤں میں چھوڑ آؤ اگر اصحاب امامؑ اپنی خواتین سے یہ کہہ بھی دیتے کہ امامؑ یوں فرما رہے ہیں تو وہ عورتیں ضرور یہ جواب دیتیں جس طرح تم نبی کے بیٹے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے ہم بھی علیؑ کی بیٹی کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتیں۔ چنانچہ اصحاب امامؑ کی خواتین حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے ساتھ ہر تکلیف میں برابر کی شریک رہیں۔

امام علیہ السلام نے اس کے بعد اصحاب سے فرمایا۔

"اپنے کپڑے صاف کر لو تا کہ کل صاف ستھرے کپڑے پہن کر میدان میں جا سکو چونکہ یہ لباس ہی تمہارا کفن ہو گا۔ (32) کوئی اور آپ کو کفن دینے والا نہیں ہے ، شہید کو غسل کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن کفن دیا جاتا ہے۔ البتہ وقت شہادت بدن پر موجود لباس ہی اس کا کفن ہوتا ہے" (33) اس کے بعد تمام اصحاب اٹھ کر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے اور خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں دعاء و مناجات میں مشغول ہو گئے۔ بعض نے یہ رات ذکر رکوع اور بعض نے ذکر سجود میں بسر کی۔ صبح تک سب مناجات میں مشغول رہے اور وداع کرتے رہے (34)۔

امام حسین علیہ السلام کو دعا و مناجات اور نماز کے ساتھ ایک خاص قسم کا لگاؤ تھا اور اب ان چیزوں کے ساتھ بھی وداع کا وقت قریب آ پہنچا تھا۔ جب صبح ہوئی تو عمر سعد نے انعام حاصل کرنے کی غرض سے امام علیہ السلام کے لشکر کی طرف پہلا تیر پھینکا (35)۔ اس کے بعد تیروں کی بارش شروع ہو گئی۔ امام علیہ السلام نے اس وقت فرمایا: اب آپ کو جہاد اور دفاع کی اجازت ہے۔

علی علیہ السلام بنو امیہ کے ساتھ ایک جنگ کے دوران گریہ کرنے لگے جب لوگوں نے دیکھا کہ امیر المومنین علیہ السلام رو رہے ہیں تو اس کا سبب پوچھنے لگے۔ آپ نے

دریافت فرمایا "کیا میرا حسین میدان جنگ میں چلا گیا ہے؟" اصحاب نے عرض کیا ہاں مولا وہ میدان میں گئے تھے لیکن صحیح وسالم واپس پلٹ آئے ہیں علی علیہ السلام نے فرمایا میں اس کے آج کے دن کے لئے نہیں رو رہا بلکہ اس دن کے لئے رو رہا ہوں جب میرا یہ بیٹا گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں جائے گا لیکن واپسی پر خالی گھوڑا خیموں کی طرف پلٹے گا۔ گھوڑا ہنہنائے گا اور اس ہنہناہٹ کے ذریعے وہ کہہ رہا ہو گا

اَلظَّلِیمَةُ الظَّلِیمَةَ مِنْ اُمَّةٍ قَتَلَتِ بَنَ بِنْتِ نَبِیِّهَا (36)

ظلم ہو گیا ظلم ہو گیا امت نے اپنے نبیؐ کے نواسے کو قتل کر دیا ہے۔

اس حالت پر علی علیہ السلام نے بھی گریہ کیا اور حضرت ولی عصر عجل اللہ تعالی فرجہ الشریف بھی روتے ہیں۔

وَاسرَعْ فَرَسكَ شَارِداً اِلیٰ خِیَامِكَ قَاصِداً بَاکِیاً فَلَمَّا رَاَیْنَ النِّسَاء جَوَادكَ فَخَزِیاً نَظَرْنَ سَرَجَكَ عَلَیْهِ مَلْوِیّاً بَرَزْنَ مِنَ الْخُدُورِ نَاشِرَاتِ الشُّعُورِ عَلَى الْخُدُودِ لاَ طِمَاتٍ وَلِلْوُجُوهِ سَافِرَاتٍ بِالْعَوِیلِ دَاعِیَاتٍ وَبَعْدَ الْعِزِّ مُذَلَّلاَتٍ وَاِ لیٰ مَصرَعِكَ مُبَادِرَاتٍ (37)

آپ کا گھوڑا جب گردن جھکائے ہوئے خیام کی طرف روتا اور ہنہناتا ہوا آیا اور خواتین نے آپ کے مرکب کو شرمندہ دیکھا اور اس کی پشت پر آپ کی ٹیڑھی زین دیکھی تو خیموں سے باہر نکل آئیں۔ وہ ننگے سر باہر آئیں اپنے چہروں پر ماتم کر رہی تھیں۔ وہ چہروں کو کھولے ہوئے تھیں پکار رہی تھیں اور اپنی ساری عزت کے باوجود روتی ہوئی آپ کے مقتل کی طرف جا رہی تھیں۔

امام زمانہؑ فرماتے ہیں "اے میرے جد بزرگوار میں اگر صبح و شام روتا ہوں تو بھی کم ہے

اگر میرے آنسو خشک ہو جائیں اور آنکھوں سے خون جاری ہو جائے تو کوئی تعجب نہیں ہے کیونکہ میرے لئے وہ منظر قابل برداشت نہیں ہے جب آپ کا گھوڑا خالی واپس آیا' اہل بیت کی خواتین اپنے چہرے پیٹ رہی تھیں ان کے بال کھلے تھے اور وہ سر برہنہ آپ کے مقتل کی طرف جا رہی تھیں اس منظر پر میں صبر نہیں کر سکتا۔ کتنا مشکل مرحلہ تھا جب علیؑ کی بیٹی نے اپنے ہاتھوں کو اپنے سر پر رکھ لیا تھا۔ علیؑ کی بیٹی کے اس عمل میں ایک تقاضا بھی موجود ہے (38)

موت کے وقت میت کے بٹن کھولنا اسلامی آداب میں سے ہے موت کی حالت میں انسان کے سینے پر کوئی بھاری چیز نہیں ہونی چاہئے تاکہ وہ آسانی سے جان دے سکے۔ لیکن حسین بن علیؑ جب مقتل میں احتضار کی حالت میں تھے تو ناگہاں محسوس کیا کہ سینے پر ایک بھاری چیز موجود ہے آپؑ نے فرمایا تم کون ہو؟ جو بھی ہو بہت ہی بلند مرتبہ مقام پر بیٹھ گئے ہو۔

لَقَدِ ارْتَقَيْتَ مُرْتَقىً عَظِيماً طَالَ مَا قَبَّلَهُ رَسُولُ اللّٰهِ (39)

تم اس بلند مقام پر چڑھ گئے ہو جسے رسول اللہؐ نے بوسہ دیا ہے۔

چونکہ متعدد مرتبہ لوگوں نے دیکھا تھا کہ نبی اکرمؐ حسینؑ کے سینے کے بٹن کھول کر بوسہ دیا کرتے تھے لیکن لوگوں کو اس کی وجہ معلوم نہیں تھی۔ (40)

تھوڑی دیر کے بعد میدان میں تکبیر کی آواز بلند ہوئی امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا گیا "کربلا میں یہ ہل چل کیسی ہے؟" آپؑ نے فرمایا "خود دیکھو میرے بابا کا سرِ مقدس نیزے کی نوک پہ ہے" (41)۔

دسویں فصل

شجاعت و عرفان ایسے دو گرانبہا امر ہیں جو آپس میں ہم آہنگ اور ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں لہذا دونوں میں سے اگر ایک ترک ہو جائے تو دوسرا بھی ترک ہو جائے گا۔ جیسا کہ قرآن و عترت ایک دوسرے کے ہم پلہ ہیں چنانچہ ان میں سے بھی اگر ایک حاضر ہو تو دوسرا بھی ظاہر ہو گا جیسا کہ ایک کا ترک کرنا دوسرے کے ترک کا سبب بھی ہے یعنی قرآن کو ترک کرنا عترت طاہرہ سے دوری کا سبب ہے۔اس کے برعکس عترت کو ترک کرنا قرآن سے دوری کا سبب ہے۔ قرآن و عترت کو لوگوں کے درمیان سے ختم کرنے والا پہلا گروہ بنوامیہ کا تھا اور اس کے بعد ان کے پیروکار ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بنوامیہ سرے سے مسلمان ہی نہیں تھے چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام بنوامیہ کے متعلق فرماتے ہیں:

”مَا اَسلَمُوا بَلِ استَسلَمُوا وَ اَظهَرُواالاِسلاَمَ وَ اَبطَنُوا الکُفرَ“ (1)

یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے بلکہ اسلام کا اظہار کرتے تھے۔ ظاہراً مسلمان لیکن باطن میں کافر تھے۔ فتح مکہ تک تو یہ کھلے ہوئے کافر تھے لیکن انہوں نے اپنے شوم اور منافقانہ مقصد کو پانے کے لئے جاہلیت کی خلق و خو کو تقویت دی۔ ترویج جاہلیت کے لئے انہوں نے صاحبان اقتدار سے بھی مدد لی۔ بنوامیہ نے حکومت کے اداروں میں اہم عہدوں تک رسائی پیدا کرلی تھی اور آہستہ آہستہ طاقتور ہوگئے۔ اس تمام مدت میں انہوں نے دین کو دین کے نام پر میدان سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جس میں کسی حد تک انہیں کامیابی

بھی نصیب ہوئی۔ بنوامیہ کی حکومت ۱۶۱ھ کے بعد بھی رہی اس لئے انکی ریشہ دوانیاں بعد میں بھی جاری رہیں۔

ان حالات میں قرآن وعترت کا عالم غربت سے نکل کر دوبارہ لوگوں کی زندگی میں آجانا واقعہ کربلا کے بغیر ممکن نہیں تھا یعنی امام حسین علیہ السلام کی جان ومال کی قربانی اور خاندان کی قید وبند کی صعوبتوں کے بغیر ناممکن تھا چنانچہ اگر اس سے کمتر قربانی کے ذریعے مقصد کا حصول ممکن ہوتا تو امام علیہ السلام ہرگز یہ کام نہ کرتے۔ اس لحاظ سے حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت علی علیہ السلام کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام اگر امام حسین علیہ السلام سے زیادہ شجاع نہ بھی ہوں تو ان کے ہم پلہ ضرور ہیں جب کہ جو کام امام حسین علیہ السلام نے انجام دیا وہ ہرگز علی علیہ السلام نے انجام نہیں دیا۔ علیؑ فرماتے ہیں کہ میں تنہا رہ گیا ہوں اور میرے ہمراہ فقط میرے اہل بیتؑ ہیں۔ میں نے تحمل کیا اور انہیں شہید ہونے سے بچالیا۔ یہ کہنا ممکن ہے کہ خدانخواستہ اگر اہل بیت امیر المومنین کے ہمراہ شہید ہو جاتے تو قرآن وعترت اور اسلام اس عالم غربت سے باہر نکل آتے لیکن اس کے باوجود علی علیہ السلام نے انہیں شہید کروانے میں تحمل کیا ہے۔(2) اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں شہادتیں پیش کرنے کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا۔ بنوامیہ حکومت کے اندر بہت زیادہ رسوخ حاصل کر چکے تھے چنانچہ اگر نبی اکرمؐ کے خاندان کے تمام افراد بھی شہید ہو جاتے تو بھی ثقلین کو غربت و مہجوریت سے نکالنا ممکن نہ تھا۔

علی علیہ السلام نے منافقین کے بارے میں ایک مطلب بیان فرمایا ہے جس کی تفسیر یہ ہے کہ:

صدر اسلام میں مسلمانوں کے اندر ایک اچھی خاصی تعداد ان منافقین کی تھی جو نبی اکرمؐ کے پکے دشمن تھے اور اکثر مخالفانہ کارگزاریوں میں مشغول رہتے۔ مثلاً جنگ احد میں مسلمان ایک ہزار کی تعداد میں مدینے سے نکلے لیکن راستے میں تین سو سے اوپر کچھ لوگ

واپس پلٹ گئے اور جنگ پر آمادہ نہ ہوئے یہ اس وقت کی بات ہے جب لشکر اسلام کے سالار اعلیٰ خود نبی اکرمؐ اور علمدار حضرت علیؑ تھے جب کہ باقی تمام مسلمان ہاتھوں میں قرآن اٹھائے ہوئے تھے۔(2) آنحضرتؐ خود میدان جنگ میں اترے اور آپ کی اتباع میں باقی لوگ بھی چل پڑے۔ پس صدر اسلام میں تین سو سے اوپر سرکردہ قسم کے منافقین موجود تھے۔ اکثر جنگوں میں ان کی کوشش یہ ہوتی کہ مشرکین کے ساتھ خفیہ روابط قائم کرلیں لیلتہ العقبتہ میں یہی منافقین رسول اللہ ﷺ کے راستے میں تاک لگا کر بیٹھے تھے تاکہ آپ کو شہید کر دیں۔(3) جب ان تمام سیاسی اور عسکری حیلوں سے ناکام اور مایوس ہوگئے تو بدترین اجتماعی اور غیر اخلاقی حربے استعمال کرنے لگے۔

مسئلہ افک میں بعض نے یہ شرمناک حرکت بھی کی کہ معاذاللہ نبی اکرمؐ کی ایک زوجہ پر بے عفتی کی تہمت لگائی تاکہ انہیں بدنام کرسکیں۔(4) اس کے پیچھے فقط منافقین کی اجتماعی اور غیر اخلاقی سازش کارفرما تھی چونکہ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ مشرکوں کے ساتھ سیاسی روابط اور عسکری گروہ بندی سے مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا نبی اکرمؐ کی ازواج کے بارے میں اس قسم کے شرمناک تہمتیں اور بہتان باندھنا شروع کر دیئے۔

قرآن کریم میں مذکورہ دونوں واقعات کو خداوند تعالیٰ نے الگ الگ ذکر کیا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے کہ نبی کی زوجہ کافر ہو لیکن اس کا یہ کفر نبی کی رسالت کے لئے مضر نہیں ہے چنانچہ حضرت نوحؑ کی زوجہ کافر تھی (5) اسی طرح حضرت لوطؑ کی بیوی بھی کافر تھی پس ان کے کفر نے ان انبیاء کے دامن پر کوئی دھبہ نہیں لگایا۔ لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ نبی کی زوجہ بدچلن ہو چونکہ اس سے نبیؐ کی اجتماعی حیثیت کی ہتک ہوتی ہے۔

چنانچہ صدر اسلام کے منافقوں نے یہ حرکت بھی کر ڈالی۔ قرآن میں سورہ نور کی آیات اس بارے میں نازل ہوئی ہیں تاکہ پیغمبر کے خاندان کی پاکدامنی محفوظ رہے لہذا لوگوں سے کہا گیا کہ تم نے اس تہمت کو روکا کیوں نہیں (6)۔

مشرکوں کے ساتھ رابطے کے بارے میں فرمایا:

وَتَرالَّذِیْنَ فِی قُلُوبِھِمْ مَرَض ...... اَن تُصِیبَنَا دآئرۃ(7)

وہ منافق جن کے دلوں میں مرض ہے ہمیشہ اسلام دشمنوں کے ساتھ خفیہ روابط بر قرار رکھتے ہیں ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ شاید قرآن اور اسلام کو شکست ہو جائے اور دوبارہ جاہلیت کا زمانہ پلٹ آئے لہذا ہم بلاوجہ کافروں سے اپنے روابط کیوں توڑیں۔

قرآن نے ان کی اس نیت سے پردہ اٹھایا اور فرمایا کہ اے نبی ان کور دل منافقوں سے کہہ دو:

عَسَی اللّٰہُ اَنْ یَاتِیَ بِالْفَتْحِ اَوْاَمْرٍمِّنْ عِنْدِہِ فَیُصْبِحُوا عَلیٰ مَا اَسَرّوا فِی اَنْفُسِھِمْ نَادِمِیْنَ (8)

امید ہے خدا اسلام کو فتح نصیب فرمائے گا یا اپنا امر ظاہر کرے گا اس وقت تمہیں ان نیتوں پر پشیمان ہونا پڑے گا جو تم نے اپنے دلوں کے اندر چھپا رکھی ہیں۔ اور پھر ایسے ہی ہوا ان منافقوں کے مشرکین کے ساتھ روابط نے انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ قرآن نے یہ راز فاش کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے قتل و غارت گری کا منصوبہ بنایا اور وہ بھی ناکام رہا ۔اس کے بعد انہوں نے اس شرمناک ترین ذلت کا ارتکاب کیا کہ قرآن نے اس کا راز بھی بر ملا ظاہر کر دیا۔ علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ان منافقوں نے خاندان رسول کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس تجزیہ سے نتیجہ لینے کے لئے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ مذکورہ منافقین جو اس وقت مسلمانوں کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ تھے اور نبی اکرم کے ہمراہ کبھی بھی نہ چل سکے آپ کی رحلت کے بعد کہاں گئے ؟ یہ کیسے ممکن ہوا کہ رسول اللہ کی آنکھ بند ہوتے ہی جب علی علیہ السلام کو گوشہ نشین بنادیا گیا تو منافقوں کی تمام سیاسی۔ اخلاقی اور عسکری خلاف ورزیاں یکایک ختم ہو گئیں ؟ آیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ کی رحلت کے فوراً بعد تمام منافق مر کھپ گئے تھے ؟یا یہ کہ آنحضرت کی وفات کے بعد ان سب نے توبہ کر لی تھی اور

سب ابوذر اور سلمان کی طرح بن گئے تھے ؟ یا پھر یہ کہ یہ لوگ حکومت وقت سے جا ملے اور حکومت کے ساتھ سازباز کرلی ؟

پہلا اور دوسرا احتمال درست نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ نہ تو سب کے سب مر گئے تھے نہ ہی انہوں نے توبہ کی بلکہ حکومت سے ساز باز کر کے جا ملے تھے یعنی معاویہ اور دیگر بنو امیہ حکومت وقت سے مل گئے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ معاویہ جو آخری وقت تک کفر کا علمدار بنا رہا اچانک والی شام کے طور پر سامنے آیا۔ معاویہ نے چالیس سال تک شام میں حکومت کی جن میں سے بیس سال شام کے والی، نمائندہ اور گورنر کے طور پر اور باقی بیس سال خلیفہ کے عنوان سے تھی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اچانک معاویہ نے شام سے کیسے سر اٹھایا؟ یہ شام کا والی کیسے بنا اور رومی مشیروں سے سیاسی رواط کس طرح قائم کر لئے ؟ اس نے اپنے لئے شام کو کیوں انتخاب کیا اور پھر شام کے تمام فوجی سالار بنو امیہ میں سے کیوں تھے ؟ کیوں دوسرے فداکار مسلمانوں کو کوئی مقام و منصب نہیں دیا جاتا تھا ؟ سلمان فارسی جیسے پاک دل افراد کو کیوں کوئی اساسی منصب نہیں سونپا گیا ؟ تمام جاہل اور خونخوار عربوں کو لشکر کا سالار مقرر کیا گیا ؟ یہ درحقیقت ایک اموی سازش تھی جو مرکزی حکومت اور اقتدار کے ساتھ گٹھ جوڑ کر چکی تھی اور جس نے مرکزی اقتدار کو بہت زیادہ فائدہ پہنچایا۔ یہ حالات دیکھ کر علی علیہ السلام نے فرمایا۔

اِنَّمَا النَّاسُ مَعَ الْمُلُوكِ وَ الدُّنْيَا اِلاَّ مَنْ عَصِمَ اللّٰهُ(9)

تمام لوگ سلاطین اور دنیا کے ہمراہ ہوتے ہیں سوائے ان کے جنہیں خدا بچا لے۔

گلستان سعدی میں جو مطلب بیان ہوا ہے اس کی بنیاد علیؑ کا کلام ہے۔

اَلنَّاسُ عَلٰى دِيْنِ مُلُوكِهِمْ

لوگ سلاطین کے دین و مذہب پر ہوتے ہیں۔

بہر حال بنو امیہ کے سرغنوں کو ایک قوی اور مسلح اموی فوج تیار کرنے کے لئے اس

وقت ایک بہت بڑے سرمائے کی ضرورت تھی جو مکے اور مدینے میں ہاتھ آنا ناممکن تھا۔ یہ کام فقط شام میں امکان پذیر تھا چونکہ شام میں اس وقت بڑے بڑے سرمایہ دار موجود تھے جو قیصر روم کے ساتھ بھی تعلقات قائم کئے ہوئے تھے لہذا ان تعلقات اور سرمائے کے بل بوتے پر ایک خونخوار اور جرار لشکر تشکیل دینے پر قادر تھے۔ اسی وجہ سے معاویہ نے شام کا انتخاب کیا چونکہ اس قسم کی ایک خونخوار فوج کے بغیر جاہلیت کو باقی رکھنا غیر ممکن تھا ۔ جاہلیت کی عادت غارتگری ، قوم پرستی ، درندگی کی عادت تھی۔ چنانچہ عربی عصبیت کی وجہ سے قوم پرستی اور سرمائے کے سہارے غارتگری کو انہوں نے جاری رکھا۔

مسلمانوں کو اس فوج میں کلیدی منصب سے محروم رکھا گیا اس کے بجائے مسیحی اور غیر مسیحی افراد کو روم سے بلا کر فوج کے امور ان کے سپرد کئے گئے تاکہ جہاں بھی اسلام کی حمایت میں کوئی آواز اٹھے اسی جرار لشکر کے ذریعے اسے دبا دیا جائے۔ چنانچہ خراسان میں جب لوگوں نے ان کے خلاف تحریک چلائی تو یہ تحریک بہت سے جابروں سے نہیں دبائی جا سکی آخر کار اس لشکر جرار نے آکر اہل خراسان کی آواز حق کو دبا دیا۔ دیگر مقامات پر بھی جو کام دوسروں سے نہ بن پڑتا وہ اسی فوج کے ذریعے سے انجام پاتا تھا۔ بنوامیہ نے جاہلیت کی اس خو سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے غارت گری اور جاہلیت کو باقی رکھنے کے لئے لوگوں کو ہمیشہ جہالت میں رکھا۔ (10) امویوں کے دور میں عام لوگوں کے لئے لکھنا پڑھنا ممنوع تھا۔ لوگوں میں تعلیم کی بھرپور صلاحیت موجود تھی لیکن بنوامیہ نے علم و فرہنگ کے دروازے ان پر بند کر رکھے تھے۔ دسویں اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے لوگوں کو باقاعدہ جہالت میں رکھا وہ ایک خاص سیاسی منصوبے کے پیش نظر امام باقر علیہ السلام کا جب بھی نام لیتا تو آپؑ کو باقر العلوم ، وصی الاوصیاء اور وارث انبیاء جیسے القابات سے یاد کرتا۔

جب امام باقر علیہ السلام کو مدینہ سے شام لایا گیا تو اہل شام نے مدینہ کی ثقافت سے آشنا ہونا شروع کر دیا۔ انہوں نے امام باقر علیہ السلام کو نزدیک سے دیکھا وہ اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کے طلبگار تھے لہذا جلد ہی امام باقرؑ کا گھر لوگوں کی آمدورفت کا مرکز بن گیا۔ ہشام

نے جب یہ صورت دیکھی تو حکم دیا کہ امام باقر علیہ السلام کو جتنا جلدی ہو سکے شام سے نکال کر دوبارہ مدینہ واپس کر دیا جائے مبادا لوگ علوم اسلامی سے آشنا ہو جائیں۔ چونکہ ظالم اور ستم گار افراد کے لئے اسی صورت میں اپنی جاہلیت کی خو جاری رکھنے کا امکان ہے جب لوگ جہالت میں مبتلا رہیں۔

اسی وجہ سے نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جس طرح تمہارے لئے سانس لینا ضروری ہے ایسے ہی علم حاصل کرنا بھی لازمی ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ کہے میں سانس نہیں لیتا یا پانی نہیں پیتا تاکہ مر جاؤں بلکہ سانس لینا اور پانی پینا واجب ہے۔ اسی طرح علم حاصل کرنا، علمی محافل تشکیل دینا، علمی کتابیں پڑھنا اور علمی باتیں سننا بھی واجب ہے۔ انسان کے لئے عالم بننا اس لئے واجب ہے تاکہ اس کی روح زندہ ہو سکے۔ اسلام کی یہ غنی اور قوی ثقافت حضرت امام حسین علیہ السلام کے نام کی برکت سے ایران کے اندر امام خمینی کے ہاتھوں زندہ ہوئی ہے۔ چنانچہ نبی اکرمؐ نے اس وقت فرمایا تھا:

أُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ بِالصِّينِ (11)

علم حاصل کرو چاہے تمہیں چین ہی جانا پڑے۔

جب کہ آج بہت سارے ایسے افراد جو علم سے شغف رکھتے ہیں چین سے ایران آرہے ہیں۔ پس آج اہل چین یہ کہہ رہے ہیں کہ اطلبوا العلم ولو بایران آج قم اور مشہد کے حوزوں میں چینی طلاب موجود ہیں اور یہ سب انقلاب اسلامی کا نتیجہ ہے۔ آج چینی طالب علم بھی پاکستانی طلاب کی مانند قم مشہد میں آکر تعلیم پا رہے ہیں۔ یہ کئی ہزار میل کا فاصلہ اسلامی انقلاب نے کس طرح سمیٹ دیا ہے۔ آیا یہ کسی کے ذہن میں بھی تھا کہ مشرق کے بعید ترین مقامات سے بھی ایک دن طلاب علوم ایران آکر تعلیم پائیں گے؟ یہ ایک علمی افادہ ہے جو انقلاب اسلامی کا نتیجہ ہے۔ یہ انقلاب ہی ہے جس نے چینی مسلمانوں کو علم کا تشنہ بنایا اور انہیں کھینچ کر قم اور مشہد تک لے آیا ہے۔

نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ علم حاصل کرنا واجب ہے، پس علمی محافل تشکیل دی جانی چاہئیں

علماء پر یہ محافل علمی تشکیل دیناواجب ہے اور لوگوں پر ان میں شرکت کرناواجب ہے۔ چونکہ جب لوگوں میں شعور ہی پیدا نہ ہو اس صورت میں علیؑ جیسا معصوم امام بھی اگر رہبر ہو تو بھی بنو امیہ غلبہ پا لیتے ہیں۔

جب خوارج کا خاتمہ کر دیا گیا تو بعض لوگوں نے امیر المومنین علیہ السلام سے عرض کی ،اچھا ہوا ان خشک مقدس مآبوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ آپؑ نے فرمایا:

كَلاَّ وَ اللهِ اِنَّهُمْ نُطَفٌ فِي اَصْلاَبِ الرِّجَالِ وَ قَرَارَاتِ النِّسَاءِ كُلَّمَا نَجَمَ مِنْهُمْ قَرْنٌ قُطِعَ حَتّٰى يَكُونَ آخِرُ هُمْ لُصُوصاً سَلاَّبِيْنَ(12)

ہر گز نہیں بلکہ ابھی وہ مردوں کے صلبوں اور عورتوں کے بطون میں ہیں جب بھی ان میں کوئی سر کردہ آدمی پیدا ہو گا کاٹ دیا جائے گا حتیٰ کہ ان کے بچے کھچے افراد چور اور ڈاکو بن کر رہ جائیں گے۔

گویا امیر المومنین علیہ السلام فرمارہے ہیں کہ جب بھی ان میں سے ایک گروہ کا خاتمہ ہو گا اس کی جگہ دوسرا گروہ پیدا ہو جائے گا تاآنکہ یہ لوگ مسلح ڈاکوؤں کے نام سے مشہور ہو جائیں گے چنانچہ منافقین بھی مسلح ڈاکو معروف تھے۔

اسی لئے سیاسی تحلیل و تجزیہ کرنا' آج کے مسائل سے آگاہ اور آشنا ہونا' کسی کو فریب نہ دینا اور خود بھی کسی سے دھوکہ نہ کھانا ، خود بھی جہالت سے نکلنا اور دوسروں کی جہالت سے غلط فائدہ نہ اٹھانا ، نماز کی طرح ہم سب پر واجب ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنین علیہ السلام مدینے سے نبی اکرمؐ کے روضہ مبارکہ کی ہم سائیگی کو ترک کر کے کوفہ کیوں منتقل ہوئے ؟(13) نیز اسی سے امام حسین علیہ السلام کے قبر نبیؐ کو چھوڑ کر کربلا جانے کا راز بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ آپؑ مدینے کو چھوڑ کر لوگوں کے درمیان گئے تاکہ انہیں آگاہ کر سکیں ورنہ امیر المومنین علیہ السلام کسی صورت میں بھی مدینہ چھوڑنے پر راضی نہ تھے۔ چونکہ مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کی حکومت کا مرکز تھا اور پھر مدینہ میں مسجد الحرام کے بعد روئے زمین پر سب سے زیادہ باعظمت وبافضیلت مسجد یعنی مسجد النبی موجود تھی۔ اس کے باوجود علی علیہ السلام نے مدینہ کیوں چھوڑا اور کوفہ کیوں گئے ؟

آخر کوفہ میں ایسی کونسی خصوصیت تھی جو مدینہ میں موجود نہیں تھی ؟اس کا جواب یہ ہے کہ علی علیہ السلام نے کوفہ کو اس لئے اپنا مرکز بنایا تاکہ شام کے نزدیک ہو کر اہل شام کو آگاہ کر سکیں شامی معاشرے کو اپنی طرف جذب کر کے بنو امیہ کی جڑیں کاٹ سکیں۔

اس کے مقابلے میں بنو امیہ نے بھی لوگوں کا رابطہ اسلام کے مرکز یعنی مدینہ سے کاٹ دیا۔ انہوں نے لوگوں سے کہا کہ مدینہ اور کوفہ کے بجائے روم کے ساتھ تعلقات بڑھالیں لہذا اس وقت جو شخص بھی شام سے مکہ کی طرف آتا اس کے ساتھ حکومتی جاسوس بھی ہوتے تھے۔ یہ نعرہ کہ مکہ کے اندر فقط طواف اور سعی انجام دینا چاہئے بنو امیہ سے ہی آل سعود کو وراثت میں ملا ہے۔ جس کی وجہ سے یہ لوگ آج بھی مشرکین سے اظہار برائت کو غیر معقول قرار دیتے ہیں۔ جب کہ پورے حجاز کا دارومدار امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ آل سعود کا استدلال یہ ہے کہ آج مکہ کے اندر مشرک موجود نہیں ہیں کہ ان سے بیزاری کا اظہار کیا جائے جب کہ اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے ہیں کہ پورے حجاز پر امریکہ کا قبضہ ہے۔ امریکہ کا سعودیہ کو اسلحہ فروخت کرنا اور اس کے بدلے وہاں تیل کے ذخائر پر ڈاکہ ڈالنا سب ایک آشکارا سازش ہے۔ چنانچہ آل سعود کے اسی سرمائے کے ذریعے ہی امریکی مشرکوں نے صدام کو ایران کے خلاف اکسایا اور لڑایا۔ اسی سرمائے کے سہارے مسجدیں ویران کی گئیں اور قرآن جلائے گئے۔ امریکیوں کی شہ پر آل سعود کے سرمائے سے ایرانی شہروں پر میزائل داغے گئے اور بم برسائے گئے۔ پس یہ کہنا درست ہے کہ حجاز میں امریکی مشرک موجود ہیں لہذا مکہ کے اندر ان سے برائت وبیزاری کا اظہار کرنا ضروری ہے۔

واقعہ کربلا کا راز ورمز خود حضرت سید الشہداء علیہ السلام نے بیان فرمایا ہے۔ ایک ماہر انسان جب کوئی دھات خریدنا چاہتا ہے تو پہلے اس کا ظاہر وباطن دیکھتا ہے اس کا آغاز و

انجام ملاحظہ کرتا ہے اس کے ٹھنڈا گرم ہونے کی صورت حال کو پرکھتا ہے اس کے بعد کہیں جاکر اسے انتخاب کرتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا "میں نے بھی موجودہ حالات کو آزمایا ہے انہیں اوپر نیچے کر کے تولا ہے ان کا آغاز و انجام دیکھا ہے کئی مرتبہ یہ سوچا ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تب جاکر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میرے پاس سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہیں ہے کہ اپنے پورے خاندان کو لیکر میدان میں اتر جاؤں تاکہ ان میں سے کچھ شہید ہو جائیں کچھ زخمی اور بعض اسیر ہو جائیں اور کچھ لاپتہ ہو جائیں تاکہ لوگوں پر اصل حقیقت کھل جائے"۔ چنانچہ آپؑ نے ایسے ہی کیا جس کے نتیجے میں لوگوں کو حقیقت سمجھ میں آگئی۔

مبادا کسی ذہن میں یہ خیال آئے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت امیر المومنین علیہ السلام کی نسبت زیادہ شجاع تھے بلکہ جناب شیخ کاشف الغطاء مرحوم تو کہتے ہیں (14) کہ علی علیہ السلام زیادہ شجاع تھے چونکہ امام حسین علیہ السلام کے ہاتھوں میں تلوار تھی اور جنگ کرتے ہوئے شہید ہوئے جب کہ شب ہجرت علی علیہ السلام جب رسول اللہؐ کے بستر مبارک پر سوئے تو آپ کے ہاتھ میں تلوار نہیں تھی اور دوسری طرف سے چالیس آدمی شمشیر بکف حملے کے لئے تیار تھے اس کے باوجود علیؑ سونے کے لئے تیار ہو گئے۔ لیکن جب حملہ آوروں کو معلوم ہوا کہ سونے والا نبی نہیں بلکہ علیؑ ہے تو مایوس ہو کر واپس لوٹ گئے۔ علی علیہ السلام کی شجاعت کے بارے میں یہ ایک نامور فقیہ اہل بیت کا اظہار خیال تھا جن کے بارے میں صاحب جواہر نے کہا ہے کہ میں نے جناب کاشف الغطاء جیسا زیرک فقیہ نہیں دیکھا۔

امیر المومنین علیہ السلام اپنے بعض ساتھیوں کے متعلق شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

يَا اَشْبَاهَ الرِّجَالِ وَلاَ رِجَالَ! حُلُومُ الاَ طْفَالِ وَ عُقُولُ رَبَّاتِ الْحِجَالِ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ لَمْ اَرَكُمْ وَ لَمْ اَعْرِ فْكُمْ مَعْرِفَةً- وَاللهِ- جَرَّتْ نَدَماً وَاَعْقَبَتْ

سَدُماً قَاتَلَکُمُ اللّٰہُ لَقَدُ مَلاَتُم قَلبِی قَیحاً وَ شَحَنتُم صَدرِی غَیظاً وَ جَرّعتُمُونِی نُغبَ التّھَامِ اَنفَاساً وَ اَفسَدتُم عَلَیّ رَاِیِی بِالعِصیَانِ وَ الخِذلَانِ حَتّٰی لَقَدُ قَالَ القُرَیشُ اِنّ ابنَ اَبِی طَالِبٍ رَجُلٌ شُجَاعٌ لٰکِن لاَعِلمَ لَہُ بِالحَربِ(15)

اے مرد نما نامردو! تمہاری عقلیں بچوں کی سی ہیں اور تمہاری سمجھ حجلہ نشین عورتوں کی مانند ہے کاش کہ نہ تم کو دیکھتا نہ تم سے جان پہچان ہوتی۔ ایسی شناسائی جو رنج واندوہ اور ندامت کا سبب بنی ہے۔ اللہ تمہیں مارے تم نے میرے دل کو پھوڑے کی طرح پکا دیا ہے اور میرے سینے کو غیظ و غضب سے چھلکا دیا ہے۔ تم نے مجھے غم و حزن کے گھونٹ پے در پے پلائے۔ نافرمانی کر کے میری تدبیر اور رائے کو تباہ کر دیا یہاں تک کہ قریش کہنے لگے کہ علیؑ ہے تو مرد شجاع لیکن جنگ کے طور طریقوں سے واقف نہیں۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ تم نے میری بات نہیں مانی جس کی وجہ سے قریش اور دوسرے لوگ میری جنگی تدبیر کے بارے میں شک وشبہہ کرنے لگے حالانکہ میں ابھی بیس سال کا بھی نہیں ہوا تھا تو جنگی تدبیر کا مالک تھا۔ جب بیس سال کی عمر سے بھی پہلے میں جنگ سے واقف تھا تو اب میری عمر ساٹھ سال کے قریب ہے۔ یعنی میں نے پورے چالیس سال تک جنگ کی کمان سنبھالے رکھی ہے۔

مزید چل کر آپ نے فرمایا۔

للّٰہ اَبُوھُم و ھَلُ احدٌ منھم اشد لھا مرساً اقدم فیھا مقاماً مِنّی ! لقد نہضت فِیھَا وَ مَا بلغتُ العِشرِینَ وَ وھَاَنَدا قَد ذَرفتُ عَلَی السّتِینَ وَلٰکِنُ لاَ رَاَیَ لِمَنُ لاَیُطَاعُ(16)

اللہ ان کا بھلا کرے کیا ان میں کوئی ہے جو مجھ سے زیادہ جنگ کی رغبت رکھنے والا اور میدان میں میرے جیسے کارنمایاں کیئے ہوئے ہو۔ میں تو ابھی بیس برس کا بھی نہ تھا کہ حرب وضرب کے لئے اٹھ کھڑا ہوا اور اب تو ساٹھ سے اوپر ہو گیا ہوں لیکن اس کی رائے ہی کیا جس کی بات نہ مانی جائے۔

وہ لوگ یہ تو نہیں کہہ سکتے تھے کہ علیؑ لشکر کے سالار نہیں ہیں کیونکہ آپؑ ہمیشہ سب سے آگے ہوتے لیکن وہ یہ کہہ سکتے تھے کہ علیؑ شجاع تو ضرور ہیں لیکن تدبیر جنگ سے آگاہ نہیں۔

شجاعت اور جنگ کی تدبیر میں فرق ہے۔ لہذا ممکن ہے بعض لوگ شجاع ہوں لیکن ضروری نہیں کہ جنگ کی تدبیر سے بھی آگاہ ہوں۔ چنانچہ آٹھ سالہ دفاع مقدس میں ہم نے مشاہدہ کیا کہ سب سے شجاع اور سب سے زیادہ مظلوم وہ فوجی دستہ ہوتا تھا جو راستہ کھولنے کے لئے دشمن کی بچھائی گئی بارودی سرنگوں کو ناکارہ بناتا تھا۔

ان لوگوں کے پاس اسلحہ نہیں ہوتا جب کہ دوسروں کے ہاتھ میں اسلحہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ لوگ بڑی دلیری کے ساتھ ان بارودی سرنگوں کو عبور کرتے اور اس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ اور پاؤں بھی اڑ جاتے۔ پورے لشکر میں اس قسم کے چند افراد ہی ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ لوگ بہت ہی شجاع اور نڈر ہوتے تھے لیکن یہ دلیل نہیں بنتی کہ ایک آدمی کو محض اس دستے کا رکن ہونے کی وجہ سے لشکر کا سالار بھی بنادیا جائے کیونکہ جنگی تدبیر کے لئے مہارت کی ضرورت ہے۔ چنانچہ بنوامیہ نے علی علیہ السلام پر جنگی بے تدبیری کی تہمت لگائی۔

علی علیہ السلام نے یہ کیوں فرمایا کہ مجھے افسوس ہونے لگا کہ اپنے بچوں کی موت کے منہ میں دھکیل دوں جب کہ امام حسین علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے دیکھا حالات کچھ ایسے ہیں کہ بچوں کو موت کی طرف روانہ کیا جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدلتے حالات کا تقاضا مختلف ہوتا ہے کبھی حالات ایسے ہوتے ہیں کہ امام حسن علیہ السلام کو زہر پینا پڑتا ہے

اور کبھی امام حسین علیہ السلام کو ایک عظیم قربانی دینا پڑتی ہے۔ اگرچہ امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی شجاعت میں کوئی فرق نہیں تھا اور نہ ہی کوئی فرق ثابت کر سکتا ہے۔ بلکہ امام حسنؑ بھی اگر امام حسینؑ کے زمانے میں ہوتے تو ان حالات میں وہی قدم اٹھاتے جو امام حسین علیہ السلام نے اٹھایا۔ لیکن معاویہ کی زندگی میں آپؑ صبر کرنے پر مجبور تھے۔ معاویہ کے بعد سازشیں کم ہوگئیں اور گھاگ سازشیوں کی جگہ خام خیال لوگ برسر اقتدار آگئے جنہیں رسوا کرنا آسان تھا۔

امام حسین علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بنو امیہ کے زہریلے تقدس کو پاک اور صحیح علوی تقدس سے ختم کردوں کیونکہ امویوں نے اپنے آپ کو ایک زہریلے تقدس کے پیچھے چھپا رکھا تھا لہذا کبھی نماز جمعہ بدھ کے دن بھی پڑھا دیتے تھے لیکن ان کے ظاہری تقدس کی وجہ سے لوگ ان پر اعتراض نہیں کرتے تھے۔ مشہور ہے کہ معاویہ نے جنگ صفین کی طرف جاتے ہوئے راستے میں بدھ کے دن نماز جمعہ ادا کی اور تمام ساتھیوں نے بھی اس کی اتباع کی۔ اسی وجہ سے معاویہ قائل تھا کہ لوگوں کو جاہل رہنا چاہئے۔ مخالفین میں سے اگر کوئی شخص شام میں آجاتا تو اسے لوگوں سے ملنے کی اجازت نہ ہوتی۔

ایسی صورتحال میں معاویہ نے علی علیہ السلام کو میدان سیاست میں شکست دینے کے لئے اور قرآن کو گوشہ نشین بنانے کے لئے آپ کو سازش سے بھرا ایک خط لکھا۔ جس میں اس نے آپؑ کو اسلام۔ قرآن۔ شہادت اور درجات شہداء کی طرف رغبت دلائی۔ علی علیہ السلام نے اس خط کے جواب میں لکھا مجھے تیرا خط مل گیا ہے جس میں تو نے اسلام۔ قرآن سعادت، شہادت اور درجات شہداء کے بارے میں بات کی ہے۔ تیرا ان سے کیا تعلق ہے اور تجھے ان کے بارے میں معلوم ہی کیا ہے۔ بلکہ تو تو سرے سے ان امور کے بارے میں کورا ہے۔

وَمَا اَنْتَ وَ الْفَاضِلَ وَ الْمَفْضُوْلَ وَالسَّائِسَ

وَالْمَسُوْسَ وَمَا لِلطَّلَقَاءِ وَ اَبْنَاءِ الطَّلَقَاءِ (17)

تم کہاں اور افضل و غیر افضل کی بحث کہاں۔ تم کہاں اور حاکم و رعایا کی گفتگو کہاں۔ آزاد کردہ مجرموں اور ان کی اولاد کو یہ حق کہاں سے پہنچا ہے۔

اس کے بعد آپؑ نے فرمایا۔

فَکُنْتَ فِیْ ذٰلِکَ کَنَاقِلِ التَّمرِاِلیٰ هَجَرَ اَوْ دَاعِی مُسَدِّدِهٖ اِلَی النِّضَالِ

تم ایسے ٹھہرے جیسے ہجر کی طرف کھجوریں لاد کر لے جانے والا یا اپنے استاد کو تیر اندازی کے مقابلے کی دعوت دینے والا ہو۔

''ہجر'' بحرین میں ایک علاقے کا نام جو کھجوروں کی وجہ سے مشہور ہے آپؑ کے معروف صحابی رشید ہجری اسی علاقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

علیؑ فرماتے ہیں کہ تم چند کھجوریں لیکر ہجر میں آئے ہو جو خود کھجوریں باہر بر آمد کرتا ہے۔یا پھر اس شخص کے مانند ہو جو اپنے استاد کو مقابلے کی دعوت دے۔ یعنی میں تیر اندازی کا استاد ہوں اور تم مجھے مقابلے کی دعوت دیتے ہو۔ آپ کی مراد یہ ہے کہ میں یہ چیزیں دوسروں کو سکھانے والا ہوں اور تم مجھے سکھارہے ہو! معلوم ہوتا ہے کہ تمہارے اندر سیاسی سوجھ بوجھ نہیں ہے۔ افضل یا غیر افضل کون ہے اس کا تم سے کیا تعلق ہے ؟ حاکم و رعیت کون ہے تمہیں ان باتوں سے کیا تعلق۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ میں اپنی زبان سے اپنے خاندان کے فضائل بیان کروں لیکن ان فضیلتوں کی جانب ایک اشارہ کئے دیتا ہوں تو سنو!

ہمارا خاندان شہادت و سعادت میں پہلے درجہ پر ہے۔ اے معاویہ تم یہ بات جان لو کہ ویسے تو جنگوں میں بہت سے لوگ مارے جاتے ہیں لیکن ہمارے شہداء کا مقام ہی اور ہے۔ شہید تو بہت ہوتے ہیں لیکن ہمارے چچا حمزہ جب شہید ہوئے تو سید الشہداء قرار پائے ۔کئی لوگ جنگ میں اپنے بازو کٹوا دیتے ہیں لیکن جب میرے بھائی جعفر نے اپنے دونوں بازو

جنگ کٹوائے تو طیار فی الجنتہ اور ذوالجناحین کا لقب پایا۔

فَاِنَّا صَنَائعُ رَبِّنَا وَالنَّاسُ بَعْدُ صَنَائعٌ لَنَا

ہم اپنے پروردگار کی مخلوق ہیں اور باقی لوگ ہمارے لئے خلق ہوئے ہیں۔

پس اے معاویہ ____ ! اپنے خاندان کا ذرا ہمارے خاندان سے تقابل تو کرو۔ تو معلوم ہو جائے گا کہ۔

وَ مِنَّا النَّبِیّ وَ مِنکُمُ الْمُکَذِّبُ وَ مِنَّا اَسَدُ اللّٰہِ وَ مِنکُمْ اَسَدُ الْاَحْلَافِ وَ مِنَّا سیدَا شَبَابِ اَھْلِ الْجَنّتِہِ وَ مِنکُمْ صِبیۃُ النَّارِ وَمِنَّا خَیْرُ نِسَاءِ الْعَالَمِیْنَ وَ مِنکُمْ حَمَّالَۃُ الْحَطَبِ (18)

ہم میں سے نبی ہیں اور تم میں جھٹلانے والا ہم میں سے اسد اللہ ہے اور تم میں قرآن کے خلاف قسمیں کھانے والا اسد الاحلاف (اس سے ابو سفیان کی طرف اشارہ ہے کہ اس نے لوگوں کو قرآن کے مقابلے کے لئے جمع کیا اور قسم کھائی کہ قرآن کو ختم کر کے رہیں گے ۔) ہمارے اولاد جنت کی سردار ہے جب کہ تمہاری اولاد آگ کا لقمہ ہے۔ ہماری عورتیں خیر نساء العالمین ہیں جب کہ تمہاری عورتیں حمالتہ الحطب ہیں۔

علی علیہ السلام نے اس طریقے سے معاویہ کا منہ بند کر دیا لیکن یہ صورت حال پھر بھی جاری رہی حتیٰ کہ حضرت امام حسن علیہ السلام شہید ہو گئے یعنی بنوامیہ کی تقدیس ویسی ہی جاری رہی بلکہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی جس کے نتیجے میں قرآن و عترت غریب اور گوشہ نشین ہو گئے۔ لہذا امام حسین علیہ السلام نے دیکھا کہ اب سوائے اس کے کوئی اور راستہ باقی نہیں ہے کہ اپنے خون سے قرآن و عترت کو احیاء کریں چنانچہ آپ نے کربلا کا ارادہ کیا اور مکہ سے کربلا کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں پر قرآن و عترت کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

اسی وجہ سے امام خمینی فرماتے ہیں کہ امیر المومنین علیہ السلام کے بعد تمام اسلام دشمن

عناصر نے مل کر قرآن وعترت کولوگوں کی زندگی سے دور کرنے کے لئے پوری کوشش کی چنانچہ اس کے مقابلے میں قرآن وعترت کو دوبارہ لوگوں کی زندگی میں واپس لانے کے لئے ہمیں بھی کوشش کرنی چاہئے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہم خود قرآن کو اچھے طریقے سے سمجھیں اور پھر حاکم اسلامی بھی ایک عالم آگاہ اور قرآن شناس انسان کو قرار دیں اور یہ کہ قرآن کو باہم سمجھنے کی کوشش کریں چونکہ جب تک ہم قرآن کو باہم مل کر نہیں سمجھیں گے اسلامی اخوت ہمارے درمیان غیر ممکن ہو جائے گی خداوند تعالیٰ نے ہمیں فقط اتحاد اور اخوت کا حکم نہیں دیابلکہ یہ بھی فرمایا کہ قرآن باہم مل کر سمجھو۔

وَاَعۡتَصِمُوا بَحِبۡلِ اللّٰه جَمِيۡعاً وَ لاَ تَفَرَّقُوۡا(19)

اللہ کی رسی کو سب مل کر تھامو اور تفرقہ نہ کرو۔

اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب مسلمان ہو جاؤ اور سب قرآن پڑھوبلکہ مراد یہ ہے کہ سب مل کر قرآن سمجھو اور سب مل کر مسلمان بنو کیونکہ اگر ہم سب مل کر قرآن کو سمجھ جائیں تو ایک دوسرے کو برداشت بھی کرلیں گے اور اسلامی مسائل کو باہم سمجھنے سے ایک دوسرے کو تحمل کرنے کے قابل ہو جائیں گے نیز فکری اور نظری اختلاف کو برداشت کرنے کی صلاحیت ہمارے اندر پیدا ہو جائے گی۔ جیساکہ مل کر عزاداری کرنا اور بات ہے اور الگ الگ عزاداری کرنا اور مطلب ہے۔ باہم اور مل کر عزاداری کرنا ہی دشمن کے لئے ناقابل برداشت ہے اور اسلام وانقلاب کے داخلی اور خارجی دشمنوں کی ناامیدی اور مایوسی کا باعث ہے۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیں یہ دستور نہیں دیا ہے کہ ہر ایک الگ الگ احکام الٰہی پر عمل کرے بلکہ فرمایا کہ ایک ساتھ نماز پڑھو باہم مل کر روزہ رکھو اور ایک دوسرے کے ساتھ مل کر قرآن پڑھو۔ جن لوگوں نے اپنے آپ کو اس خیال سے فریب دے رکھا ہے کہ گھر کے اندر تنہائی میں نماز پڑھنے اور عزاداری کرنے میں قلبی توجہ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ حقیقت میں شیطان کی ولایت کے تحت انہیں معلوم نہیں ہے کہ ایک عرصے سے شیطان کی عبادت کرتے رہے ہیں۔ امام حسینؑ کے عزاداروں کے ننگے پاؤں ان دقیانوسی اور

رجعت پسندوں کی داغدار پیشانیوں سے کہیں زیادہ بالاتر ہیں چونکہ انہیں خبر نہیں ہے کہ شیطان کی عبادت کررہے ہیں اس لئے کہ ہمیں یہ حکم نہیں ملا ہے کہ الگ الگ عبادت کریں۔ پیغمبر اکرمؐ نے کیوں فرمایا کہ جو گھر میں نماز پڑھے گا میں اس کے گھر کو آگ لگادوں گا-(20)

البتہ بعض لوگوں نے نبی اکرمؐ کی اس حدیث سے غلط فائدہ اٹھایا ہے۔ انہوں نے ملاحظہ کیا کہ علی علیہ السلام ایک بنیادی اور حساس کام میں مشغول ہیں تو رسول اللہ کے کلام کو دستاویز بنا کر علیؑ کے گھر کو آگ لگانے کی دھمکی دی اور بہانہ یہ بنایا کہ علی مسجد میں نہیں آتے جب کہ اس وقت علی علیہ السلام مسجد جانے سے معذور تھے- پس کوئی بھی یہ گمان نہ کرے کہ ہمارا گھروں میں نماز پڑھنا ایک اچھا کام ہے چونکہ گھر میں نماز پڑھنا مسجد میں پڑھنے کی طرح نہیں ہے بلکہ ہمیں مساجد کو آباد کرنا چاہئے ہمارے پاس جو کچھ بھی ہے مساجد کے طفیل ہے- خدانخواستہ اگر کسی خاندان میں کوئی بچہ فساد میں مبتلا ہوگیا تو پورا خاندن ایک جان لیوا درد میں مبتلا ہو جائے گا پس بہتر یہی ہے کہ اس تربیت گاہ یعنی مسجد سے اپنا رابطہ محکم واستوار رکھیں۔ قرآن کو ایک ساتھ سمجھنے کا نتیجہ ایک دوسرے کو برداشت کرنا ہے جس کی واضح مثال حوزہ علمیہ یا دیگر علمی مراکز ہیں جن میں کئی ایک فقہاء ہیں اور ایک ہی روایت یا حدیث سے مختلف مطالب سمجھتے ہیں جس کی بناء پر مختلف فتاوٰی بھی دیتے ہیں لیکن سب کے سب ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو عادل سمجھتے اور ایک دوسرے کے پیچھے نماز بھی پڑھتے ہیں اور دوسروں کے اعمال کو بھی باطل نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپس میں تبادلہ افکار کرتے ہیں' ایک ساتھ سمجھتے ہیں اور ایک ساتھ سمجھنے کا نتیجہ یہی ہے۔ جب کہ الگ الگ سمجھنے کا نتیجہ اختلاف' نزاع ، شکست اور کمزوری ہے جس کی وجہ سے ساری شان و شوکت جاتی رہتی ہے- چنانچہ قرآن مجید کا فرمان ہے-

لَا تَنَازَعُوا فَتَفْشَلُوا وَ تَذْهَبَ رِيحُكُمْ(21)

آپس میں نزاع نہ کرو ورنہ کمزور ہو کر شکست کھا جاؤ گے اور تمہاری ساری عزت و شوکت جاتی رہے گی۔

پس قرآنی دستور کے مطابق ہمیں اس کو ایک ساتھ سمجھنا چاہئے باہم نماز پڑھیں اور مل کر عزاداری کریں اور اس کا نتیجہ وحدت و اخوت کی صورت میں ظاہر ہو گا۔

امام حسین علیہ السلام کے لئے سبھی گریہ کرتے ہیں حتیٰ کہ امیر المومنین علیہ السلام نے بھی فرمایا۔

لَا یَوْمُ کَیَوْمِكَ یَا اُبَا عَبْدَاللّٰه (22)

اے اباعبداللہ آپ کے دن کی طرح کوئی دن نہیں ہے۔

جب امام حسین علیہ السلام اپنے برادر بزرگوار حضرت امام حسن علیہ السلام کے مسموم طشت کے پاس جا کر بیٹھے تو امام حسن علیہ السلام نے بھی یہی جملہ بیان فرمایا۔

لَا یَوْمُ کَیَوْمِكَ یَا اُبَا عَبْدَاللّٰه

جب نبی اکرمؐ کی رحلت ہوئی تو علی علیہ السلام نے تنہا آپ کو غسل دیا اور سوائے ملائکہ کے کوئی بھی اس میں شریک نہ تھا۔ خود امیر المومنین فرماتے ہیں کہ غسل کے تمام مراحل میں ملائکہ نے میرا ساتھ دیا۔ فرشتوں کا ایک گروہ آتا اور ایک گروہ جاتا تھا۔(23) جب علی علیہ السلام کے بدن مطہر کو غسل دینے کی باری آئی تو امام حسین علیہ السلام کی معیت میں امام حسن علیہ السلام نے آپ کو غسل دیا۔ جب حسن علیہ السلام کو غسل دینے کا وقت آیا تو امام حسین علیہ السلام نے حضرت عباسؑ کی مدد سے آپ کو غسل دیا۔

چونکہ معصوم کو صرف معصوم ہی غسل دے سکتا ہے (24) تمام معصومینؑ کا غسل و کفن، نماز جنازہ اور دفن جلال و شکوہ کے ساتھ انجام پایا۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کے بارے میں سب کا یہ کہنا بجا ہے کہ

لَا یَوْمُ کَیَوْمِكَ یَا اُبَا عَبْدَاللّٰه

خدا جانتا ہے کہ عاشور کے دن عصر کے وقت امامؑ حسین علیہ السلام کے خاندان پر کیا

بیتی ہوگی۔ امام حسین علیہ السلام نے شب عاشور حکم دیا کہ خیموں کو نزدیک نزدیک نصب کیا جائے ان کے اردگرد خندق کھود دی جائے اور فرات کے کنارے سے سرکنڈوں کا ایندھن لاکر خندق میں ڈال کر آگ لگادی (25) تاکہ دشمن عقب سے خیموں پر حملہ نہ کرسکے۔ چونکہ امام علیہ السلام جانتے تھے کہ یہ دشمن بہت ہی کمینہ صفت ہیں اور خیام پر ضرور حملہ کریں گے۔ امام علیہ السلام کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے خندق کھود کر اس میں آگ لگادی گئی۔ فقط تنگ سا راستہ چھوڑ دیا گیا جس سے اصحاب آمدورفت کرتے تھے اس کے علاوہ اردگرد خندق تھی۔

عصر عاشور جب دین وانسانیت کے ان دشمنوں نے خیموں کو لوٹنے کے لئے حملہ کیا تو اسی تنگ راستے سے اندر داخل ہوئے اب امام حسین علیہ کے چھوٹے چھوٹے بچوں نے ایک تنگ راستے سے کیسے جان بچائی ہوگی یہ خدا جانتا ہے۔ کیونکہ خیموں کی پشت پر اگر راستہ کھلا ہوتا تو آسانی سے جان بچا لیتے لیکن سوائے اس سامنے کے تنگ راستے کے کوئی اور راہ موجود ہی نہ تھی۔ حضرت زینب سلام اللہ علیہا نے بھی امام سجاد علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا حکم ہے؟

آپؑ نے فرمایا **عَلَیکُنّ بالفرار** یعنی آپ پر باہر نکلنا واجب ہے (26) لیکن کونسے راستے سے باہر نکلیں اور جان بچائیں؟

اسی وجہ سے حضرت امام عصر (عج) فرماتے ہیں کہ اگر ایسی مصیبت پر آنسوؤں کے بدلے خون بہاؤں تو حق بجانب ہوں (27)۔ صبح وشام روتا رہوں تو بھی حق ہے۔ بیبیوں کے کان سے اسی وقت گوشوارے نکالے گئے۔

لہذا حضرت زینبؑ نے حکم دیا کہ تمام زیورات اتار دیئے جائیں تاکہ یہ ظالم آپ کے نزدیک نہ آئیں۔ یہ گھڑی حضرت زینبؑ پہ بہت سخت گزری، حضرت زینبؑ اتنی مقدس شخصیت کہ وقت کے امام حضرت امام حسین علیہ السلام آخری وداع میں ان سے تقاضا کرتے ہیں کہ

لَا تَنسَی فِی نَافِلۃِ اللَّیل(28)

بہن مجھے نماز تہجد میں بھول نہ جانا۔

خدا جانتا ہے یہ کیا ذات ہے!

تمام ذمہ داری حضرت زینبؑ کے کندھوں پر ہے چونکہ امام سجاد علیہ السلام بیمار تھے اور بظاہر ذمہ دار حضرت زینبؑ تھیں۔ اگر صحتمند ہوتے تو آپؑ بھی شہید ہو جاتے۔ حضرت زینب اپنے بھائی کے آخری وداع کے وقت زبان حال سے یہ فرما رہی تھیں "آج کی رات سے میں بھی ہوں اور کاروان۔

شام غریباں کو آسمان کی طرف نگاہ کر کے فرماتی ہیں:

اے چاند آج کی رات چاندنی چھپالو تا کہ کاروان راہ گم کر جائے۔

خیموں کے سامنے کا راستہ نہایت تنگ تھا لہذا بچوں کے نکلنے کی جگہ نہیں تھی۔ کچھ بچے تو شام غریباں کی وحشت و تنہائی کے خوف سے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ کچھ ہی دیر میں غارتگروں نے خیام کو لوٹ لیا۔ خیام جلنے کے بعد بیبیوں نے بچوں کے لئے آدھا جلا ہوا خیمہ نصب کیا جس کی نگہبانی حضرت زینبؑ نے شروع کی۔ ایک رات بیبیوں نے دیکھا حضرت زینبؑ بیٹھ کر نماز تہجد پڑھ رہی ہیں انہوں نے کہا اے دختر علیؑ تہجد کا ثواب کھڑے ہو کر پڑھنے میں زیادہ ہے۔ حضرت زینبؑ نے فرمایا مجھے معلوم ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے لیکن میری ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے۔

گیارہویں فصل

نفسانی فضائل اور اخلاقی صفات فقط حماسہ و شجاعت کے ساتھ ہی سازگار نہیں بلکہ جنگ ود فاع کے ساتھ بھی ہم آہنگ ہیں۔

گزشتہ فصول میں یہ مطلب چند طریقوں سے ثابت کیا گیا ہے۔ جہاد ودفاع سخت ہونے کی وجہ سے ممکن ہے انسانی کی طبیعت پر گراں گزرے لہذا اسے بشری طبیعت کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے اور انسان کے اندر جہاد کی طرف رجحان پیدا کرنے کے لئے لازمی محرکات کی ضرورت ہے۔

وہ افراد جن کے مد نظر جہاد ، دفاع اور رزم کا دنیاوی پہلو ہوتا ہے وہ مجاہدین کو آب و خاک پر فتح پانے کی ترغیب دیتے ہیں اور جنگ کا نتیجہ وطن کی حفاظت قرار دیتے ہیں۔ کبھی انعام واکرام کا وعدہ کرتے ہیں اور بعض اوقات جنگجو کو خوف دلایا جاتا ہے کہ اگر جنگ سے پہلو تہی کی تو تمہارا ملک ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ یا تمہاری اولاد تم سے چھین لی جائے گی۔ یہ وعدہ و وعید سب اس لئے ہوتے ہیں کہ جنگ و دفاع کا رنگ عرفانی نہیں ہوتا لہذا ان وعدوں میں بھی عرفانی شجاعت کا رنگ موجود نہیں ہوتا۔ لیکن ائمہ ہدی علیہم السلام کے نزدیک جنگ و جہاد، عرفان و زہد کے ساتھ مخلوط ہے چنانچہ ان حضرات کے جنگی پیغامات کے مضامین میں نہ تو مادی چیزوں کے حصول کا وعدہ ہے نہ ہی ان کے چھٹ جانے کا ڈراوا ہے اور اگر ائمہ ہدیٰ کے کلام میں کسی جگہ دینوی وعدہ ووعید ہو تو اس پر بھی غیر مادی رنگ چڑھا ہوا ہوگا۔ لہذا امیر المومنین علیہ السلام جب مجاہدین کو محاذ جنگ کے لئے روانہ کرتے

تو اپنے خطبے میں انہیں زہد و عرفان کی طرف دعوت دیتے اور دنیا سے دوری اور وصال خدا کا شوق ان کے دلوں میں بڑھا دیتے۔ ابتداً جنگجوؤں کے لئے ایک توحیدی خطبہ بیان فرماتے پھر ایک عارفانہ اور خطاب کلام ذکر کرتے۔ خطبہ کے اول میں بارگاہ خدا میں جو حمد و ثناء کرتے وہ سراسر عرفان پر مبنی ہوتی تھی اور حاضرین کے لئے اس کے بعد جو مطالب بیان فرماتے وہ سارے کا سارا زہد ہوتا اور یہ بتاتے کہ عرفان و زہد جنگ و شجاعت سے الگ نہیں ہیں۔

آپ مجاہدین کو زمینوں کی فتوحات اور مال غنیمت اکھٹا کرنے کے لئے روانہ نہیں کیا کرتے تھے اور نہ ہی زمینوں کی حفاظت کے لئے جنگ کا دستور دیتے بلکہ آپؑ فرماتے تھے کہ تم نے جنگ کی تو وصال حاصل کرو گے ۔ آپؑ کے اکثر فرامین زاہدانہ قسم کے ہوتے تھے۔ مثلاً جب مختلف علاقوں کے والیوں یا محاذ جنگ پر لڑنے والے مجاہدین کے نام خط لکھتے تو اس میں انہیں مالی جہاد کی ترغیب دلاتے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے:

مَن زَهَدَ فِی الدُنیاَ استَهانَ بِالمصِیبَات (1)

جو دنیا میں زہد اختیار کرتا ہے اس کے لئے مصائب آسان ہو جاتے ہیں۔

دنیوی مصائب کی سختی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے مادی محبوب کو ہاتھ سے کھو بیٹھتا ہے۔

جب کہ زہد انسان کو دنیا کی محبت سے آزاد کر دیتا ہے۔

حضرت علی علیہ السلام زہد کی تفسیروں میں بیان فرماتے ہیں کہ اگر تم نے متاع دنیا سے دل لگا لیا تو در حقیقت ایسی چیز کی محبت میں گرفتار ہو گئے جس کو تم سے کوئی محبت نہیں ہے بلکہ وہ تمہیں رسوا کر دے گی۔ پس ایسی چیز سے کیوں محبت کرتے ہو جو پوری قوت سے تمہیں دھتکار رہی ہے۔

زهدك فی راغب فیك نقصان حظ و رغبتك فی زاهد فیك ذل نفس(2)

جو تمہاری طرف راغب ہو اس سے زہد اختیار کرنے میں تمہارا ز نقصان ہے اور جو تمہارے ساتھ رغبت نہ رکھتا ہو اس کی طرف راغب ہونے میں تمہاری رسوائی ہے۔

یعنی تم عزیز ہو اپنے آپ کو فرومایہ اور ذلیل نہ بناؤ۔ فرشتے تمہاری طرف راغب ہیں اور بہشت تمہاری منتظر ہے۔ انبیاء اور اولیاء تمہاری جانب نظریں لگائے ہوئے ہیں پس تم کیوں ان کی جانب مائل نہیں ہوتے ؟ جب کہ انبیاء' اولیاء' شہداء' صالحین' صدیقین' بہشت اور جنت کی لقاء کی نسبت تمہاری بے رغبتی تمہاری محرومیت کا سبب ہے۔ یعنی جو تمہاری طرف راغب ہے تم اس کی طرف رغبت نہیں رکھتے لہذا محروم ہو اور اس کے بدلے دنیا اپنی پوری طاقت سے تمہیں رسوا کررہی ہے پھر بھی تم نے اس سے دل لگایا ہوا ہے -اور یہی تمہاری فرومائیگی کا سبب ہے۔ دنیا کسی کو بھی آرام سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ لہذا اس سے پہلے کہ وہ تمہیں ترک کردے تم اسے ترک کردو۔

علی علیہ السلام نے یہ دستورات حکومت اسلامی کے والیان اور محاذ جنگ پر لڑنے والے مجاہدین کے لئے صادر فرمائے ہیں۔ (3)

دنیا شیطان کے ہاتھ میں ایک بہترین وسیلہ ہے البتہ دنیا سے مراد یہ زمین و آسمان نہیں ہیں بلکہ یہ تو اللہ کی آیات ہیں۔ آب و خاک یا کوہ و صحراء میں سے کوئی چیز بری نہیں ہے بلکہ یہ تو اللہ کی مخلوق ہیں اور نہایت اچھی چیزیں ہیں بلکہ آیات الٰہی ہیں۔ دنیا ان غیر حقیقی چیزوں کا نام ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہے۔ دنیا یہ ہے کہ کوئی کہے سب لوگ میرا احترام کرتے ہیں۔ میرا اتنا مال و منال ہے۔ میری یہ حیثیت ہے۔ میں صدر نشین ہوں۔ میرے دستخط قبول کئے جاتے ہیں۔ میں لوگوں میں مقبول ہوں اور یہ سب کچھ محض خیالات ہیں اور انہی کا نام دنیا ہے۔ ورنہ زمین تو دنیا نہیں ہے لہذا اگر کوئی زمین سے محبت کرے تاکہ اس میں کھیتی باڑی کرکے لوگوں کی معاشرتی ضرورتیں پوری کرے تو یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ لیکن یہ تصور کرنا کہ یہ مال میرا ہے' میں فلاں شخص سے بہتر ہوں ، میں دوسرے سے زیادہ جانتا ہوں ، میں زیادہ مالدار ہوں وغیرہ یہ پلید اور دنیاوی وسوسے

ہیں دنیا ایک معدوم چیز نہیں ہے بلکہ بے اعتباری اور غیر حقیقی عناوین کا نام دنیا ہے اور یہی شیطان کا دام ہیں۔ شیطان قوی بھی ہے اور غوی بھی یعنی طاقتور بھی ہے اور گمراہ کن بھی ہے لہذا استعاذہ کے مقام پر یوں کہنا چاہئے:

اعوذ باللّٰه القوی من الشیطان الغوی

میں گمراہ کرنے والے شیطان سے قوت والے اللہ کی بارگاہ میں پناہ مانگتا ہوں۔

شیطان اسی طرح دام کے ذریعے انسان کو رسوا کرتا ہے جس طرح سے مچھلی کا شکاری جال پھینک کر مچھلی کی زندگی اس سے چھین لیتا ہے۔ دنیا ایسا دام نہیں ہے کہ انسان جب بھی چاہے اس سے آزاد ہو جائے بلکہ دنیا تو ایسا دام ہے کہ جب تک پھنسے ہوئے انسان کو ذلیل و رسوا نہ کردے، اسے بے آبرو کر کے (کوڑا کرکٹ کے مثل) نہ بنادے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

خداوند تعالیٰ نے انسان کو خبردار کیا ہے پس فرمایا شیطان کو تمہارے اموال سے کوئی سروکار نہیں ہے وہ تمہیں بے گھر نہیں بنانا چاہتا بلکہ وہ صرف تمہاری عزت و آبرو ختم کرنا چاہتا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دیکھو شیطان نے آدم و حواء کے ساتھ کیا کیا۔ پس تم بھی اے بنی آدم ہوشیار رہو مبادا تمہیں بھی بے آبرو کردے جس طرح اس نے آدم و حواء کو بے آبرو کرنے کی کوشش کی تھی (4) وہ فقط انسان کی حیثیت و عزت کو خاک میں ملانا چاہتا ہے اور جب ایک مرتبہ انسان کی عزت و حیثیت ختم ہو جاتی ہے پھر بے آبرو انسان کسی کام کا نہیں رہتا بلکہ کوڑے اور کچرے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

شیطان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ انسان کے کمزور پہلو تلاش کرے جب اسے انسان کے اندر کوئی کمزوری نظر آجاتی ہے اور اسے معلوم ہو جاتا ہے اس کے اندر ایک برا میلان پایا جاتا ہے لیکن ابھی پنہاں ہے تو اسے ابھارتا ہے اور جب انسان کا اندرونی غلط میلان ظاہر ہو جائے تو وہ بے آبرو ہو جاتا ہے اور ایک بے آبرو انسان کی معاشرے میں کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ دنیا کے متعلق جتنی تفصیل علی علیہ السلام نے بیان کی ہے اتنی کسی نے بھی بیان نہیں

کی۔ البتہ امت اسلامی کے لئے نبی اکرم ؐ کی ذات گرامی معلم کل ہے لہذا آپ کی ذات مقدس کا مقام محفوظ ہے۔ لیکن آپؐ کے بعد سب سے زیادہ علی علیہ السلام نے دنیا کا تعارف کروایا ہے لہذا امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ تم نے ایسی چیز سے دل لگا رکھا ہے جو اپنی پوری طاقت کے ساتھ تمہیں بے آبرو کرنا چاہتی ہے اور یہ ذلت و فرومائیگی ہے۔

ایک دوسرے مقام پر آپؑ نے فرمایا۔

اَیّھَا النّاس' مَتَاعُ الدُنَیا 'حطَام' مِو'بیء فُتَجنّبوا مَرعاہُ قُلعَتھَا احَظیٰ منِ طمَا نِینتَھاوَبلغَتھا اَذ کیَ منِ ثرَوَتھِا(5)

اے لوگو دنیا کا ساز و سامان سوکھا سڑا بھوسا ہے جو وبا پیدا کرنے والا ہے لہذا اس چراگاہ سے دور رہو کہ جس سے نکل جانا اس کے اندر اطمینان کے ساتھ ٹھہرے رہنے سے بہتر ہے اور اس سے بقدر ضرورت لے لینا اس کی ثروت سے زیادہ بابرکت ہے۔

یعنی تم نے اپنی آنکھوں پر سبز عینک چڑھا رکھی ہے لہٰذا دنیا کو سر سبز دیکھتے ہو۔ اپنی آنکھوں سے یہ سبز عینک اتار دو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا سر سبز و شاداب نہیں ہے بلکہ حطام ہے اور حطام اس بھوسے کو کہتے ہیں جو گندم کو کاٹنے کے بعد خشک ہونے سے حاصل ہوتا ہے۔ خشک ہونے کے بعد جب وہ کاہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اسے حطام کہتے ہیں چونکہ معمولی حرکت سے پس جاتا ہے۔ پس دنیا سبز نہیں بلکہ یہ عینک سبز ہے ورنہ دنیا ہمیشہ خزاں ہے۔ البتہ موسم خزاں میں کچھ ایسے مویشی ہوتے ہیں جو اس بھوسے کو چارہ کے طور پر چرتے ہیں لیکن یہ دنیا ح لی کہ خزاں کے چارے کے طور پر بھی کام نہیں آتی اور نہ صرف چارہ نہیں ہے بلکہ وباء کا باعث بھی ہے لہذا اسے ہاتھ نہ لگاؤ ورنہ وباء میں مبتلاء ہو جاؤ گے۔ اگر چرنا چاہو تو کسی اور چراگاہ میں جا کر چرو ورنہ یہ ایک وباء آور چراگاہ ہے۔ پس پہلے تو یہ سر سبز نہیں بلکہ خشک و زرد ہے۔ دوم یہ مضبوط نہیں بلکہ پسی ہوئی ہے سوم یہ وباء خیز ہے پس اسکے باوجود جو دنیا سے دل لگالے وہ دیوانہ ہے۔

جو شخص ان کلمات کو سمجھ جائے اور ائمہ ہدیٰ و عترت طاہرہ کی ہدایت پر کاربند ہو وہ

صبح و شام اسی کوشش میں مصروف رہے گا کہ جس طرح سے ہو سکے اپنی اور معاشرے کی عزت محفوظ رکھے وہ ایسے کام کرے گا جن میں پیداوار ہو اور معاشرے کے استحکام کے لئے مفید ہوں۔ ایسا کرنا دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے۔ البتہ اس نیت سے انجام دے کہ اپنے لئے یا اپنے ورثاء کے لئے ثروت کمائے بلکہ مہنگائی کا خاتمہ کرنے کے لئے مسلمین کی فلاح و خوشحالی اور حکومت اسلامی کے ساتھ اقتصادی تعاون کی نیت سے انجام دے ورنہ اگر کسی اور نیت سے انجام دے گا تو یہ وہی وبا ہو گی جسکے آثار بعد میں نمایاں ہوں گے۔ علی علیہ السلام نے دنیا کو خطاب کر کے فرمایا:

وَاللهِ لَو کُنتِ شَخصاً مَرئیاً و قَالباً حِسِّیاً لَاقمَتُ علیك حُدُودَ اللّهِ فِی عَبادِ عزرَتهُم بِالاَ مَانِیّ (6)

خدا کی قسم اگر تو دکھائی دینے والے جسم اور محسوس ہونے والے ڈھانچے میں ہوتی تو میں تجھ پر اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں جاری کرتا کیونکہ تو نے بندوں کو امیدیں دلا دلا کر بہکایا ہے۔

امیر المومنین اس کلام میں فرماتے ہیں کہ اگر تجھے دیکھوں تو کوڑے ماروں گا لیکن آپ نے دیکھے بغیر بھی دنیا پر بہت کوڑے برسائے ہیں بلکہ علیؑ نے دنیا کو بالکل رسوا کر کے رکھ دیا ہے۔ فرمایا دنیا ایک وباء خیز چراگاہ ہے جس کو کوئی حیوان نہیں چاہتا۔ لہذا جو بھی دنیا سے دل لگالے وہ حیوان سے بھی زیادہ پست ہو جاتا ہے۔ انسان ایک عجیب موجود ہے ایک طرف سے اگر رک جائے تو حرکت ہی نہیں کرتا اور کبھی گرنا شروع کر دے تو حیوانیت کے درجے میں جا پہنچتا ہے اور کبھی تو حیوان سے بھی زیادہ پست تر ہو جاتا ہے۔

کَالاَ انعَامِ بَل هُم اَضَل (7)

حیوانوں کی مانند بلکہ اس سے بھی پست تر۔

انسان جب حیوان سے بھی نیچے گر جائے تو نباتات کی حد میں جا پہنچتا ہے اور کبھی تو نباتات سے بھی گر کر جمادات کی حد میں چلا جاتا ہے اور اس وقت اس کی حالت یہ ہوتی ہے

کہ نصیحت کی باتیں بھی سنتا رہے تو بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور پھر اس مرحلے سے بھی سقوط کر کے نیچے جا پہنچتا ہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے چونکہ پتھر سے تو کبھی پانی کا چشمہ نکل آتا ہے لیکن سخت دل میں اس کا امکان نہیں ہوتا۔ چنانچہ قرآن کا ارشاد ہے:

هِیَ کَالۡحِجَارَةِ اَوۡ اَشَدُّ قَسۡوَةً(8)

وہ دل پتھر کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت ہیں۔

جس طرح انسان کے سقوط اور تنزل کے کئے درکات ہیں ایسے ہی اس کی ترقی کے کئی درجات ہیں۔ سقوط کے درکات یہ ہیں۔

ا۔ جمود ۲۔ حیوانیت ۳۔ پست تراز حیوانیت ۴۔ مرحلہ نباتیت ۵۔ مرحلہ حجریت ۶۔ حجریت سے بھی زیادہ سخت دل ہونا۔

اس کے برعکس انسان درجات طے کرتے ہوئے بھی بعض اوقات ایسے مقامات تک جا پہنچتا ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ذات اور ملائکہ اس پر درود بھیجتے ہیں۔

هُوَالَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَ مَلٰٓئِکَتُهٗ لِیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ(9)

خدا اور ملائکہ تم پر درود بھیجتے ہیں تاکہ تمہیں ظلمات سے نکال کر نور میں لے آئیں۔ اور یہ کوئی معمولی مقام نہیں ہے کہ فرشتے جہاں پر صلوٰۃ پڑھیں۔ پس انسان کے دو پہلو ہیں اور دونوں بہت ہی وسیع ہیں یہی مطالب علی علیہ السلام نے مجاہدین کے لئے بیان فرمائے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ وہ شخص لڑتا ہے

علی علیہ السلام کے اکثر خطبات ایسے ہی ہیں ان میں مادی وعدے اور وعید نہیں ہیں آپؑ نے زمین اور خاک کی حفاظت کے بجائے عظمت مقاصد جہاد کے لئے ذکر فرمائے۔ آپ کے بیان سے یہ بھی استفادہ ہوا کہ دنیا ایک مشکلات سے پُر چراگاہ ہے۔ جو اس کے نزدیک ہوتا ہے وہ اس کی قباحت کو سمجھ نہیں سکتا چونکہ دنیا کی نزدیکی اس کی قباحت کو سمجھنے کی راہ میں مانع ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نزدیکی حس شامہ کو بند کر دیتی ہے البتہ تھوڑا

دور ہٹ کر اس کی قباحت کا نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

اِزا هَد فِی الدُّنیاَ یُبصِرُكَ عوَرا ِتهاَ (10)

دنیا سے دوری اختیار کرنا تمہیں اس کی برائیوں سے آشنا کر دے گا۔

اس کے بعد علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اولیاء الٰہی کی گویا ایک اور آنکھ ہوتی ہے اور ایک اور کان ہوتا ہے۔

کاَنَّھمُ یَرَونَ مالاَ یرَیٰ الناَسُ وَ یسمَعُونَ مالاَ یسمَعُونَ (11)

گویا یہ اسے دیکھ لیتے ہیں جو دوسروں کو دکھائی نہیں دیتا اور وہ بات سن لیتے ہیں جو دوسروں کو سنائی نہیں دیتی۔

گویا اولیاء الٰہی وہ سب کچھ دیکھتے اور سنتے ہیں جو دوسرے نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں لیکن اس سے بالاتر مرحلے میں گویا ختم ہو جاتا ہے اور بات تحقیق پر آجاتی ہے کہ تحقیقاً اولیاء خدا جو کچھ سنتے اور دیکھتے ہیں وہ دوسروں کے لئے ممکن نہیں ہے۔ لہذا ان اولیاء نے شب عاشور گویا وہ سب کچھ دیکھا اور سنا پس جب امتحان میں پورے اترے تو امام حسین علیہ السلام نے ہر ایک کو اس کا مقام حقیقتاً دکھادیا (12) پس پہلے انسان کوشش کے ذریعے گویا کے مرحلے میں پہنچتا ہے تب اسے تحقیق کا مرحلہ عطا ہوتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے ایک اور مقام پر دنیا کی توصیف میں فرمایا کہ اگر دنیا کی قدر و قیمت معلوم کرنا چاہتے ہو تو جان لو کہ دنیا اس کائنات میں جوتے اتارنے کی جگہ ہے جیسے صف النّعال کہتے ہیں جیسے ہر کمرے یا گھر کے باہر جوتا اتارنے کے لئے ایک مخصوص جگہ ہوتی ہے اسی طرح دنیا اس کائنات میں ہے۔

پس جو بھی دنیا کی ذلت اور پستی سے بالاتر ہو جائے وہ ہرگز کسی مقام میں بھی خدا کی بارگاہ میں معصیت نہیں کرتا' خواہ عالم ملکوت ہو خواہ عالم جبروت۔ فقط عالم دنیا میں خدا کی بارگاہ میں معصیت کی جاتی ہے۔

من ھوَانِ الدُنیاَ عَلَی اللهِ اَنهُ لاَیُعصَیٰ اِلاَّ فِیھا ولاَ ینَالُ

ماَ عَندَہُ اِلاَّترکَھا(13)

اللہ کے نزدیک دنیا کی حقارت کے لئے یہی بہت ہے کہ اللہ کی جو معصیت ہوتی ہے وہ فقط اس میں اور اللہ کی جو نعمت ملتی ہے وہ اسے ترک کرنے سے ہے۔

اللہ کی بارگاہ میں جو ہمیشہ اور باقی رہنے والی چیزیں ہیں وہ بھی دنیا کو چھوڑے بغیر نہیں ملتیں۔

ماَعِندَ کمُ یَنفَد وَماَ عِندَ اللہ ِ بَاقٍ (14)

جو کچھ تمہارے پاس وہ ختم ہونے والا ہے اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔

ان زاہدانہ اور عارفانہ نصائح میں ایک بڑا حصہ حضرتؑ نے اپنے خطبات اور مکتوبات میں مجاہدین کے لئے بیان فرمایا ہے تا کہ وہ دنیا کی حقیقت کو سمجھ لیں۔لہذا وہ بھی غنائم جنگی کے لئے ہر گز نہیں لڑتے تھے اور اگر جنگ میں کوئی چیز ان کے ہاتھ سے نکل جاتی تو اسے بھی نقصان شمار نہیں کرتے اور یہ عرفان و شجاعت کے مابین ہم آہنگی کا نتیجہ ہے۔اسی لئے ایک طرف امام خمینی نے اپنے وصیت نامے میں ہمیں مناجات شعبانیہ ‘صحیفہ سجادیہ‘ دعائے عرفانہ اور صحیفہ فاطمینہ پڑھنے کی دعوت دی ہے اور دوسری طرف مشرق و مغرب کے طاغوتوں کے خلاف جہاد کا بھی حکم دیا ہے۔

علی علیہ السلام فرماتے ہیں۔

اَلناَسُ مِن خوَفِ الذّلِ فیِ الذّلِ(15)

لوگ ذلت کے خوف کی وجہ سے ذلیل ہیں۔

جوں ہی انسان اس فرومائیگی کو ترک کرے گا‘ وہ باعزت بن جائے گا۔ پھر یہ نہیں کہے گا کہ ہم انقلاب لائے تو کیا ملا؟ چونکہ انقلاب اس لئے لائے ہیں تا کہ ملک میں خدا کے احکام پر عمل ہو البتہ بعض مواقع پر غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور اس کی وجہ ایک یہ ہے کہ جن لوگوں میں اہلیت ہے وہ کوئی منصب اور ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں چنانچہ علی علیہ السلام نے بھی ان لوگوں کا شدید شکوہ کیا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے مکتوبات تین قسم کے ہیں۔

پہلی قسم ان مکتوبات کی ہے جو آپ نے مالک اشتر جیسے والیان حکومت کو لکھے ہیں۔ مالک اشتر نے اسلام کی بہت زیادہ خدمت کی ہے۔ انہوں نے ابراہیم جیسے بیٹے کی تربیت کی اور اسے اسلام کے حوالے کیا چنانچہ ابراہیم نے بھی جناب مختار کے زمانے میں اہل بیت کے حق میں اپنے فرائض پر خوش اسلوبی سے عمل کیا۔ انہوں نے دوسروں کے ساتھ مل کر ابن زیاد' عمر سعد اور شمر جیسے قاتلین شہداء کو واصل جہنم کیا کہ ان میں سے بعض افراد بہت سی فضیلتوں کا مجموعہ تھے۔ ابراہیم کو خدا کی توفیق حاصل تھی۔ باپ امیر المومنینؑ کا خدمتگار رہا اور بیٹا امیر المومنینؑ کے بیٹے کا خدمتگار بنا۔ ابن زیاد' عمر سعد اور شمر کو قتل کرنا اہل بیت کی تشفی کا سبب بنا چنانچہ امام سجاد علیہ السلام کو جب ان ملعونوں کے واصل جہنم ہونے کی خبر ملی تو آپ نے شکر ادا کیا(16)۔ حاصل یہ کہ ان مکتوبات میں ایک حصہ ان خطوط کا ہے جو حضرت علیؑ نے فقیہ عالم اور سیاسی بصیرت رکھنے والے مالک اشتر کو لکھے ہیں جو بہترین مدیر و مدبر تھے۔

دوسری قسم ان خطوط کی ہے جو آپؑ نے ان افراد کو لکھے جو آپؑ کے لائق اور معمر مجاہدوں میں تھے لیکن ان کی قوت مدیریت اور انتظامی تدبیر اتنی اچھی نہیں تھی مثلاً جناب کمیل جو آپ کے اصحاب میں صاحب راز تھے۔ چنانچہ دوسرے اصحاب آپؑ سے خصوصی وقت مانگتے تاکہ تعلیم لے سکیں لیکن کمیل ایسے انسان تھے جنہیں حضرت خود ہاتھ پکڑ کر بیابان میں لے جاتے اور وہاں انہیں عظیم عرفانی مطالب تعلیم دیتے۔(17) لیکن انہی جناب کمیل کو علیؑ نے اپنے زمانہ حکومت میں ہیت نامی علاقے کا گورنر بنایا تو وہ اسے اچھی طرح نہ چلا سکے جس پر آپ نے کمیل کو ایک شکوہ بھرا خط لکھا اور فرمایا کہ میں نے تمہیں ہیت کا حاکم مقرر کیا ہے بنو امیہ کے گماشتے وہاں آئے اور لوٹ مار کر کے چلے گئے تو تم کیا کر رہے تھے۔(18)

تیسری قسم ان خطوط کی ہے جو نااہل افراد کے نام لکھے گئے جیسے زیاد بن ابیہ وغیرہ یہ

شخص اپنے زمانہ کا بدترین انسان تھا-(19) اس جیسے فاسد بہت کم پیدا ہوئے ہیں- زیاد دراصل آپ کے مقرر کردہ حاکم کا جانشین تھا یعنی زیاد کو علی علیہ السلام نے منصوب نہیں کیا تھا بلکہ بصرہ ،اہواز اور کرمان کے والی ابن عباس نے اسے اپنا جانشین مقرر کیا تھا کیونکہ جب اہل افراد موجود نہ ہوں یا کوئی ذمہ داری قبول نہ کریں تو پھر زیاد بن ابیہ جیسے لوگ آگے آجاتے ہیں- علی علیہ السلام نے ابتدائی طور پر خط لکھ کر اسے متعین نہیں فرمایا لیکن مقدس لوگ یا تو خوارج کے ساتھ مل گئے تھے یا اپنے آپ کو انہوں نے لا تعلق کر لیا تھا یا پھر وقت کے سیاستدانوں کے ہاتھوں فریب کھا کر اپنی راہ بدل چکے تھے جس کی وجہ سے زیاد بن ابیہ جیسے افراد حکومت علوی میں داخل ہوگئے- حالانکہ علی علیہ السلام کا موقف یہ تھا کہ اگر میرے بیٹوں کا ہاتھ بھی بیت المال کی طرف بڑھا تو میں اسے بھی کاٹ دوں گا(20) آپ کے پاس اگر لائق افراد مناسب تعداد میں ہوتے تو ہرگز زیاد جیسے افراد برسر اقتدار نہ آتے اور نہ بتدریج امویوں کو تسلط حاصل کرنے کا موقع ملتا۔ جب مدیر اور مدبر قسم کے لوگ کنارہ کش ہو جائیں اور اس کنارہ کشی کو ایک فضیلت سمجھنے لگیں تو اس صورت میں تھوڑے بہت ظلم کے ساتھ نظم وضبط ایجاد کرنا ہرج ومرج سے بہتر ہوتا ہے۔ الغرض کسی کو تو ملک کی زمام سنبھالنا ہی ہوتی ہے اور جب کوئی آگے نہ بڑھے تو زیاد جیسے افراد آگے آجاتے ہیں-(21)

بنابریں اہل لوگوں کا تعلیم حاصل کرنا اور گوناگوں شعبوں میں مہارت حاصل کرنا اسلامی حکومت کی پہلی ضرورت ہے۔ خصوصاً جوانوں کو اپنے اپنے شعبہ تعلیم میں محنت کرنی چاہیے اور اگر جوانوں میں مدیریت کا ذوق پایا جاتا ہو تو اس کو مزید قوی کریں پس تعلیم اور فرض شناسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی کام سنبھال لیں ورنہ یہ جان لیں کہ معاشرے میں بے شک علیؑ جیسا حاکم موجود ہو لیکن اچھے اور لائق مدیر نہ ہوں تو معاشرے کو نقصان پہنچے گا-

علی علیہ السلام مجاہدین کو محاذ جنگ پر روانہ کرتے ہوئے اور دیگر حکام اور حکومت کے سرکردہ افراد کو دنیا میں زہد اختیار کرنے کی تلقین کرتے تھے- جب کہ عام لوگ جب اپنی

فوج میں جنگی جذبہ بڑھانا چاہیں تو انہیں مادی وعدے دیتے ہیں' انہیں مال غنیمت کی ترغیب دلاتے ہیں اور نہ لڑنے کی صورت میں مال غنیمت کے ہاتھ سے چلے جانے سے ڈراتے ہیں لیکن علی علیہ السلام کے کلام میں مادی وعدے اصلی مقصد نہیں ہوتے تھے آپؑ لوگوں کو زہد و عرفان کی طرف دعوت دیتے تاکہ فتح کی صورت میں لوگوں کی مشکلات حل کریں آپ کے یہ مواعظ بہت سے مجاہدین کو فائدہ پہنچاتے۔

پس اسلام کے اندر جنگ و جہاد عرفان کے ساتھ مخلوط ہے چنانچہ اسلام کے حقیقی مجاہدین کی سیرت سے بھی یہی بات ثابت ہوتی ہے جیسے کہ امیر المومنین علیہ السلام حضرت امام حسن مجتبٰی علیہ السلام اور حضرت حسین علیہ السلام کی سیرت طیبہ سے بھی یہی نکتہ ثابت ہوتا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام خمینی کیسے عرفانی اشعار لکھتے تھے' مناجات و دعا کرتے اور بیماری کے عالم میں نماز تہجد پڑھا کرتے تھے۔ حتٰی کہ بستر بیماری پر بازو میں گلوکوز لگے ہونے کے باوجود نماز کے مستحبات کو بھی ترک نہ کرتے تھے۔ اگر لوگ نزدیک سے امام خمینی کو دیکھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ اس امت کے دل پر لگا ان کی مفارقت کا داغ کیوں بھر نہیں رہا اور ساری امت آج تک کیوں ان کے سوگ میں ہے۔ امام خمینی کی رحلت سے جس قدر مومنین کے دل غمگین ہوئے اسی قدر دشمنوں کو خوشی ہوئی ہے۔ شاید ایسا کوئی عالم نہیں ہے جس کے خلاف اتنا پروپیگنڈہ ہوا اور جس کی اتنی زیادہ توہین کی گئی ہو جتنی امام خمینی کی گئی ہے۔ موجودہ زمانے میں کوئی بھی اس عظمت کا مالک نہیں ہے۔ جیسا کہ پوری تاریخ میں امیر المومنینؑ کی مانند کوئی نہیں ہو سکتا۔ گزشتہ کئی سالوں سے دنیا کے تمام تبلیغاتی اداروں سے آپ کے خلاف پراپیگنڈا ہوا۔ آل سعود نے کتنا زیادہ زہر اگلا حتٰی کہ اسلامی انقلاب کو ایران کے اندر مجوس انقلاب کا لقب دیا۔ آپ اگر اپنی نجی زندگی میں سرگرم رہتے تو وہابیت آپ کے خلاف اتنا پراپیگنڈا نہ کرتی اور امام خمینی کے بقول مراکش اور اردن کے پھیری والے بادشاہ آپ کے خلاف موقف اختیار نہ کرتے۔

جب ایک عالم بزرگوار سے کہا گیا کہ علیؑ کا تعارف کرائیں تو انہوں نے جواب دیا کہ علیؑ کی شخصیت کے لئے کافی ہے کہ ایک گروہ نے آپکو حد سے اتنا آگے بڑھایا کہ معاذاللہ مقام الوہیت تک لے گئے اور دوسرے گروہ نے معاذاللہ آپ کی تکفیر کی۔ جب انسان عظمت پر پہنچ جائے تو اس کے حق میں یہ افراط و تفریط ہوتی ہے۔

امام خمینی نے دین کو اچھے طریقے سے سمجھا اور پھر اچھے طریقے سے اس کا احیاء بھی کیا لہذا جب یہ نعرہ لگایا گیا کہ دین علماء کے بغیر ہونا چاہئے تو آپ نے صنف علماء کو زندہ کر دیا۔ انقلاب کے اوائل میں مساجد لوگوں سے خالی ہو گئی تھیں آپ نے مساجد کو آباد کیا اور فرمایا مسجد لنگر ہے۔ جب بائیں بازو کی پارٹیوں اور منافقت صفت لوگوں نے عزاداری کو ایک اور نظر سے دیکھنا شروع کیا اور کہا جانے لگا کہ رونے کا کیا فائدہ ہے؟ اس روز سے امام خمینی نے حضرت امام حسین علیہ السلام پر رونے کو زندہ کیا چونکہ آپ کو معلوم تھا اس رونے میں بڑا اثر ہے۔ لہذا آپ نے عزاداری کے جلوس نکلوائے۔ یہ سب برکتیں حضرت صاحب امر عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ایک نائب کی وجہ سے تھیں۔ پس نتیجہ یہ نکلا کہ زہد و جہاد ایک دوسرے کے ساتھ سازگار ہیں عرفان جہاد کے ساتھ مانوس ہے ،عبادات اور مناجات کی جنگ و جہاد کے ساتھ کوئی مغائرت نہیں ہے۔ دعائے عرفہ، صحیفہ سجادیہ و فاطمیہ کی جہاد و دفاع کے ساتھ کوئی عداوت نہیں ہے۔

کربلا میں شام غریباں جب نزدیک پہنچی تو اموی سپاہ میں سے ہر ایک کی کوشش یہ تھی کہ جتنا جلدی ہو سکے شہداء کربلا کے مقدس سروں کو دارالامارہ لے جائیں تاکہ انعام پا سکیں لہذا انہوں نے آپس میں ان سروں کو تقسیم کر لیا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کے بدن مطہر پر موجود ہر چیز کو لوٹ لیا وہ پرانا لباس جو آپؑ نے اپنے لباس کے نیچے پہنا ہوا تھا وہ بھی گھوڑوں کی ٹاپوں کے ساتھ بدن سے اتر گیا۔ اس تیس ہزار لشکر میں بہت کم لوگ تھے جو ان سروں کو پہچانتے تھے۔ باقی خوارج یا امیر المومنین علیہ السلام کو تکفیر کرنے والے وہ لوگ تھے جو فقط ثواب حاصل کرنے آئے تھے نہ کہ انعام پانے کی غرض

سے۔البتہ واقعہ کربلا کے اصلی بانی شام سے آئے تھے جیسے عمر عاص، ابن زیاد اور شمر وغیرہ انہیں اس ماجرے کا سارا علم تھا۔ سرجون رومی جو ایک مسیحی تھا شام کے دربار میں ٹھہرا رہا حتٰی کہ معاویہ واصل جہنم ہوا لیکن مرنے سے پہلے اس نے یزید کو وصیت کی سرجون کو اپنے پاس ہی رکھنا وہ تمہاری مدد کرے گا اور اس کی سازش سے ابن زیاد نے کربلا کی ذمہ داری قبول کی۔ اسی نے یزید کو یہ مشورہ دیا کہ ابن زیاد اہم کردار ادا کر سکتا ہے لہذا لشکر کا سالار اسے مقرر کرو یہ ساری مشکل حل کر دے گا۔ امویوں اور رومیوں کی اس ملی بھگت نے واقعہ کربلا میں اصل کردار ادا کیا یہ لوگ ہی اس ماجرا کے اصلی ارکان تھے باقی لوگ اطراف کے دیہاتوں سے آئے ہوئے خوارج تھے۔ انہوں نے بہشت میں جانے کے لئے زمین پر موجود ان پاکیزہ انسانوں کو شہید کیا۔ اسی وجہ سے امام حسین علیہ السلام نے جب شب عاشور کی مہلت مانگی تاکہ نماز و عبادت بجالائیں تو انہوں نے کہا آپ کی نماز تو قبول ہی نہیں ہے۔ روز عاشور ظہر کے وقت بھی جب نماز کے لئے فرصت مانگی تو جواب دیا کہ آپ کی نماز تو قبول ہی نہیں ہے۔ بنو امیہ کے جھوٹے پراپیگنڈہ نے اتنا غلط اثر چھوڑا کہ واقعہ کربلا کے بعد اس کو زائل ہوتے بھی ایک مدت لگ گئی۔ شام میں جب لوگوں کو امام حسین علیہ السلام کی شہادت کی خبر پہنچی تو لوگوں نے ایک دوسرے کو مبارک باد دی اور نئے کپڑے پہن لئے۔ وہ سب یہ کہہ رہے تھے کہ ایک خارجی (معاذاللہ) کو قتل کیا گیا ہے چونکہ اس نے بغاوت کیتھی اور باغی کا خون مباح ہے۔ انہی سازشوں سے انہوں نے کربلا برپا کی۔جب کہ امام حسین علیہ السلام کا کہنا یہ تھا کہ میں اپنے خون کی قربانی سے تمام مسموم تبلیغات کو باطل قرار دے کر حق کو زندہ کر دوں گا۔

اور آپؑ نے ایسے ہی کیا۔ اپنے لواحقین کو فرمایا کہ قید کا بوجھ اٹھانے کے لئے تیار ہو جاؤ خدا تمھیں اس کا بہت عظیم اجر عطا فرمائے گا۔ گیارہویں محرم کی رات کو اہل بیت کے بچوں کے لئے ایک جلے ہوئے خیمے کے علاوہ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ (22) جب دشمنوں کی لوٹ مار ختم ہو گئی تو امام سجاد علیہ السلام کے حکم سے سب کو دوبارہ اکٹھا کیا گیا۔

جب سب جمع ہوئے تو معلوم ہوا کہ جان بچاتے ہوئے کئی بچے شہید ہو گئے ہیں۔ دار الحرب نامی خیمہ جس میں تمام شہداء کے پاک لاشے پڑے ہوئے تھے ساتھ ہی تھا۔ خدا جانتا ہے ان بیبیوں نے اپنے عزیزوں کی لاشوں کے سامنے کیسے وقت گزارا ہوگا۔ حضرت امام حسین علیہ السلام اور حضرت عباسؑ کے علاوہ چند دیگر صحابیوں کی لاشوں کے سوا تمام شہداء کی لاشیں اسی خیمے میں موجود تھیں۔ (23) گیارہویں کی رات کو امام حسین علیہ السلام کا سر اقدس کوفہ کی طرف لے جایا گیا۔ اسی دوران یہ بھی نقل کیا گیا ہے حضرت زہرا سلام اللہ علیہا کوفہ کی ایک مومنہ خاتون کے لئے عالم مثال میں ظاہر ہوئیں اور اسے بتایا کہ یہ فرزند رسولؐ کا سر ہے۔

کربلا میں معمولی لوگ نہیں تھے اور نہ ہی یہ کام معمولی لوگوں سے انجام پا سکتا تھا۔ حضرت سکینہؑ کے بارے میں روایات میں ہے۔

كَانَ الغَالِبُ عَليهَا الاِ ستغرَاقُ فِی اللهِ (24)

وہ ذات خدا میں اکثر اوقات محو رہتی تھیں۔

گویا کوئی جنگ ہی نہیں ہوئی ہے گویا کوئی شہید ہی نہیں ہوا ہے حضرت سکینہ متاثر نہیں تھیں بلکہ اکثر ان کی حالت عرفانی ہوتی تھی وہ جمال و جلال خدا میں غرق تھیں۔ اسی حالت میں اپنے بابا کی لاش پر آتی ہیں جو سر کے بغیر تھی۔ حضرت سکینہ دنیا کے لئے آنسو نہیں بہاتیں۔ حضرت زینبؑ اور حضرت سید سجادؑ بھی ایسے ہی تھے۔ عام لوگ دنیا کے لئے روتے ہیں لیکن یہ قیدی ایسے نہ تھے۔ جس طرح شہداء میں درجہ اول کے شہید تھے قیدیوں میں بھی یہ درجہ اول کے قیدی تھے کہ جب انہیں کوفہ لایا گیا تو ہرگز ذلت و اسارت کا احساس نہیں کیا، اپنی حالت قابل رحم نہیں بنائی بلکہ ڈٹ کر ہر بات کا جواب دیا۔ (25) زید نے جب گستاخانہ کلمات کہے تو حضرت زینبؑ نے فرمایا۔

هَؤُلاَ قَومٌ كَتَبَ اللهُ عَلَيهِمُ القَتلُ وَ بَرَزُوا
اِلیٰ مَضَا جِعِهِم (26)

یہ وہ قوم ہیں جن کے لئے خدا نے شہادت رقم کی ہے اور وہ اپنی قتل گاہ کی طرف چل نکلے۔

خداوند تعالیٰ نے اپنے دین کی زمام ہر ایک کے ہاتھوں میں نہیں دی بلکہ قرآن مجید میں پیغمبر اکرمؐ کی زبان سے لوگوں سے کہلوادیا کہ

اِن کُنتمُ فیِ بُیُوتِکُم لَبَسرَ الذَّ ینَ کُتِبَ علیھِمُ القُتلُ اِلیٰ مُضاَجِعِھِم(27)

اگر تم اپنے گھروں میں بیٹھے رہے تو وہ لوگ میدان جنگ کی طرف نکل کھڑے ہوں گے جن کے لئے شہادت رقم کردی گئی ہے۔

پس خدا کا یہ وعدہ ہے کہ جب دین خطرے سے دوچار ہو اور تم گھروں میں دبکے رہے تو خدا تمہاری جگہ تم سے بہتر لوگوں کو میدان جنگ کی طرف روانہ کرے گا۔ حضرت زینبؑ نے بھی ابن زیاد سے یہی فرمایا کہ کربلا کے شہداء وہ لوگ ہیں جو قضاء و قدر الہی کے تحت شہادت کی جانب بڑھے ہیں پس ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا لہذا قیامت کے دن یہ حق بجانب ہوں گے اور تم قہور ہو گے۔ یہ الفاظ اس شخصیت کے ہیں جو خداوند تعالیٰ کی حتمی قضاء سے آگاہ ہے اور جو خدا کی قدرت سے بول رہی ہے۔ یہ الفاظ اس حالت میں بیان فرمائے جب آپ کے بازو بندھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود خدا کے جلال و جمال کے علاوہ کسی چیز کی طرف توجہ نہ کی اور ہرگز اپنی بات یا اپنی حالت سے اپنے ذلیل یا قابل رحم ہونے کا اظہار نہیں کیا بلکہ ظلم کے خلاف جوبات بھی کی جرات کے ساتھ کی۔ اس کے بعد خدا کی مصلحت یہ تھی کہ کوفہ کے اندر ایک معجزہ بھی ظاہر ہو جائے اور وہ یہ کہ امام حسین علیہ السلام کا سر مقدس جس تنور میں تھا(28) اس کے نزدیک حضرت زہراء علیہا السلام اپنے آپ کو ظاہر کریں۔ جیسا کہ بازار کوفہ میں خود حضرت امام حسین علیہ السلام نے ایک معجزہ دکھایا۔ (29) البتہ جب تک آپ زندہ رہے معجزہ کے ذریعے کوئی مشکل حل نہیں کی لیکن شہادت کے بعد معجزہ دکھایا چنانچہ جن کے کان سننے کے قابل تھے اور آنکھیں دیکھنے کے

لائق انہوں نے دیکھا بھی اور سنا بھی کہ امام حسین علیہ السلام کے مقدس سر سے تلاوت قرآن پاک کی آواز آرہی تھی اور آپ یہ آیت تلاوت فرمارہے تھے۔

اَم حَسِبتَ اِنَّ اَصحاَبَ الکَھفِ والرّقیم کاَنوُا من آیاَتِناَ عَجَباً(30)

کیاتم یہ سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف اور اصحاف رقیم ہماری عجیب آیات میں سے ہیں۔ یہ تلاوت اہل بیت نے بھی سنی اور بعض خاص لوگوں نے بھی۔ شہادت کے بعد معجزہ ظاہر کرنے کے لئے میدان فراہم ہو گیا تھالہذا یہ جو نقل ہوا کہ امام علیہ السلام کی قبر مطہر کی طرف دریائے فرات کاپانی بہایا گیا توپانی قبر کے نزدیک پہنچ کر واپس ہو گیا۔ جب سرزمین کربلا پر کھیتی باڑی کی غرض سے ہل چلانے کی کوشش کی گئی تو ہل میں جتے ہوئے حیوان آگے نہیں بڑھتے تھے ان واقعات کے انکار پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ذوات مقدسہ خدا کی قدرت کا مظہر ہیں۔ کبھی تو گھوڑے کو اپنے سینے کے اوپر سے گزرنے کی اجازت دے دیتے ہیں لیکن کبھی ہل میں جتے ہوئے گائے بیل کو اپنی قبر کے نزدیک بھی نہیں آنے دیتے۔ جہاں تک کوشش کا تعلق تھا وہاں پر قربانی دی اور جان نثار کر دی اس کے بعد اعجاز خدا کے ظہور کا موقع آیا۔ خدا جانتا ہے کہ گھوڑے کس طرح آپ کے مقدس سینے پر دوڑے ہوں گے (31) خدا جانتا ہے کہ حضرت زینبؑ نے جب آپ کی لاش کو سیدھا کیا اور فرمایا کہ خدایا ہماری یہ قربانی قبول فرما تو آپ کی حالت کیا ہوئی ہوگی۔(32)

بارہویں فصل

انقلاب ایک نظریاتی بنیاد کا محتاج ہے۔

ایک نظریاتی انقلاب کسی فکری بنیاد کے بغیر ناممکن ہے اس بارے میں قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

یاَ اَھل َالکِتاَبِ لَستُم عَلیٰ شَیً حَتّٰی یُقِیموُا التورٰۃَ و الاِ نجیلَ

اے اہل کتاب تمہارے پاس ایسی توحید کی بنیاد نہیں ہے جس کی بناء پر (اپنی آسمانی کتاب) تورات یا انجیل پر عمل کر سکو۔

البتہ اس آیت کے اور بھی معانی ذکر کیے گئے ہیں بہر حال آیت کریمہ میں خطاب اگرچہ اہل کتاب کی طرف ہے لیکن اس کا مضمون مسلمین کو بھی شامل ہے۔ لہذا مسلمان اگر قرآن کو قائم کرنا چاہتے ہیں تو انہیں پہلے خود قائم ہونا چاہئے تاکہ مکتب کو قائم کرنے کے قابل ہو جائیں۔ قائم انسان کو ایک مضبوط اور استوار بنیاد کی ضرورت ہے جس کی اساس پر خود قائم ہو سکے ورنہ کسی اور چیز کو قائم کرنے کے قابل نہیں ہو گا۔

ائمہ ہدیٰ علیہم السلام نے قرآن کو قائم کیا ہے اسی وجہ سے ان کے بارے میں یوں کہا جاتا ہے:

اَشهَدُ اَنكَ قَدَ اَقَمتَ الصَّلوۃَ و اٰتیتَ الزکاۃَ(2)

میں شہادت دیتا ہوں کہ آپؑ نے نماز قائم کی اور زکوۃ ادا کی ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ ائمہ معصومین علیہم السلام کے پاس ایک مضبوط فکری بنیاد موجود

تھی۔ یہ بنیادی اصولوں میں سے ایک اصل ہے کہ جب تک انسان کے پاس ایک نظریاتی اور فکری بنیاد نہ ہو وہ ایک مذہبی اور نظریاتی انقلاب کے قابل نہیں ہوتا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ امام خمینی کے پاس وہ کونسی نظریاتی بنیاد تھی جس پر آپ قائم تھے اور کونسا ایسا مضبوط نظریاتی قلعہ تھا جس میں آپ خود اور آپ کے پیروکار پناہ لئے ہوئے تھے؟ آپ نے انقلاب کا آغاز قم کے حوزہ علمیہ سے کیا۔ چونکہ آپ کی فکری بنیاد کی جڑیں فقہ میں تھیں چنانچہ آپ نے اول سے آخر تک پوری فقہ کا تحقیقی مطالعہ کیا اور اس کے بعد ایک نتیجے پر پہنچے۔ گویا آپ نے پہلے سلف کی جانفرسا زحمتوں کو عمیق نظر سے دیکھا اس کے بعد ان کے نظریات پر اپنی فکر کی بنیاد رکھی۔ گزشتہ علماء جن ادوار سے گزرے ہیں ان کا ذکر یہاں پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

بہت عرصے تک فقیہ اور عوام کے درمیان رابطہ ایک محدث اور سامع کا رابطہ تھا اخباری طرز فکر کے نتیجے میں جو ، جمود پیدا ہوا اس کا اثر یہ ہوا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا اور فقیہ کا کام لوگوں کے سامنے احادیث نقل کرنا اور ان کا ترجمہ بیان کرنے کی حد تک تھا چونکہ فقیہ کو استنباط اور اجتہاد کا حق نہیں تھا لیکن یہ فکری جمود ایک عرصے کے بعد بعض اصولی مجتہدین کے ہاتھوں بالعموم اور بالخصوص استاد اکبر جناب وحید بہبہانی مرحوم کے ہاتھوں ٹوٹ گیا اور اجتہاد دوبارہ زندہ ہو گیا۔ ایک بار پھر فقیہ اور عوام کا رابطہ مرجع اور مقلد کے رابطے میں تبدیل ہو گیا لوگ اپنے مرجع تقلید کے اجتہاد و استنباط سے استفادہ کرتے اور مرجع تقلید بھی لوگوں کے سامنے آتے اور اپنے اجتہادی افکار پیش کرتے۔ فقیہ کا فتویٰ لوگوں کے لئے واجب العمل ہو گیا اور اس کا حکم لازم الاجراء۔ برسوں تک صورت حال یہی رہی حتیٰ کہ آہستہ آہستہ ولایت فقیہ کا مسئلہ کھل کر فقہی کتب کے اندر بیان ہونے لگا اگرچہ اس کے بنیادی اصول قدماء کی تالیفات میں بھی موجود تھے لیکن جس طرح سے آج یہ مسئلہ کھل کر سامنے آیا ہے ایسے پہلے نہ تھا۔ آج اس نے فقہ میں اپنا مقام پیدا کر لیا ہے اور دیگر فروعات پر بھی سایہ ڈال رہا ہے۔ مرحوم نراقی نے اپنی کتب میں ولایت فقیہ کو مسائل

فقہ میں سے ایک مسئلہ کے طور پر لکھا ہے (3) لیکن فقہ میں اس مسئلے نے زیادہ نکھار پیدا نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی بنیادی طور پر یہ مسئلہ علم کلام سے تعلق رکھتا ہے لہذا فقہ میں اس کو درج کرنے سے یہ اپنا حقیقی مقام پیدا نہیں کر سکا جس کے نتیجے میں اس قاعدے کا مصداق نہیں بن سکا کہ

اُصلُھاَ ثَابِت' وَفرَعُھاَ فِی السّماءِ (4)

اس کی جڑیں راسخ اور شاخیں آسمان میں ہیں۔

بلکہ ایک طولانی مدت گزرنے کے بعد اس کام نے عملی جامہ پہنا۔ لیکن امام خمینی کا کارنامہ یہ تھا کہ آپ نے ولایت فقیہ کے مسئلہ کو فقہ کی قلمرو سے نکال کر علم کلام میں داخل کر دیا جو اس کا حقیقی مقام ہے اس کے بعد عقلی اور کلامی دلائل سے اسے مزید نکھار اور اس کے بعد یہ کلامی مسئلہ بن کر فقہی مسائل پر اثر انداز ہوا اور پوری فقہ پر سایہ فگن ہوا جس کے انتہائی مثبت نتائج بر آمد ہوئے اور یہ نعرہ جو لگایا جاتا ہے کہ حضرت حجت عجل اللہ تعالیٰ فرجہ الشریف کے ظہور تک یہ راہ جاری ہے جو اس کے اصلی وارث ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں نے اصلی اور خالص اسلام کو پہچان لیا ہے۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو ایک مضبوط فکری اور اعتقادی بنیاد مل گئی ہے۔ لوگوں کو اسلام کا اصلی محور بھی نصیب ہو گیا ہے لہذا اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے دریغ نہیں کرتے چونکہ اسلام کی راہ میں قربانی کے نتائج اور آثار پہلے سے بہتر معلوم ہو گئے ہیں جو اس راہ میں قربانی جاری رکھنے کی علامت ہے۔

ویسے تو تمام مراجع عظام ہمیشہ دین کے حامی رہے ہیں اور تمام مدرسین اور طلاب بھی میدان میں حاضر رہے ہیں لیکن اس سلسلے میں جو رتبہ امام خمینی کو نصیب ہوا ہے وہ کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔

ذلك فضل اللّٰهِ يوُتِيه مَن يَشاءُ (5)

خدا جسے چاہتا ہے یہ فضل عطا کرتا ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عالیشان علوم و کلمات دریافت کرنے کے بعد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے جو لباس معراج عطا کیا ہے تو اب مجھے اتنا عروج کرنا چاہئے اور دین اسلام کو ایسے مقام رفیع تک پہنچانا چاہئے تاکہ وہ سارے جہان کو اپنے زیر سایہ لے لے۔ چونکہ دین وہ شجرہ ہے جس کے بارے میں قرآن مجید کا فرمان ہے۔

اَصلُهَا ثَابِتٌ وَ فرعُهاَ فیِ السّماءِ(6)

''اس کی جڑیں مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں۔''

دین کو ایسے مقام تک پہنچانا بھی خدا کا ایک مخصوص فضل ہے جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتا۔ اس نکتے سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام خمینی کا فکری اور نظریاتی انقلاب کس طرح کا تھا۔ دشمنوں نے فقیہ کو میدان سیاست سے باہر نکالنے سے پہلے فقہ کو سیاست کے میدان سے نکال باہر کیا۔ ولی کو میدان سیاست سے دور کرنے سے پہلے ولایت کو سیاست سے دور کر کے گوشہ نشین کیا گیا۔ یہ کام دانا دشمن نے انجام دیا جسے نادان دوست نے فوراً قبول کر لیا۔ دشمنوں کا کہنا یہ تھا کہ امامت ایک عوامی منصب ہے جسے عام لوگ بھی مقرر کر سکتے ہیں چنانچہ علی علیہ السلام کو گھر میں گوشہ نشین کر دیا گیا غرض یہ کہ پہلے امامت اور پھر امام کو گوشہ نشین بنایا گیا جن کا نعرہ یہ تھا کہ

مِناَ اَمیرٌ وَ مِنکُم اُمِیرٌ

ایک امیر ہم میں سے اور ایک تم میں سے ہو۔

تو ان کی مراد اس سے یہی تھی کہ امامت ایک عوامی منصب ہے اور عوامی منصب کا انتخاب سقیفہ سے بھی ممکن ہے۔ چنانچہ امامت کو عرش سے فرش پر اتارا گیا اور انتصاب سے انتخاب تک لایا گیا، نص نبیؐ سے دور کر کے سقیفہ میں لا کر اسیر کر دیا اور اس طرح سے علی کو خانہ نشین بنا دیا۔ پس اس نکتے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ جو فقیہ کو میدان سے نکالنا چاہتا ہے پہلے فقہ کو اسیر بناتا ہے اور ولی کو خانہ نشین بنانے کے لئے ولایت کو اسیر بناتا

ہے۔ امام خمینی اسی وجہ سے فرماتے تھے کہ فقہ جواہری کے مطابق عمل ہونا چاہئے چونکہ صاحب جواہر وہ فقیہ ہیں جنہوں نے فرمایا کہ جو منکر ولایت فقیہ ہے اس نے گویا فقہ کا مزہ ہی نہیں چکھا-(7) فقہ کے ذائقہ سے مراد مسئلہ کلامی ہے- چونکہ صاحب جواہر نے فقہ کے اندر مسئلہ ولایت فقیہ کو کلامی رنگ میں پیش کیا ہے اور اس پر کلامی دلیل پیش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ بنیادی طور پر ہے ہی علم کلام کا۔ صاحب جواہر فرماتے ہیں کہ امام زمانہؑ کی غیبت کے زمانے میں ایک نظام حکومت کی ضرورت ہے اور وہ حکومت بھی الٰہی ہونی چاہئے پس لامحالہ خداوند تعالیٰ اس نظام کو چلانے کے لئے ایسے شخص کو تجویز کرتا ہے جو حدود احکام الٰہیہ سے آشنا ہو اور انہیں نافذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو لہذا جو منکر ولایت فقیہ ہے اس نے گویا فقہ کا مزہ نہیں چکھا ہے-

كَانَّهٗ ماَ ذَاقَ مَن طَعِم الفِقِه شياً

غرض یہ کہ امام خمینیؒ نے اسلامی حکومت تشکیل دینے سے پہلے ایک اعتقادی اور کلامی بنیاد فراہم کی اور اس کے اوپر فقہ کی بنیاد استوار کی اس کے بعد ولایت کو حصولی اور تحصیلی اقسام میں تقسیم کیا پھر کہیں جاکر ولایت تحصیلی کی شرائط، جیل کی مشقیں جلاوطنیاں اور تہمت وبہتان برداشت کر کے حاصل کیں-

اس کے بعد مرجع تقلید اور لوگوں کے درمیان رابطے کو امام وامت کے رابطے میں تبدیل کردیا۔ پھر فقیہ کی امامت کو امام معصوم کی نیابت قرار دیا- امامت کو ثقل اصغر کے طور پر متعارف کروایا اور ثقل اصغر کو ثقل اکبر پر قربان کردیا- لہذا مدرسہ فیضیہ کے واقعہ کے بعد آپ نے فرمایا "جو بھی ہونا ہے ہو جائے مگر میں یہ راستہ جاری رکھوں گا۔" چونکہ آپ کا انقلاب فکر اور فقہ کی بنیاد پر استوار تھا اور قرآن کریم کے بقول یہ انقلاب علی شئی تھا اس لئے آپ نے زندگی کے آخری لحظے تک یہی موقف اپنائے رکھا حتی کہ معاشرے کو اسفل السافلین سے نکال کر اعلی علیین تک پہنچادیا۔ البتہ حق یہ ہے کہ یہ انقلاب قرآن و عترت کا معجزہ ہے۔ نبی اکرمؐ نے اپنی عمر مبارک کے آخری ایام میں لوگوں کو ثقلین کے

متعلق وصیت فرمائی:

اِنیِّ تَارِکٌ فِیکُمُ الثقلَین کِتَابَ اللہِ وعِترَتی (8)

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی آخری ایام میں لوگوں کو ثقلین کے متعلق وصیت فرمائی اور فرمایا:

اَقِیمُوا ھٰذَینِ العَمُودَینِ وَاَوقَدُوا ھٰذَینِ مِصبَاحَینِ

(9)

ان دوستونوں کو قائم رکھو اور ان دو چراغوں کو ہمیشہ روشن رکھو۔

علی علیہ السلام چونکہ نبیؐ کے جانشین تھے لہذا نبی اکرمؐ کی طرح وصیت فرمائی اور امام خمینی بھی چونکہ امام معصوم کے نائب ہیں لہذا اپنے وصیت نامے میں لوگوں کو ثقلین کے متعلق وصیت کرتے ہیں۔ یہ سارے مطالب آپ کے وصیت نامے کے مقدمے میں درج ہیں جس کی حیثیت ایک متن کی ہے اور باقی سارا وصیت نامہ حدیث ثقلین اور قرآن و حدیث کی تفسیر ہے۔ آپ نے لوگوں کو اسلامی سیاست کے میدان میں آنے کی دعوت اس لئے دی ہے کیونکہ قرآن و عترت ہمیں میدان سیاست میں داخل ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ آپ نے وصیت نامے میں مسلمانوں کو وحدت کی طرف بلایا ہے چونکہ قرآن و عترت لوگوں کو وحدت کی دعوت دیتے ہیں۔

آپ نے حکومت اسلامی کو تمام لوگوں کی ذمہ داری قرار دیکر در حقیقت قرآن و عترت کا مقصود بیان کیا ہے۔ لاشرقی ولا غربی۔ محروم و ستم دیدہ لوگوں کی حمایت' جنگ' فقر و غناء جیسے مطالب وصیت نامے میں قرآن و عترت کے بیان کی تشریح ہیں۔ وصیت نامے کے اختتام پر فرمایا "میں امید بھرے دل اور قلب مطمئن کے ساتھ وصال حق کی طرف جارہا ہوں۔" یہ جملہ بھی آپ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین علیہ السلام سے ہی سیکھا ہے۔ چونکہ پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں جب لوگوں نے عرض کیا کہ آپ کی رحلت کا وقت کب ہے تو آپؐ نے جواب میں فرمایا:

دَنیٰ الاَ جَلُ (10)

رحلت کا وقت نزدیک آپہنچا ہے اور جب پوچھا گیا کہ رحلت کے بعد آپ کہاں جائیں گے تو آپ نے فرمایا:

وَالُمنقلِبُ اَلیٰ اللهِ والسِدرَۃ الُمنتھٰی وَ جَنّه الماوَیٰ
وَالعرَشِ الاَعلیٰ وَاکاَسِ اَلاَوفٰی وَ العَیشِ الاَھناَءِ

میں اللہ کی طرف پلٹ جاؤں گا سدرہ المنتہیٰ ، جنت ماویٰ ، عرش اعلیٰ، جام لبریز اور ایک مبارک زندگی کی طرف منتقل ہو جاؤں گا۔

امام خمینی قدس سرہ بھی کبھی مناجات شعبانیہ کا تذکرہ کرتے اور کبھی سورہ فجر کی آخری آیت کے معنی بیان کرتے۔

فَاَد خُلیِ فیِ عِباَدیِ وَ اَدخُلِی جَنّتیِ

میرے بندوں میں داخل ہو جاؤ اور میری جنت میں آجاؤ۔

امام خمینی اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے تھے خدا کے خاص بندوں کی صف میں داخل ہونا اور جنت والوں میں جانا سالک اور صالح مند انسانوں کا نصیب ہے۔ چونکہ ہم بہت سی آیات کے سمجھنے سے قاصر ہیں لہذا انہیں مجازی معانی پر محمول کرتے ہیں۔ لیکن جو سارے مقامات طے کر چکا ہو وہ ان کے لئے کچھ اور معانی بیان کرتا ہے۔

قرآن مجید کی عالی شان آیات میں ایک آیت یہ ہے۔

یُعذبُ منَ یَشاَءُ وَ یرحَمُ منَ یَشاَءُ وَ اِلَیهِ تُقلَبُون(11)

وہ جسے چاہتا ہے عذاب دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اسی کی طرف سب پلٹیں گے۔ اس آیت میں کلمہ (والیہ تقلبون) کا مضمون (انا للہ وانا الیہ راجعون) (12) کے مضمون سے کہیں زیادہ قوی ہے چونکہ رجوع کے معنی اور انقلاب کے معنی میں بہت فرق ہے (13) اس لئے بنی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا (المرجع الی اللہ) میں اللہ کی طرف رجوع کر رہا ہوں۔

سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَاباً طَهُوراً(14)

ان کا پروردگار انہیں پاکیزہ شراب پلائے گا۔

نبی اکرمؐ ہمیشہ بارگاہ خدا میں گریہ و نالہ کرتے رہتے۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ آپ اس قدر کیوں روتے ہیں جب کہ قرآن نے آپ کو یہ مژدہ سنایا ہے:

لِيَغْفِرَ اللهُ مَاتَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ(15)

خدا تمہارے اگلے پچھلے سب گناہ معاف کردے گا۔

آپؐ نے فرمایا۔(افلا اکون عبداشکوراً)(16) کیا میں خدا کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟

معلوم ہوا کہ جب تک انسان بندگی کی حالت میں ہے ہمیشہ روتا رہے۔ اس کے پاس آنسو سے بڑا اسلحہ کوئی نہیں ہے۔

وَسِلاَحُهُ الْبُكَاءَ

اس کا اسلحہ فقط اس کا رونا ہے۔

لیکن جب آپؐ نے وعدہ حق کو دیکھا تو فرمایا میں عرش خدا کی طرف جانے والا ہوں۔امیر المومنین علیہ السلام کو بھی جب ضربت لگی تو آپؑ نے دیکھا کہ آپ کی بیٹی ام کلثوم گریہ کررہی ہے آپؑ نے ان سے گریہ کرنے کا سبب پوچھا تو جناب ام کلثوم نے جواب دیا۔

مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ شمشیر زہر آلود تھی اور اس کا زہر آپ کے پورے وجود میں پھیل چکا ہے۔ آپؑ نے فرمایا میری بیٹی جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں اگر وہ تم بھی دیکھ لیتیں تو ہرگز آنسو نہ بہاتیں۔(18) چونکہ سب انبیاء اور ملائکہ صف باندھ کر میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ نبی اکرم نے امیر المومنینؑ کو فرمایا:

يَا عَلِيُّ اِذَا اَنَا مِتُّ فَغَسِّلنِي وَحَنِّطنِي وَخُذ بِمَجَامِعِ كَفَنِي وَاَقعِدنِي وَسَلنِي مَاشِئتَ وَاكتُب مَاقُلتُ(19)

اے علیؑ جب میں رحلت کر جاؤں تو آپ غسل دیں حنوط لگائیں اور میرے کفن کے کونے پکڑ کر مجھے بٹھائیں اور اس کے بعد جو آپ کو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھیں اور جو کچھ میں کہوں اسے لکھ لیں۔

علیؑ نے عرض کیا آپ کو غسل دینا آسان نہیں ہے چونکہ آپ کا بدن بہت بھاری ہے۔ علیؑ کو کہاں سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اکرمؐ کا بدن بہت بھاری ہے ؟

اس کا جواب یہ ہے کہ کعبے کے اندر بت توڑنے کے واقعہ میں پیغمبر اکرمؐ نے آزمانے کی غرض سے علیؑ کے کندھے پر اپنا پاؤں رکھا تو علیؑ پکار اٹھے میں آپ کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ وہ علیؑ جو قلعہ خیبر کے دروازے کو اکھاڑ پھینکتے ہیں پیغمبر اکرمؐ کا بوجھ اپنے کندھے پر برداشت نہیں کر سکتے۔ (20) چونکہ نبی اکرمؐ کا مقام بہت بلند ہے لیکن جو بھی دوش پیغمبرؐ پر کھڑا ہو جائے رفعت و بلندی کا احساس کرتا ہے۔ چنانچہ علیؑ نے فتح مکہ کے دوران اس بلندی کو محسوس کیا۔ اسی وجہ سے علیؑ نے عرض کیا آپؐ کا بدن بہت بھاری ہے میں غسل کے دوران اسے ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر نہیں ہلا سکتا۔ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا غسل کے وقت بہت سے ملائکہ آپؑ کی مدد کو آئیں گے اور بدن خود بخود پہلو بدلے گا۔ آپ کو ہلانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا جب میرا غسل و کفن تمام ہو جائے تو مجھے بٹھا دینا اور پھر جو مرضی ہو مجھ سے پوچھ لینا اور جو کچھ میں بتاؤں وہ لکھ لینا۔

امام صادق علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ آیا امیر المومنین علیہ السلام نے اس وصیت پر عمل کیا یا نہیں ؟ آپؑ نے جواب دیا ہاں! علی علیہ السلام نے اس پر عمل کیا تھا۔ امیر المومنین علیہ السلام جب نبی اکرمؐ کو غسل دے رہے تھے تو دوران غسل عرض کیا:

بِاَبِی اَنتَ وَاُمِّی خَصَصتَ حَتّی صِرتَ مُسلِیًا عَمَن سِوَاکَ
وَلَقَد عَمَّمتَ حَتّی صَارَ النَّاس فِیکَ سَوَاء

میرے ماں باپ آپ پر قربان ہو جائیں اے رسول اللہ آپ نے اپنی رحلت کی مصیبت

میں اپنے اہل بیت کو مخصوص کر کے دوسرے سارے غموں سے بری کر دیا اور اس غم کو آپ نے اتنا عام کیا حتیٰ کہ سارے لوگ اس میں برابر کے شریک ہو گئے۔

ہم نے بھی انقلاب کے اندر اور انقلاب کے بعد جنگ کے دوران متعدد شہداء پیش کئے ہیں جن کا ہمیں بہت ہی غم ہے لیکن امام خمینیؒ کی رحلت نے ہم سے سارے گزشتہ غم فراموش کروا دیئے اگرچہ ہماری کوشش یہ ہے کہ صبر و حوصلہ سے بات کریں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمارے لئے اس مصیبت پر صبر کرنا بہت دشوار ہے۔ بہت سے موقعوں پر کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہیں روک سکتے یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے۔

چنانچہ امیر المومنین علیہ السلام فرماتے "ہیں اے رسول خدا آپ کی مصیبت اتنی زیادہ ہے کہ ہمیں باقی سارے غم بھول گئے ہیں ہم سب پژمردہ ہیں اور سب اس غم میں شریک ہیں۔ چونکہ آپ کی رحلت سے ہمارے ہاتھ سے ایسی چیز چھن گئی ہے جو کسی اور کی موت سے ممکن نہیں ہے۔"

لَقَد اِنقَطَعَ بِمَوتِكَ مَالَم يَنقِطَعُ بِمَوتِ اَحَدٍ مِنَ النُّبوةِ وَالاَ نباَءِ اِخبَارِ السَمَاء

آپؐ کی رحلت سے ایک چیز ہم سے چھن گئی ہے جو کسی اور کی موت سے نہیں چھن سکتی تھی اور وہ نبوت اور آسمان سے آنے والی خبریں ہیں۔ یعنی آپؐ کے زمانے میں قرآن نازل ہوتا تھا اب نزول قرآن کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ اب ملائکہ شریعت کے احکام نہیں لائیں گے اور یہ ایک جان لیوا مصیبت ہے۔ اس کے بعد علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔

یَارَسُولِ اللهِ و اذکُر نا عِندَ رَبِّكَ وَ اجعَلنَا بِبَالِكَ

اے رسول خدا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمیں بھی یاد رکھئے اور ہمیں بھی خاطر میں رکھئے۔

رسول خدا نے علی علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ تنہا مجھے غسل دیں۔ ابن عباس کا کام فقط پانی لانا ہے۔ غسل دینا فقط آپ کا کام ہے۔

امیر المومنین علیہ السلام کے غسل کے موقع پر بھی فقط امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام غسل دینے والے تھے جب کہ حضرت عباس علیہ السلام کا کام پانی لانا تھا - چونکہ امام معصوم کے بدن کو ایک معصومؑ ہی غسل دے سکتا ہے (22) اسی طرح جب امام حسن علیہ السلام کو غسل دیا جانے لگا تو امام حسین علیہ السلام نے یہ کام انجام دیا اور حضرت عباسؑ پانی لا کر دیتے تھے لیکن۔

لَا يَومَ لَيَومِكَ يَا اَبَا عَبدِاللهِ (23)

اے ابا عبد اللہ آپ کی مصیبت کے دن کی طرح کوئی اور دن نہیں ہے۔

چونکہ جب امام حسین علیہ السلام کے غسل کا موقع آیا تو امام سجاد علیہ السلام نے بنی اسد سے فرمایا تمام شہداء کو امام حسین علیہ السلام کی قبر مبارک کے پائنتی کی طرف دفن کیا جائے امام سجاد علیہ السلام نے تمام شہداء کے دفن میں بنی اسد کی مدد کی لیکن جب امام حسین علیہ السلام کو دفن کیا جانے لگا تو امام سجاد علیہ السلام نے تنہا آپ کے بدن مبارک کو قبر میں اتارا اگر اس وقت آپؑ سے پوچھا جاتا کہ تنہا کیسے بدن مطہر کو دفن کر پائیں گے تو ضرور یہ جواب فرماتے۔

اِنَّ مَعِی مَن یُعِینُنِی (24)

میری مدد کرنے والے میرے ہمراہ موجود ہیں

قبر کے آداب میں سے ایک ادب یہ ہے کہ جب میت کو قبر میں اتار دیا جاتا ہے تو اس وقت اس کے چہرے سے کفن ہٹا کر رخسار کو خاک پر رکھا جاتا ہے اور یہ پڑھا جاتا ہے:

اَللّٰهُمَّ عَفوَكَ عَفوَكَ (25)

یہ دفن کے آداب میں سے ہے لیکن امام سجاد علیہ السلام نے اس پر کیسے عمل کیا ہوگا؟ کہ اس بدن مطہر کے ساتھ تو سر ہی نہیں تھا اور کفن بھی نہیں تھا۔

جب حضرت سجادؑ دفن سے فارغ ہوئے تو اپنی انگشت شہادت سے اپنے بابا کی قبر پر یوں لکھا۔

هَذَا قَبرُ حَسَین بنُ عَلیِ بنِ اَبیطَالِب اَلذِی قَتَلُوہُ عَطشَاناً(26)

علیؑ کے بیٹے حسینؑ کی قبر ہے جسے پیاسا شہید کر دیا گیا۔

السلام علی الحسین و علی ابن الحسین و علی اولاد الحسین و علی اصحاب الحسین۔
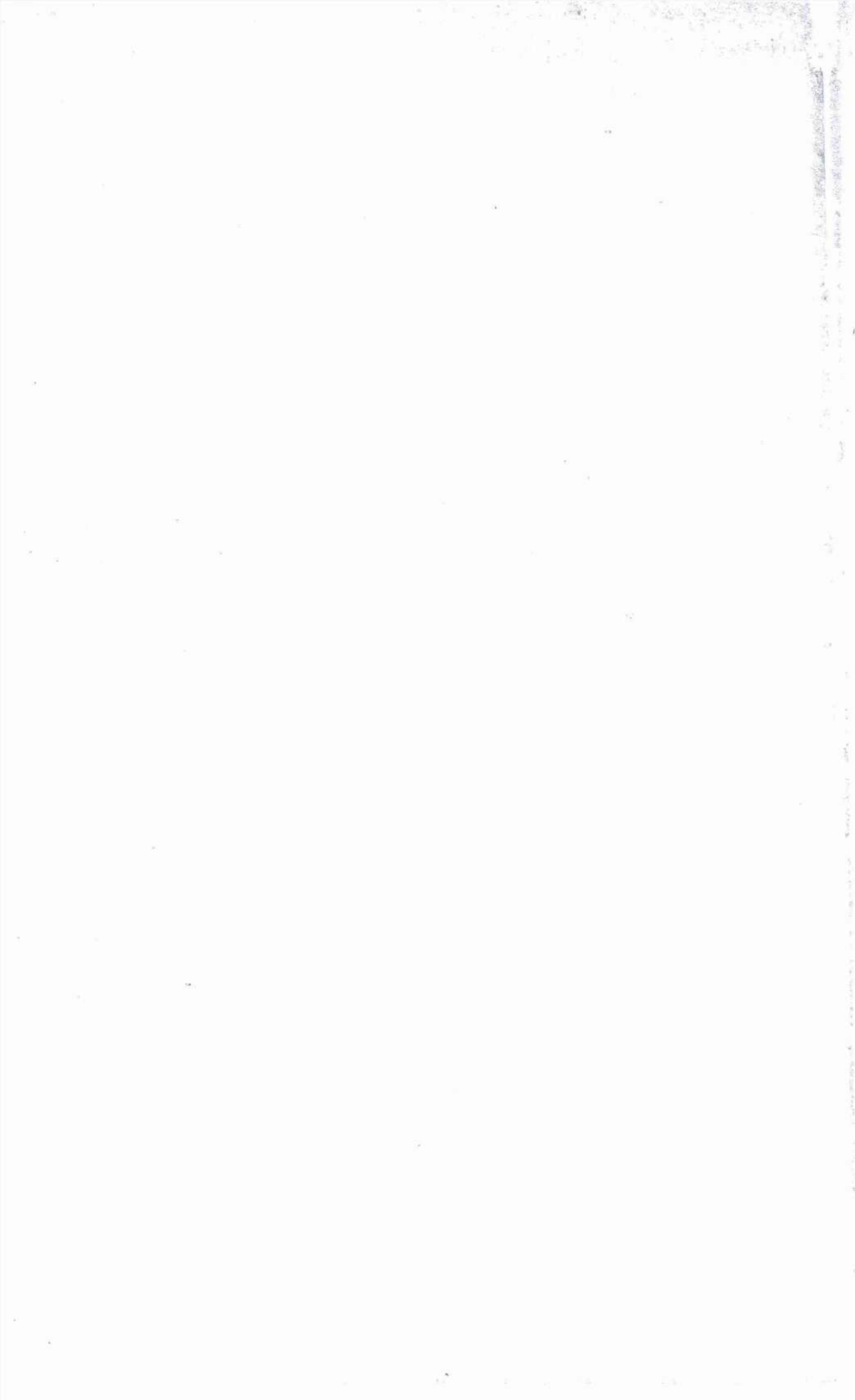
﴾ ملنے کا پتہ ﴿

حسن علی بک ڈپو

بالمقابل بڑا امام باڑہ۔ کھارادر۔ کراچی فون ۲۴۳۳۰۵۵